پنجاب کی لوک کہانیاں

پروفیسر غلام مُرتضیٰ

پنجاب کی
لوک کہانیاں

پروفیسر غلام مرتضےٰ

مقبول اکیڈمی
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنتساب

میری **ماں** کے نام
جن کی گود میں اِس کتاب کی بُنیاد رکھی گئی
جب مَیں نے اُن سے اپنی زِندگی کی پہلی کہانی سُنی
اور دُنیا کی تمام **ماؤں** کے نام
جن کی گودیاں اَن گنت اِمکانات کا مرکز ہیں
جو اپنے بچّوں کو اُن کی زِندگی کی پہلی کہانیاں سُناتی ہیں

سلام مرتضیٰ
اتوار ۱۵/اپریل ۲۰۱۲ء

پھلاہی کا پُل

جب کبھی میں مُڑ کے اپنے ماضی میں جھانکتا ہوں تو ''اسکول'' کے بعد جو چیز میرے ذہن پہ سب سے زیادہ چھا جاتی ہے، وہ گاؤں ''رُڑکا'' کے سفر ہیں۔ یہ میرا ننھیالی گاؤں ہے۔ پورا نام ''100 چک رُڑکا'' ہے۔ یہ جڑانوالہ سے کھرڑیانوالہ جانے والی سڑک سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔

میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ تین بھائیوں اور تین بہنوں میں سب سے چھوٹا، اخیر کا بچہ، جسے پنجابی میں ''پیٹ کروڑی دا'' (اُردو میں پیٹ پونچھن یا پیٹ کھرچن) کہتے ہیں۔ اجنبی اور مہمان عورتیں ہمیشہ میرے تعارف پر ہنستی ہوئی، میری طرف اشارہ کر کے میری ماں سے یہ الفاظ کہتیں۔ چھٹی ساتویں کلاس تک بھی، جبکہ بچہ کافی بڑا ہو جاتا ہے، مجھے اکیلے سونے کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے کہ میری جگہ لینے والا کوئی نہیں آیا تھا۔ میں ہمیشہ اپنی امی کے ساتھ سوتا تھا، مجھے امی کے بغیر نیند ہی نہیں آتی تھی۔ چنانچہ امی جب بھی بھائیوں سے ملنے رُڑکا جاتیں، میں بھی ساتھ ہی جاتا۔ یہ سفر ''رُڑکا'' کے علاوہ بعض شہروں جیسے لائل پور (فیصل آباد)، شاہ کوٹ، سانگلا ہل، حافظ آباد کی طرف بھی ہوتے تھے۔ رشتے داروں کے ہاں شادی، مرگ کے سلسلے میں امی کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اپنے بچپن میں تواتر کے ساتھ جتنے سفر کیے، اتنے آئندہ پوری زندگی میں بھی کبھی نہ کر سکا۔

میں اور میری امی جان ہمیشہ بس میں بیٹھ کر ''رُڑکا'' جاتے۔ پہلے جڑانوالہ پہنچتے۔ وہاں سے ایک دوسری لاری کے ذریعے پھلاہی کے پُل پر جا کر اُترتے۔ پھلاہ یا پھلاہی کیکر کی قسم کا ایک درخت ہے۔ قد کیکر سے چھوٹا اور پھیر (پتوں اور شاخوں کا گھیرا یا حلقہ) کیکر سے بڑا۔ پھلاہی کے پتے بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اسی لیے پُرانے وقتوں میں بڑی بوڑھیاں مذاق کے طور پر بچوں سے کہا کرتی تھیں: ''میرا یہ کام کر دو، میں تمھیں پھلاہی کے پتے پر گھی رکھ کے دوں گی۔'' یہ درخت مشرقی پنجاب میں کثرت سے پایا جاتا تھا۔ خیر کسی زمانے میں اس پُل کے آس پاس پھلاہی کے درخت اُگے ہوں گے، جن کی وجہ سے اس کا یہ نام پڑا۔ صرف پُل ہی نہیں، ''پھلاہی'' نام کا ایک گاؤں بھی نزدیک ہی واقع تھا۔ ان درختوں کو تو کٹے مدتیں بیت چکی تھیں لیکن پُل اور گاؤں ابھی تک اُن کے نام سے مشہور تھے۔ اب پُل کے ساتھ پیپل کا ایک بہت پُرانا اور بہت بڑا درخت کھڑا تھا۔ جونہی ہماری بس یہاں آ کر رکتی، کنڈکٹر پکارتا: ''پھلائی دے پُل آلے'' اور پھلاہی کے پُل والے

وہاں اُتر جاتے۔ بس آگے روانہ ہو جاتی۔ جیٹھ ہاڑ کی دوپہریں، پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں، چھاؤں میں گاؤں کا ایک ادھیڑ عمر شخص "ولیا" بوری بچھا کے بیٹھا سُرخ سُرخ پکوڑے اور نیلی پیلی گولیاں، ٹافیاں بیچا کرتا تھا۔ میری امّی بس سے اتر کے سب سے پہلے اُسے سلام کیا کرتی تھیں۔ ولیا بوری سے اُٹھتا، میری امّی کے سر پہ ہاتھ رکھ کے پیار دیتا۔ یہاں کئی خالی تانگے کھڑے ہوتے تھے۔ ہم ان میں سے ایک تانگے میں بیٹھ جاتے۔ تانگا نہر کے ساتھ ساتھ کچے راستے پر بھاگتا، دُور دُور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں سے گزرتا، آدھ گھنٹے میں گاؤں پہنچ جاتا۔ ہمارا گاؤں، اُس وقت وہ ہمارا ہی تھا۔

گاؤں میں داخل ہوتے تو سب سے پہلے نظر بوہڑ (بڑ) کے درختوں پر پڑتی۔ سات آٹھ بوہڑ کے بڑے بڑے، پرانے درخت، چوڑے چوڑے تنے، موٹے موٹے ڈال، لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے، جٹا دھاری بوہڑ، ان کی ایک اپنی مکمل شخصیت تھی۔ یہ پاکستان بننے سے بہت پہلے کے پیڑ تھے، سکھوں کے لگائے ہوئے۔ یہ بوہڑ گاؤں کی پہچان تھے۔ گاؤں کے لوگ شکر (سخت) دوپہروں میں ان بوہڑوں کی ٹھنڈی، گھنی چھاؤں میں چارپائیاں بچھائے لیٹے ہوتے۔، ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے آرہے ہیں؛ کوے، شیرک، توتے، ہریل، تلیر، پتوں میں بول رہے ہیں؛ گلہریاں شاخوں پر بھاگ رہی ہیں۔

رُڑکا میں میرے تین ماموں رہتے تھے۔ سب سے بڑے ماما رحمت، اس وقت بقیدِ حیات تھے۔ اللہ بخشے مامی رحمی بھی زندہ تھیں۔ اُن کا بیٹا عبدالعزیز (جنھیں ہم "بھاجی" کہا کرتے تھے) اپنے بیوی بچّوں کے ساتھ گاؤں میں مقیم تھا۔ ماما خوشی محمد عرف خوشیا وفات پا چکے تھے۔ اُن کی بیوہ مامی میداں (جن کا اصل نام "حمیداں بی بی" تھا) اپنے بچّوں کے ہمراہ گاؤں میں رہتی تھیں۔ ماما پیر دین مُجرّد تھے۔

گاؤں رُڑکا کے قیام کے دوران میں میرے ساتھ پیش آنے والا ایک واقعہ میں ساری زندگی بھلا نہ سکوں گا۔ ایک روز مامی رحمی میری امّی کو بتا رہی تھیں کہ ہمسائے کا ایک مرد کیکر کے کانٹوں بھرے درخت پر چڑھا ہوا، چولھے میں جلانے کے لیے کلھاڑی سے شاخیں کاٹ رہا تھا کہ دفعتہً اُس کا پاؤں پھسلا اور دھڑام سے نیچے بکھرے ہوئے کانٹوں اور کانٹوں بھری شاخوں پر آن گرا۔ اُس کے سارے جسم میں کانٹے چبھ گئے ہیں۔ جس وقت یہ بات ہو رہی تھی، میں بھی پاس ہی چارپائی پہ بیٹھا سُن رہا تھا۔ گھر میں میرا ہم عمر ایک اور لڑکا بھی تھا، وہ مجھ سے کہنے لگا: "میں سیڑھی پر چڑھ کر اُس شخص کو دیکھوں گا۔" میں تو پہلے ہی تجسّس سے بھرا ہوا تھا، فوراً بولا: "میں بھی دیکھوں گا۔

اسی اثنا میں امّی اور مامی باتیں کرتے کرتے گھر کے واحد کچے ٹھنڈے کمرے میں چلی گئیں۔ ہم اُن کی آنکھ بچا کر دیوار سے لگی لکڑی کی سیڑھی کی طرف لپکے۔ دیوار کے ساتھ دیوار جڑی تھی۔ سب سے پہلے وہ لڑکا سیڑھی پہ چڑھ کے ہمسائے میں جھانکنے لگا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات نے میرے تجسس کی آگ کو اور بھی بھڑکا دیا۔ میں نے بڑا اصرار کر کے اسے نیچے اُتارا۔ پھر فٹا فٹ خود سیڑھی پر چڑھ گیا۔ لیکن شوقِ مشاہدہ اور ذوقِ نظارہ کچھ اس قدر بڑھا ہُوا تھا کہ میں محض سیڑھی کے ڈنڈے پر پاؤں رکھ کے دیوار کے دوسری جانب جھانکنے پر قانع نہ ہوا۔ دیوار کے ساتھ ہی کچھ اُوپر کر کے کمرے کی چھت جُڑی ہوئی تھی۔ میں نے سیڑھی پھلانگ کے دیوار پہ پاؤں رکھا اور پھر وہاں سے چھت پر چڑھ گیا، تا کہ بہتر طور سے سارا منظر دیکھ سکوں۔ اب جو جھانکا تو سامنے عجب نظارہ تھا۔ ایک مرد چار پائی پہ بیٹھا ہائے ہائے کر رہا تھا۔ اُس کا جسم ننگا تھا۔ صرف دھوتی باندھ رکھی تھی۔ اُتری ہوئی قمیص سرہانے پڑی تھی۔ گھر کی تین چار عورتیں، ایک دو مرد اُس کے گرد کھڑے تھے۔ عورتوں کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں پانی سے بھرا گلاس تھا۔ کوئی گھر کے کچے صحن میں یونہی دوڑی دوڑی پھر رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اُس زمانے کے دیہاتوں میں گھروں کی دیواریں اتنی بلند نہیں ہوتی تھیں؛ نہ ہی کمرے بہت اونچے بنائے جاتے تھے۔ یہ سارا ڈراما بالکل میرے سامنے، چند قدموں کے فاصلے پر ہو رہا تھا۔ میں بڑے اطمینان کے ساتھ چھت پر کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا کہ اچانک صحن میں کھڑے ایک مرد کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ ہاتھ بڑھا بڑھا کر مجھے مارنے کے اشارے کرنے لگا۔ گھونسا دِکھانے لگا۔ ساتھ ہی مُنہ سے عجیب عجیب آوازیں نکال کے ڈرانے لگا۔ میں عجب مصیبت میں پھنس گیا۔ اب میری خواہش تو یہ تھی کہ کہ جلدی سے دیوار کے ساتھ لگی لکڑی کی سیڑھی تک پہنچوں اور نیچے اُتر جاؤں؛ اس مشکل سے چھٹکارا حاصل کروں۔ لیکن جونہی مَیں سیڑھی تک پہنچنے کے لیے قدم آگے بڑھاتا، وہ شخص سمجھتا کہ شاید میں دوبارہ "تماشا" دیکھنے کے لیے آگے بڑھ رہا ہوں۔ وہ اپنا بڑا سا بھاری بھرکم ہاتھ اُوپر کر کے مجھے مارنے کی کوشش یا ایکٹنگ کرتا۔ میں خوف زدہ ہو کر پھر پیچھے ہٹ جاتا۔ اس Misunderstanding کے نتیجے میں کئی بار یہ ڈراما ہوا۔ مشکل یہ تھی کہ نیچے اُترنے کا اور کوئی رستہ نہیں تھا۔ بس وہی ایک سیڑھی تھی، جو بد قسمتی سے اُس دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی، جو اُس آدمی اور ہمارے ماموں کی مشترکہ دیوار تھی۔ کتنی ہی دیر میں چھت پہ کھڑا سوچتا رہا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ آخر میں نے جی کڑا کیا۔ ہمت کر کے پھر آگے بڑھا۔ اُس آدمی نے پھر بازو اُٹھا کے

مارنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے آنکھ اُٹھا کے اس کی طرف دیکھا تک نہ۔ بس جلدی جلدی دیوار پر قدم رکھا اور پھر ہاتھ بڑھا کے اُس کے ساتھ لگی لکڑی کی سیڑھی پکڑ لی۔ افراتفری میں نیچے اترتے ہوئے پاؤں لکڑی کے ڈنڈے پر نہ پڑا، بلکہ خلا میں رکھا گیا۔ ہاتھ سیڑھی سے چھوٹ گیا اور میں دھڑام سے نیچے آ گرا؛ دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے تازہ تازہ، سبز سبز چارے کے ڈھیر پر؛ جو ماموں بکریوں کے لیے کاٹ کے لائے تھے۔ جسے اللہ رکھے، اُسے کون چکھے۔ یُوں میری بچت ہوگئی۔ سر دیوار سے اور جسم سیڑھیوں سے ضرور بھڑا، ہلکی پھلکی خراشیں آئیں مگر کسی خطرناک چوٹ سے محفوظ رہا۔

یہ واقعہ اتنا شرمندہ کرنے والا تھا کہ میں نے شرم کے مارے کسی سے ذکر نہ کیا۔ نہ اپنی امّی کو بتایا، نہ ہی مامی کو۔ آج کم و بیش پچیس تیس سال بعد پہلی دفعہ صرف آپ کو بتا رہا ہوں۔

میں اور میری امّی جان سب سے پہلے بھانجے کے گھر جاتے، کھانا وغیرہ کھاتے۔ ان کے لڑکے بُورا، ننھا اور پپو میرے ہم جولی تھے۔ خصوصاً پپو تو میرا سب سے گہرا دوست تھا۔ دن ان کے ساتھ کھیلتے ہوئے گزر جاتا؛ جونہی شام پڑتی، میں مامی میداں کے گھر جانے کی ضد شروع کر دیتا۔ اس کی وجہ تھی مامی میداں کی کہانیاں۔ انھیں بہت سی، مزے دار لوک کہانیاں زبانی یاد تھیں اور کہانی میری سب سے بڑی کمزوری تھی۔ ہم ہمیشہ رات مامی میداں کے ہاں گزارتے۔ بھانجے کی گھر والی آپا مختاراں (مرحومہ) کو ہمیشہ اس بات کا گلہ ہی رہا۔

ہمارے ماموں اور مامی میداں کے شوہر خوشی محمد عرف خوشیا قیامِ پاکستان کے وقت انڈین آرمی میں تھے۔ بہت بہادر اور شینہ (شیر) جوان انسان تھے۔ ۱۹۴۷ء کی ہجرت کے موقع پر ہزاروں، لاکھوں مہاجروں کے ساتھ ساتھ اپنے خاندان اور دیگر رشتہ داروں کو باحفاظت مشرقی پنجاب سے نکالنا اور پاکستان لانا انہی کا کام تھا۔ بعدازاں پاکستان آرمی میں رہے۔ انھیں ٹی بی ہو گئی تھی۔ دس برس وہ اس بیماری سے لڑتے رہے، آخر جان ہار گئے۔ یہ میرے ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے کا واقعہ ہے۔ مامی میداں بھری جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔ تین بچے تھے: دو لڑکیاں، ایک لڑکا۔ اس وفادار عورت نے دوسری شادی نہ کی۔ ساری زندگی اپنے بچوں کی پرورش میں تیاگ دی۔

مامی میداں کے چہرے اور جسم پر بَرَص کے سفید دھبے تھے۔ لیکن ان کی رُوح بے داغ تھی، پاکیزہ۔ گھر کے ساتھ ایک بیٹھک میں انھوں نے دکان بنائی ہوئی تھی۔ گاؤں کے بچے اُن سے گولیاں، ٹافیاں خریدنے آتے تھے۔ یہی اُن کے رزق کا وسیلہ تھا۔ بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ چھوٹی بیٹی کا نام ''کاٹو'' تھا۔ کاٹو پنجابی میں ''گلہری'' کو کہتے ہیں۔ وہ سولہ سترہ سال کی تھی

اور سچ مچ کچے آنگن میں گلہری کی طرح پھدکتی پھرتی تھی۔ مجھے دکان میں لے جاتی۔ مفت میں خُوب گولیاں، ٹافیاں کھلاتی۔ مجھے ٹافیاں کھانے سے زیادہ اُن سے نکلنے والے طرح طرح کے اسٹکر جمع کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ جب میں رڑکے سے واپس آتا، میری جیبیں رنگ برنگی تصویروں سے بھری ہوتیں۔

دو تین دن کے بعد ہم واپسی کی راہ لیتے۔ وہی پھلاہی کا پُل ہوتا، پیپل کا درخت، ولیے کی بوری اور بوری پہ سجے لال لال پکوڑے اور نیلی پیلی گولیاں، ٹافیاں۔ لاری آتی؛ ولیا بوری سے اٹھتا؛ میری امّی کے سر پہ ہاتھ رکھ کر پیار دیتا اور دُعا دے کر رخصت کرتا۔

بس کی کھلی کھڑکی سے میں مسلسل ولیے کی طرف دیکھتا رہتا، یہاں تک کہ کنڈکٹر بس کے دروازے کو زور سے کھڑکا کر کہتا: "چلو" یعنی چلیے۔ سارے رستے یہی سوچتا کہ کاش میں بھی ولیا بن جاؤں؛ سکول کی قید سے آزاد ہو جاؤں؛ ولیے کی طرح پھلاہی کے پُل پر، پیپل کے نیچے پکوڑے اور گولیاں، ٹافیاں بیچوں، پیپل کے ٹھنڈے گھنے سائے میں، جہاں ماسٹر اور اُس کا ڈنڈا نہ پہنچ سکیں۔

سوموار کا دن تھا؛ اپریل کی ۲۸ تاریخ اور سن ۲۰۰۸ء؛ میں اپنی امّی کے ساتھ کوئی اٹھارہ سال بعد اپنے گاؤں جا رہا تھا، تمام رستے دماغ میں فلم چلتی رہی، میرے بچپن کی فلم۔ میں اور میری ماں کس قدر بدل چکے تھے۔ بچہ چھتیس سال کا ہو چکا تھا اور ماں چھہتر برس کی؛ لیکن ہم سے کہیں زیادہ، ہمارا گاؤں تبدیل ہو چکا تھا۔ نہ وہ گلیاں تھیں، نہ وہ گھر۔ گاؤں کی پہچان: پرانے جٹا دھاری بوہڑ، کُچھ سوکھ گئے تھے، کُچھ کٹ چکے تھے۔ میرے بچپن کے دوست، اب تو فقط تین چار کٹے پھٹے بوہڑ ہی باقی تھے۔ گلیاں تنگ اور ٹیڑھی ہو گئی تھیں۔ لوگوں نے گھر آگے کو بڑھا لیے تھے۔ شاید ہی کوئی کچا گھر ہو گا۔ سب پختہ مکان تھے۔ بعضے شاندار، خُوب صورت بنگلے۔ ماما بیر دین سے ملاقات ہوئی۔ بھانجے تو کب کے مکان بیچ کے اپنے بال بچوں کے ساتھ لائل پور جا کر آباد ہو چکے تھے۔ وہ گھر، جہاں کبھی میں بے تکلّف گھوما کرتا تھا، اب کسی غیر کے قبضے میں تھا۔ اس گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے دل دھک سے رہ گیا۔

ہم مامی میداں سے ملنے ان کے گھر گئے۔ مامی ایک کمرے میں بیٹھی حقہ پی رہی تھیں۔ خاصی بوڑھی ہو چکی تھیں۔ مکین کے ساتھ ساتھ مکان کا نقشہ بھی بدل گیا تھا؛ وہ کمرے اب گر چکے تھے جہاں بچپن میں، میں اپنی امّی کے ساتھ چارپائی پہ سویا کرتا تھا۔ جہاں سرسوں کے تیل سے بھرے مٹی کے مہکتے دیئے کی روشنی میں مامی میداں سے پیاری پیاری باتاں (کہانیاں) سُنا کرتا تھا۔ وہاں اینٹوں کے ٹوٹے پھوٹے فرش پر کھڑے ہو کے میرے دل کی کیا کیفیت ہوئی،

صاحب! بیان کے لیے کہاں سے الفاظ لاؤں۔ میں پھر ماسی میداں کے پاس چارپائی کی پائنتی پہ آ بیٹھا۔ اُن سے دوبارہ وہی کہانیاں سننے کی فرمائش کرنے لگا، جو میں اپنے بچپن میں سُنا کرتا تھا۔ ماسی میداں ہنسنے لگیں۔ آخر میرے بے حد اصرار پر انھوں نے دو لوک کہانیاں: ''میں جیوندا، میں جاگ دا'' اور ''میں لال موجے پاناں آں'' سُنا ڈالیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ساتھ ساتھ ماسی میداں کا پورا گھر کہانیاں سُن رہا ہے؛ جیسے ابھی کسی کونے کھدرے سے میرا بچپن اچانک نکل کر میرے سامنے آ کھڑا ہوگا۔

ہم واپسی کے لیے اُٹھے۔ گلی میں ایک پکی بیٹھک نظر آئی۔ دیواروں پہ سیمنٹ کا پستر تھا۔ بجلی کا پنکھا چل رہا تھا۔ نوے برس کا ایک سفید رنگ کا بوڑھا میز پہ گولیاں، ٹافیاں رکھے بیچ رہا تھا۔ یہ ولیا تھا۔ میری امی نے اسے سلام کیا مگر وہ پہچان نہ سکا۔ پھلاہی کے پُل کو، پیپل کی چھاؤں کو چھوڑ کر؛ کالا کلوٹا ولیا، پکی بیٹھک میں بجلی کے پنکھے کے نیچے آ کے کیسا نکھر کر گورا چٹا ہو گیا تھا۔

میں پھلاہی کے پُل کو ڈھونڈتا رہ گیا۔ لمبی چوڑی، ٹھنڈی میٹھی نہر سیمنٹ سے پختہ ہو کر ایک چھوٹے سے گدلے نالے کی صورت میں بہہ رہی تھی۔ پھلاہی کے درخت تو جانے کب کے کٹ چکے تھے۔ اب تو وہ پیپل بھی باقی نہیں رہا تھا، جس کی گھنیری چھاؤں میں ولیا بیٹھا کرتا تھا۔ دُور کیا جائیں، خود ولیا بھی ولیا نہیں رہا تھا۔

پھلاہی کا پُل کا ایک ایسا پُل تھا جو میری زمین کو چندا کی نگری سے جوڑ دیتا تھا۔ اس پُل کو عبور کر کے میں ماسی میداں کی دنیا میں داخل ہوتا تھا۔ لوک کہانیوں کی دنیا، جہاں ماسی میداں رہتی تھی، جہاں ماسی میداں رات دِن اپنے چرخے پر لوک کہانیاں کاتتی تھی۔

پھلاہی کا پُل ایک ایسا پُل تھا، جو میری آنسوؤں سے بھیگی، خوف سے کانپتی ہوئی دنیا کو، قہقہوں سے جھومتی ہوئی پُر مسرت، مطمئن دنیا سے جوڑ دیتا تھا۔ اس پُل کو عبور کر کے میں لوک کہانیوں کی دُنیا میں داخل ہوتا تھا، جہاں کوئی اسکول نہیں تھا۔ جہاں ہر روز صُبح نو سے سہ پہر تین بجے تک مجھے اسکول کی قید سُنانے والی کوئی عدالت موجود نہیں تھی؛ جہاں ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے، مونچھوں کو تاؤ دیتا، تھانیدار کی طرح چلتا ہوا کوئی سرکاری ماسٹر نہیں تھا۔

پھلاہی کا پُل ایک ایسا پُل تھا جو بے کیف حقیقت کو دل نشیں خواب سے جوڑ دیتا تھا۔ اس پُل کو عبور کر کے میں لوک کہانیوں کے پرستان میں داخل ہوتا تھا۔ اڑن کھٹولے پہ بیٹھا ہوا، اڑتا جا رہا ہوں؛ اڑتا جا رہا ہوں۔ گھر، کھیت، ندیاں، پہاڑ میرے نیچے سے پھسلتے جا رہے ہیں؛

پھسلتے جارہے ہیں۔

پھلا ہی کے پُل کے اِس طرف موت ہی موت تھی۔ پھلا ہی کے پُل کے اُس طرف موت کا کوئی وجود نہیں تھا۔

پھلا ہی کے پُل کے ایک طرف شہری تہذیب تھی، دوسری طرف دیہاتی تہذیب اور پھلا ہی کا پُل دونوں تہذیبوں کا نقطۂ اِتّصال تھا۔

پھلا ہی کا پُل حال کو ماضی سے جوڑتا تھا۔

برسوں پہلے میرا بچپن پھلا ہی کے پُل پر رہ گیا تھا۔ آج میں نے پھلا ہی کا پُل کیا کھویا تھا، میں نے تو اپنا سب کُچھ ہی کھو دیا تھا۔

اس دفعہ اس مقام سے رخصت ہوتے ہوئے ولیا بن کر، بوری بچھا کے، سُرخ سُرخ پکوڑے اور نیلی پیلی ٹافیاں بیچنے کی میں چاہنے کے باوجود تمنا نہ کر سکا۔

واپسی کے سفر میں، میں نے سوچا: کیا ہوا جو پھلا ہی کا پُل ٹوٹ گیا۔ میرے ذہن میں تو وہ آج بھی ویسے کا ویسا ہی ہے۔ میں پھلا ہی کا پُل دوبارہ تعمیر کروں گا۔ بالکل اسی طرح کا جیسا میں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔

صاحبو! اس کتاب کی صورت میں، میں نے، اپنی موت سے پہلے، پھلا ہی کا پل دوبارہ تعمیر کیا ہے۔ اب اسے کوئی گرا نہ سکے گا۔

غلام مرتضےٰ

غلام مرتضےٰ

(اُستاد شُعبہ اُردو)

گورنمنٹ گُرونانک ڈگری کالج، ننکانہ صاحب

جمعرات ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۸ء

اظہارِ تشکّر

☆ اس کتاب کی پہلی لوک کہانی ''بیری اور چَغّن'' والدہ محترمہ جنت بی بی کی روایت کردا ہے۔ یہ کہانی ان ابتدائی دو تین کہانیوں میں سے ایک ہے، جو میں نے اس دنیا میں آکے، ہوش سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے سُنیں۔ اس لحاظ سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے ادبی ذوق کی تعمیر میں اس کہانی کی حیثیت پہلی اینٹ کی ہے۔ غرض میری زندگی کی کتاب ہو یا میری لوک کہانیوں کی کتاب، دونوں کا آغاز اسی کہانی سے ہوتا ہے۔

☆ اس کتاب کی دوسری اور تیسری کہانی بالترتیب ''میں جیوندا، میں جاگ دا'' اور ''میں لال موجے پاناں آں'' کی راوی مامی میداں ہیں۔ ان کہانیوں میں میرے بچپن کے حسین شب و روز سُوئے ہوئے ہیں۔

☆ 3 رجولائی ۲۰۰۹ء بروز جمعہ والدِ محترم صُوفی رحمت اللہ کا وصال ہوا۔ وہ ایک درویش انسان تھے۔ ساری زندگی حضرت سید پیر مہر علی شاہؒ (گولڑا شریف) اور اُن کے فرزند حضرت سید پیر غلام محی الدین المعروف بہ بابو جیؒ کی محبت میں گزار دی۔ حضرت حافظ محمد حمید الدینؒ (کوٹ نجیب اللہ) کی خلافت ملی۔ چار مسجدیں تعمیر کیں۔ اپنے پیر سے موسوم ''مدرسہ مہر مُنیر'' قائم کیا۔

والد صاحب کی وفات پر جو رشتہ دار خواتین آئیں، انہی میں ''آپا جیجاں'' بھی شامل تھیں۔ دبلی پتلی، دراز قامت، رنگ سیاہی مائل گندمی۔ آپا کا اصل نام ''عزیز فاطمہ'' ہے۔ آپا کے نانا ''محمدی'' اور ہمارے دادا ''فتح دین'' دونوں سگے بھائی تھے۔ آپا کی پیدائش ضلع ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) کے گاؤں ''ہالٹا باوَلا'' میں ہوئی۔ اس جگہ ایک بزرگ ''حضرت شاہ جمالؒ'' کا میلہ لگتا تھا۔

آپا جیجاں کے والد کا نام ''عبداللہ'' اور ماں کا نام ''فاطمہ'' تھا۔ جب پاکستان بنا، آپا کی عمر صرف ڈھائی سال تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بٹوارے کے بعد آپا اپنے خاندان کے ساتھ بہاول پور سے آئے ایک گاؤں ۱۳ چک تحصیل لیاقت پور ضلع رحیم یار خاں میں آباد ہوئیں۔ وہ ابھی نوعمر تھیں کہ والدہ داغِ مفارقت دے گئیں۔ آپا بتاتی ہیں کہ ماں کی جُدائی کے اُن دردناک دنوں میں میرے دو بھائیوں نے میرے زخموں پر پھاہا رکھا۔ محمد مشتاق اور نُور محمد اپنی چھوٹی بہن کا دل پر چانے کے لیے اُسے مزے مزے کی کہانیاں سناتے تھے۔

ابا جی کی وفات پر اللہ نے میرے دکھ کا مداوا یوں کیا کہ میری ملاقات آپا جیجاں سے کروادی۔ آپا نوواں کے ختم تک ہمارے پاس رہیں۔ اس دوران میں انھوں نے مجھے بہت سی، نہایت دلچسپ اور مزے دار کہانیاں سُنائیں۔ کیسی عجیب بات ہے، برسوں پہلے جن کہانیوں نے آپا جیجاں کی ماں کی موت پر ان کے زخموں پہ مرہم رکھا تھا، آج وہی کہانیاں میرے باپ کے مرنے پر میرے درد کا درماں بن گئی تھیں۔ موت ایک خوف ناک احساس کے ساتھ میری رُوح پر مسلّط ہوگئی تھی۔ آپا جیجاں کی یہ کہانیاں میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے دوبارہ زندگی کی طرف لے آئیں۔ اُن میں سے سات لوک کہانیاں میں نے اپنی کتاب کے لیے منتخب کی ہیں۔ اُن کے عنوان یہ ہیں:۔ چالاک بگھیاڑ، لومڑی کی چالاکی، میراثی اور مولوی، میراثی اور دیو، سپاہی کی بیوی، سوئے کرم جگانا (۲)، گئو ماتا۔

گویا اس کتاب کی دس کہانیاں مجھے اپنے خاندان کی خواتین سے دستیاب ہوئی ہیں۔ میں ایک معلّم ہوں۔ تدریس کے مقدس پیشے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں نے اپنے شاگردوں سے اپیل کی کہ وہ پنجاب کے اس عظیم ثقافتی ورثے کو بچانے، محفوظ کرنے اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے میں میری مدد کریں۔ اس درخواست پر میرے قابلِ فخر شاگردوں نے لبیک کہا اور مجھے مجموعی طور پر سترہ کہانیاں سنائیں، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

☆ اس کتاب میں شامل دو کہانیاں: ''آیا، لالیے! آیانی، سوئے کرم جگانا (۱)'' محترمہ مریم بی بی کی روایت کردا ہیں۔ وہ ایک گھریلو خاتون ہیں۔ ننکانہ صاحب میں رہتی ہیں۔ میں نے یہ کہانیاں اُن کی بیٹی شگفتہ عمر کی زبانی سنیں۔

☆ کہانی ''میں گنگارام'' کو مریم بی بی اور نصرت مجید نے روایت کیا ہے۔

☆ دو کہانیاں ''کھچڑی'' اور ''بابا گویڑو'' محترمہ نگہت طاہرہ نے روایت کی ہیں۔ وہ ایک سکول ٹیچر ہیں۔ ننکانہ صاحب میں رہائش پذیر ہیں۔ مجھے یہ دونوں کہانیاں اُن کی بیٹی میمونہ ایمن نے سُنائیں۔

☆ کہانی بعنوان ''بھابو سالو رنگیا'' کی زاوی ''امام بی بی'' ہیں۔ وہ ۱۹۴۷ء میں امرتسر (مشرقی پنجاب) سے ہجرت کر کے پاکستان آئیں۔ سابقہ ضلع شیخوپورہ (موجودہ ضلع ننکانہ صاحب) کے ایک گاؤں چار چک میں مقیم ہوئیں۔ امام بی بی نے ۱۹۷۶ء میں قریب قریب ساٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔ مجھے یہ کہانی اُن کی پوتی حنا یعقوب نے سنائی۔

☆ کہانی ''چیتڑ کی مہم'' ماریہ شاہ نے اپنے پھوپھا محمد عنایت شاہ سے روایت کی۔

☆ کہانی ''پہیلی'' رومانہ شہزادی نے اپنے نانا محمد یوسف (متوفی: ۶ر ستمبر ۲۰۰۴ء) سے روایت کی۔

☆ کہانی ''ٹیلو بادشاہ'' رائے مظہر عباس نے اپنے گاؤں کے ایک شخص رانا شفیق عرف بھولا سے روایت کی۔

☆ شہر چیچکی سے ایک کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں ''کوٹ بوڑا، چاہ بوڑا اور بوڑہ کھوہ'' کے تین ناموں سے جانا جاتا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل یہ سکھوں کا گاؤں تھا۔ یہیں ''پیر علی'' رہتا ہے۔ پیر علی مقامی ہے، مہاجر نہیں۔ بال بچے والا ہے۔ بچپن میں بھیڑیں چراتا تھا۔ جوانی میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔ اب عمر نوے برس سے زیادہ ہے۔ اس کتاب میں پیر علی کی روایت کردا چھ کہانیاں شامل ہیں، جو رائے مظہر عباس کے وسیلے سے میرے علم میں آئیں۔ ان کے عنوان یہ ہیں:۔

ٹنڈے کی کارستانیاں، لوہار کا لڑکا، ہر چو، قاضی کی بیوی، سمندر نا گتی، گائے اور گھوڑا، چم دا چموٹا۔

☆ پنجاب کے قصبے ''جسلانی'' کے قریب ایک گاؤں ''پیڑی والا'' واقع ہے۔ یہیں آج سے کچھ عرصہ قبل ایک بزرگ ''شیر محمد'' رہتے تھے۔ روزانہ گاؤں سے منڈی وار برٹن آتے۔ لوگوں کی چارپائیاں بنتے۔ اُن کا نواسا ''صندل اقبال'' بھی ساتھ ہوتا تھا، جو اپنے نانے کے کام میں اُن کا ہاتھ بٹاتا۔ بُنوائی لے کر شام کو وہ اپنے گاؤں لوٹ آتے۔ شیر محمد کا انتقال چند سال پہلے قریب قریب نوے برس کی عمر میں ہوا۔ اُن کے نواسے نے بچپن میں اپنے نانا سے چند لوک کہانیاں سُنی تھیں، جن میں سے دو: ''سونے کے بالوں والی عورت'' اور ''پہلی عمر کی آفت'' اس کتاب میں شامل ہیں۔

میں اُن تمام خواتین و حضرات کا، جنھوں نے یہ لوک کہانیاں روایت کیں یا جوان کی فراہمی میں مدد و معاون ثابت ہوئے، دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

فہرست

☆☆

بیری اور چنّن

یہ کہانی ان ابتدائی دو تین کہانیوں میں سے ایک ہے، جو میں نے اس دنیا میں آ کے سب سے پہلے سنی تھیں۔
اس پیاری سی کہانی میں میرا بچپن سانس لے رہا ہے۔ پوہ ماگھ کی لمبی راتوں میں، لال رضائی اوڑھے، اپنی امی کے ساتھ لیٹا، میں ایک یہی "بات" (کہانی) سنا کرتا تھا۔ کیوں کہ میری ماں کو بس یہی ایک کہانی اچھی طرح یاد تھی۔ میں نے اسے بار بار سنا۔ خود اپنے آپ کو بھی اس کا ایک کردار محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اگلے دن اسکول جانے کا خوف، ماسٹر کا ڈر اس دلچسپ کہانی میں گم ہو کر رہ جاتے تھے، میں سنتے سنتے سو جایا کرتا تھا۔
یہ ۱۹۳۰ء کی دہائی کے آخری سال تھے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو رہی تھی۔ میری والدہ جنت بی بی نے یہ کہانی اپنی تائی سے سنی۔ تائی کا نام "بھاگی" تھا۔ پنجابی زبان میں بھاگی "بھاگوان اور خوش بخت" کو کہتے ہیں۔
دنیا بھر کے لوک ادب میں سوتیلی ماں کا تذکرہ بہت تواتر سے ملتا ہے۔ یہ کردار اپنی تمام تر ظالمانہ خصوصیات کے ساتھ اس کہانی میں بھی جلوہ گر ہوا ہے۔
بہن بھائی کا پاکیزہ رشتہ، اپنے ہندوستانی انداز کے ساتھ، اس قدیم، کلاسیکی کہانی کا مرکزی خیال ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی راجا کے محل میں ایک چڑیا نے آہلنا (گھونسلا) بنا رکھا تھا۔ اُس کے دو چھوٹے چھوٹے، ننھے منے بوٹ[1] بھی تھے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا، چڑیا مر گئی۔ چڑے نے نیا بیاہ رچا لیا۔ سوتیلی ماں نے آتے ہی بچوں کو بھکھڑا[2] کھلا دیا۔ بچے مر گئے۔ نئی چڑیا نے انھیں اپنی چونچ سے پکڑ کر آہلنے سے نکالا اور زمین پر گرا دیا۔ رانی بارہ ابھرن سولہ سنگھار کیے جھروکے سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اُس کے دل پر چوٹ لگی۔ چھاتی پھٹ گئی۔ شام کو جب راجا راج پاٹ کے کاموں سے فارغ ہو کر محل سرا میں آیا، رانی نے ساری بپتا سنائی۔ پھر دکھی ہو کر بولی: "اگر میں مر گئی اور آپ نئی عورت بیاہ لائے تو میرے بچوں سے بھی سوتیلی ماں ایسا ہی سلوک کرے گی۔"
راجے نے رانی سے وعدہ کیا کہ وہ کبھی دوسری شادی نہیں کرے گا۔

چند دن ہی گزرے تھے، رانی واقعی مر گئی۔ راجے نے اپنا عہد بھلا دیا۔ شادی رچا لی۔ رانی کے دو بچے تھے: ایک لڑکا، ایک لڑکی۔ سوتیلی ماں نے آتے ہی بہن اور بھائی دونوں سے بُرا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ دن گزرتے گئے۔ سوتیلی ماں کی اپنی بھی اولاد پیدا ہوئی۔ وہ اپنے بچوں

---

[1] چڑیا یا کسی پرندے کا بے بال و پر بچہ
[2] بھکھڑا ایک بچھی (زمین پر بچھی ہوئی) بوٹی ہے، چھوٹے چھوٹے پتوں والی۔ اسے بھکھڑا لگتا ہے، جو چھوٹی چھوٹی کانٹے دار ڈوڈیاں سی ہوتی ہیں۔ شروع میں ہری اور پکنے کے بعد پیلی ہو جاتی ہیں۔ کمر درد میں بہت مفید ہے۔ دیہاتی بھکھڑے کو کوٹ اور چھان کے، دیسی گھی میں ملا کر پنجیری سی بنا کر کھاتے ہیں۔

کوتو دیسی گھی کے پراٹھے پکا کر دیتی مگران دونوں بہن بھائی کو بُور کی روٹی ملتی۔ ایک روز انھوں نے اپنی اپنی بُور کی روٹی لی چُپ چاپ محل سے نکلے، ماں کی قبر پہ آ کے رونے لگے۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ دفعتہً سر جو اُٹھایا تو کیا دیکھتے ہیں: انواع واقسام کے مزے دار کھانوں اور رنگ برنگے پھلوں سے بھرا تھال سامنے رکھا ہے۔ بہن بھائی نے بُور کی روٹی ایک طرف رکھی، خوش خوش پیٹ بھر کر کھانے کھائے، پھل کھائے اور واپس گھر لوٹ آئے۔ اب وہ ہر روز اسی طرح کرنے لگے۔ گھر سے بُور کی روٹی لے کر نکلتے اور ماں کی قبر پہ جا کے عرش سے اُترے ہوئے لذیذ کھانے کھاتے۔ کئی مہینے گزر گئے۔

سوتیلی ماں خرانٹ عورت تھی۔ سمجھ گئی دال میں کالا ہے۔ بھلا بُور کی روٹی کھانے والے اتنے صحت مند کیوں کر ہو گئے؟ اب کی بار جب بہن بھائی گھر سے نکلنے لگے، سوتیلی ماں نے سُن گن لینے کے لیے اپنی چھوٹی بیٹی کو پیچھے بھیج دیا۔ وہ ماں کی قبر پر پہنچے۔ مزے مزے کے کھانے، پھل حسبِ معمول منتظر تھے۔ انھوں نے بُور کی روٹی ایک طرف رکھی اور ہری گھاس کے مخملیں فرش پر بیٹھ کر آسانی کھانے کھانے لگے۔ سوتیلی بہن، جو وَن کے درختوں میں چھپی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، باہر نکل آئی۔ نیک دل بہن بھائی نے اسے بھی کھانے میں شریک کیا۔ اس نے کُچھ کھایا اور کُچھ چُھپا کے گھر لے آئی۔ اپنی ماں کو دکھایا اور ساری کہانی الف سے ی تک کہہ سنائی۔ سوتیلی ماں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ خُوب چراغ پا ہوئی۔ کھٹن پٹی [1] لے کر پڑ رہی۔ شام کو راجا راج پاٹ کے کاموں سے فارغ ہو کر گھر آیا۔ رانی کو رُوٹھ کر مُنھ لپیٹ کر پڑے پایا۔ ناراضگی کی وجہ پوچھی۔ رانی بولی: "پچھ نہ پُچھ" (پوچھ نہ پُوچھ) راجا بولا: "میں ناں پچھاں، پچھے کون؟ پاٹے نوں سیئے ناں، رُسے نوں منایئے ناں تے گل کیویں بنوں؟" (میں نہ پوچھوں، پوچھے کون؟ پھٹے کو سیئے نا، روٹھے کو منایئے نا تو بات کیسے بنے؟) رانی دل کی بات زباں پہ لے آئی۔ کہنے لگی: "پہلی رانی کے دونوں بچوں کو قتل کروا دو۔"

تریا ہٹ کے آگے راجا کی پیش نہ گئی۔ ناری سَواد نے پدرانہ شفقت کو زیر کر لیا۔ "ماں متری تے پیو قصائی [2]" راجے نے چند دن بعد دونوں بہن بھائی کو مروا دیا۔ اُن کی خُون آلود لاشوں کو پائیں باغ میں دفن کروا دیا۔ ظالم رانی کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ کُچھ روز گزرے

---

[1] سر کے گرد پٹی باندھ کے، منہ لپیٹ کر پڑا رہنا۔ اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑنا۔

[2] ماں سوتیلی اور باپ قصائی ...... یعنی جب ماں سوتیلی ہو تو باپ بھی اُس کے کہے میں آ کر سگی اولاد سے اچھا سلوک نہیں کرتا۔

)۔ دن گزرتے گئے۔ دونوں درخت بڑے ہو گئے۔ بیری بیروں سے لد گئی، چنن کی لکڑی مہکنے لگی۔

ایک دن سنگ دل رانی کی بیٹی راج کماری اپنی ساٹھ سہیلیوں کے ساتھ شاہی باغ کی سیر کو گئی۔ راج کماری اور اس کی سہیلیوں نے جب بیری پر سرخ سرخ کاٹھے[3] بیر لگے دیکھے تو انھیں توڑنے کے لیے ٹھیم (روڑا) ماری۔ دفعتہً چنن بول اُٹھا:

"سُن بی بی بیرئیے!" (سُن بی بی بیری!)

بیری نے جواب دیا: "ہاں ویرا چننا!" (ہاں، بھائی چندن!)

چنن بولا: "باپو راجے دی لڑکی تینوں توڑسے گی (باپو راجے کی لڑکی تجھے توڑ ڈالے گی)

بیری سے آواز آئی: نہ توڑ بھینا! (نہ توڑ، بہن!)

نہ چھیڑ، مترئیے! (نہ چھیڑ، سوتیلی!)

مترئی، آکھاں، تینوں مارسے گی (سوتیلی ماں، میں کہتی ہوں، تجھے مار ڈالے گی)

ان کے دوپٹے اور جوتیاں بھی وہیں رہ گئیں۔ راج کماری اور اُس کی سہیلیاں یہ آوازیں سُنتے ہی بھاگ کھڑی ہوئیں۔ راج کماری ہانپتی ہوئی، خوف سے کانپتی ہوئی گھر پہنچی۔ جب سانس بحال ہوا، ساری بپتا کہہ سُنائی۔ یہ بھی کہا: "باغ میں کوئی بھاری بلا رہتی ہے۔"

بھائی نے سنا تو اگلے روز اپنے دوستوں کو ساتھ لے کر تلواروں، نیزوں اور تیر کمان سے مسلح ہو کر پائیں باغ میں آیا۔ بیری پہ لال لال، کاٹھے بیر لگے دیکھے تو جی للچایا۔ جونہی ٹھیم (روڑا) ماری، چنن بول اُٹھا:

"سُن، بی بی بیرئیے!" (سُن، بی بی بیری!)

بیری نے جواب دیا: "ہاں، ویرا چننا!" (ہاں، بھائی چندن!)

چنن بولا: "باپو راجے دا لڑکا تینوں توڑسے گا"۔ (باپو راجے کا لڑکا تجھے توڑ ڈالے گا)

بیری سے آواز آئی: "نہ توڑ، بھراوا!" (نہ توڑ، بھائی!)

نہ چھیڑ، مترئیا! (نہ چھیڑ، سوتیلے!)

"مترئی، آکھاں، تینوں مارسے گئی" (سوتیلی ماں، میں کہتی ہوں، تجھے مار ڈالے گی)

اُن کی تلواریں، نیزے، تیر کمان اور جوتے باغ ہی میں رہ گئے۔ راج کمار اور اُس کے دوستوں

[3] کاٹھا: بیر کی ایک قسم --- کاٹھا بیر: دیسی بیری کا پھل

نے یہ آوازیں سُن کر ایسی دوڑ لگائی کہ دوبارہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ گھر پہنچے تو سانس چڑھا ہوا تھا۔ غرض انھوں نے بھی تصدیق کی کہ واقعی باغ میں کوئی بھاری بلا رہتی ہے۔

اگلے روز رانی خود، اپنی داسیوں کو ساتھ لے کر، سارے معاملے کی تحقیق کرنے کے لیے شاہی باغ میں گئی۔ جیسے ہی رانی نے لال سُرخ کا ٹھے بیر توڑنے کے لیے بیری کو ٹھیم (روڑا) ماری، چنّن بول اُٹھا:

"سُن، بی بی بیریئے!" (سُن، بی بی بیری!)

بیری نے جواب دیا: "ہاں، ویرا چننا!" (ہاں، بھائی چندن!)

چنّن بولا: "باپو راجے دی رانی تینوں توڑسٹے گی۔" (باپو راجے کی رانی تجھے توڑ ڈالے گی)

بیری سے آواز آئی: "نہ توڑ، مائیں! (نہ توڑ، ماں!)

نہ چھیڑ، متریئے! (نہ چھیڑ، سوتیلی!)

بائل، آکھاں، تینوں مار سٹے گا"[1] (بائل، میں کہتی ہوں، تجھے مار ڈالے گا)۔

رانی چاتر تھی۔ باراں پتناں دی تارو[2]۔ ڈر کے بھاگ تو پڑی لیکن بھاگتے بھاگتے یہ پتا ضرور لگا لیا کہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں؟ جلد ہی بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔

رانی محل واپس آئی۔ کھٹ پٹی[4] لے کر پڑ رہی۔ شام کو راجا راج پاٹ کے کاموں سے فارغ ہو کر گھر آیا۔ رانی کو رُوٹھ کر، مُنھ لپیٹ کر پڑے پایا۔ ناراضگی کی وجہ پوچھی۔ رانی بولی: "پچھ نہ پچھ" (پوچھ نہ پوچھ) راجا بولا: "میں ناں پچھاں، پچھے کون؟ پاٹے نوں سیئے ناں، رُسّے نوں منایئے ناں تے گل کیویں بنوں؟" (میں نہ پوچھوں، پوچھے کون؟ پھٹے کو سیئے نا، روٹھے کو منایئے نا، تو بات کیسے بنے؟) رانی دل کی بات زبان پہ لے آئی۔ کہنے لگی: "باغ میں اُگی بیری اور چنّن کٹوا دو۔"

اگلے ہی روز ترکھان (بڑھئی) راجے کے حکم سے شاہی فوج کے ساتھ پائیں باغ میں پہنچا۔ جب درخت کاٹنے لگا تو ان سے آواز آئی:

"اُتوں کٹیو، تھلّوں کٹیو (اوپر سے کاٹنا، نیچے سے کاٹنا)

گبھے موچھا[3] نہ پائیو" (مگر درخت کے تنے کو درمیان سے مت کاٹنا)

---

[1] ان اشعار کی ایک خاص، نہایت شیریں، مترنم لے ہے، جس میں میری والدہ محترمہ گنگنایا کرتی تھیں۔

[2] بارہ گھاٹ میں تیری ہوئی، جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہو، نہایت تجربہ کار

[3] موچھا: (مذکر) درخت کا کٹا ہوا تنا۔

راجے کی طرف سے سخت ہدایت تھی کہ چاہے کچھ بھی ہو، دونوں پیڑ ہر حال میں کٹنے چاہئیں۔ ترکھان گھبرایا تو بہت۔ ایک جانب راجا، دوسری جانب بلا۔ نہ نگلے بنتی ہے، نہ اُگلے۔ آگے جاتے گھٹنے ٹوٹیں، پیچھے دیکھتے آنکھیں پھوٹیں۔ آخر خُدا کو یاد کر کے، شاہی فوج کی موجودگی سے حوصلہ پا کر، آواز کی ہدایت کے مطابق درخت کاٹتا رہا۔ جب پیڑ کٹ کر گرے تو بیری کے تنے میں سے لڑکی اور چنن کے تنے میں سے لڑکا زندہ سلامت باہر نکل آئے۔

بہن اور بھائی دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما اور چل پڑے۔ چلتے چلتے راج دھانی سے باہر آ گئے۔ ایک ایسی ویران، سُنسان جگہ پہنچے جہاں کمھاروں نے کھوآنے[1] بنا رکھے تھے۔ شام کا جُھٹ پٹا رات کی تاریکی میں بدل رہا تھا۔ پرندے گھونسلوں میں واپس آ رہے تھے۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ دونوں بہن بھائی ایک کھوآنے میں اُترے۔ ٹھنڈی، یخ زمین پر اِک دوجے سے لگ کر، چُھپ کے بیٹھ گئے ابھی پو پھٹی نہیں تھی کہ مُنہ اندھیرے ایک کمھار گدھے پر چھٹ[2] رکھے، مٹی لینے آ پہنچا۔ کھوآنے میں کُچھ دیکھ کر ڈر گیا۔ ایک طرف بیٹھ کر صبح کا انتظار کرنے لگا۔ جب اجیالا پھیلا، دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھوآنے میں سے باہر نکل آئے۔ کمھار کو بچے بہت پیارے لگے۔ وہ انھیں اپنے گھر لے گیا۔ کمھار کا دوست ترکھان بے اولاد تھا۔ اس نے کمھار سے بچے لے لیے۔ ترکھان اور ترکھانی (بڑھئی کی بیوی) خوش خوش انھیں پالنے لگے۔ لڑکی گھر میں رہنے لگی۔ سینا پرونا، ہانڈی روٹی کرنا سیکھنے لگی۔ ترکھان نے لڑکے کو کھیلنے کے لیے ایک کاٹھ (لکڑی) کا گھوڑا بنا دیا۔ وہ ہر روز کاٹھ کے گھوڑے پر سوار ہوتا اور راسے شاہی باغ کے قریب واقع کنوئیں پر لے جاتا۔ وہاں لوگ سَن کی بنی لج (رسی) کی مدد سے کنوئیں میں ڈول لٹکا کے پانی نکال رہے ہوتے۔ لڑکا گھوڑے کا مُنہ پانی میں ڈال کے کہتا: ”کاٹھ کے گھوڑے! پانی پی لے، کاٹھ کے گھوڑے! پانی پی لے۔“

ایک دن راج کماری اپنی سہیلیوں کے ساتھ کنوئیں پہ پانی بھرنے آئی۔ لڑکا بھی اپنا کاٹھ کا گھوڑا لیے کنوئیں پر پہنچا۔ گھوڑے کا مُنہ پانی میں ڈال کے بولا: ”کاٹھ کے گھوڑے! پانی پی لے، کاٹھ کے گھوڑے! پانی پی لے۔“ راج کماری بولی: ”ترکھان کے لڑکے! کبھی کاٹھ کے گھوڑے بھی پانی پیتے ہیں؟“ لڑکا بولا: ”کبھی راجے کی بیٹیاں بھی کنوئیں پہ پانی بھرتی ہیں؟“

---

[1] کھوآنا: مٹی کھود کھود کر، زمین میں بنائے ہوئے گہرے گڑھے۔

[2] چھٹ: دوہری بوری جو کمھاروں نے گدھے پر دائیں بائیں لٹکائی ہوتی ہے۔

راج کماری غصے سے لال پیلا ہوگئی۔ اس نے لڑکے کا گھوڑا اٹھایا اور زور سے زمین پر مار کر توڑ ڈالا۔ لڑکے نے راج کماری کا گھڑا توڑ دیا۔ راج کماری نے روڑا اُٹھا کر لڑکے کی بائیں آنکھ پر دے مارا۔ ڈھیلے سے خون بہنے لگا۔ آنکھ کا دیا بجھ گیا۔ دکھائی دینا بند ہوگیا۔ لڑکے نے کپڑا آنکھ پر باندھا، کاٹھ کے ٹوٹے ہوئے گھوڑے کو اُٹھایا اور گھر آ گیا۔ ترکھان نے پوچھا تو کہہ دیا: آنکھ آئی ہوئی ہے۔ مگر بہن کو سچی بات بتا دی۔ بہن خوب روئی۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ لڑکا ہر وقت آنکھ پر پٹی باندھے رکھتا۔ مثل مشہور ہے: ''دھی دھریک تے پتر امب [1]'' بہن پہ جوانی یوں آئی جیسے بیاس میں سیلاب۔ جسم جیسے گوندنی کا درخت ہونٹ جیسے کریر [2] کے سرخ پھول۔ آنکھیں جیسے راوی کا نیلا پانی؛ بانہیں جیسے سفید مکھنی [3]۔ ترکھان نے سوچا لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دینے چاہئیں۔ سولجھا سا بر دیکھ کے رشتہ طے کر دیا۔ دن رکھ لیے گئے (شادی کا دن مقرر ہوگیا)۔

شادی میں پانچ دن تھے، جب لڑکی کو مائیوں بٹھایا گیا۔ اگلے دن گاؤں کی لڑکیوں نے ڈھولک پہ گیت گانے کا آغاز کیا۔ تیسرے دن پروہنے (مہمان) آنے شروع ہوئے۔ مہمانوں کو مانہہ (ماش) کی دال کے ساتھ روٹی دی گئی۔ شادی میں ایک دن باقی تھا کہ لڑکی کو مہندی لگائی گئی۔ اگلے روز دھوم دھڑکے سے جنیت (بارات) آئی۔ قاضی نے نکاح پڑھایا۔ تین دن برات نے لڑکی والوں کے ہاں قیام کیا۔ پہلے روز رات کو انھوں نے گڑ والے چاول کھائے۔ دوسرے دن دوپہر کو گوشت روٹی، ساتھ زردہ، رات کو فقط گوشت روٹی۔ تیسرے دن اُبلے ہوئے چاول، اُوپر دیسی کھنڈ (کھانڈ) کے ساتھ دیسی گھی ڈالا ہوا۔ یہ روٹی کھلا کر جنج (بارات) کو رخصت کر دیا گیا۔ دُلھن کو جہیز میں ایک پیٹی (بڑا صندوق)، ایک پلنگ، تین جوڑے، سات یا گیارہ بھانڈے (برتن) ملے اور بلّے بلّے (واہ وا!) ہوگئی۔

برات روانہ ہوئی۔ دلھن ڈولے میں بیٹھی تھی، جسے چار ماچھی [4] اُٹھائے ہوئے

---

[1] بیٹی دھریک (نیم کی قسم کا ایک درخت) کی طرح جلدی بڑی ہو جاتی ہے اور بیٹا آم کے پیڑ کی مانند دیر سے جوان ہوتا ہے۔

[2] کریر: ایک خاردار جھاڑی، جس کے کچے پھل کو ''ڈیلا'' اور پکے ہوئے کو ''پینجھو'' کہتے ہیں۔

[3] مکھنی: (مونث) مکھن۔

[4] ماچھی: (مذکر) ایک قوم (پرانے وقتوں میں دلھن کا ڈولا ماچھی/ جیر اُٹھا کے، لے کے جاتے تھے)

تھے۔ دو آگے سے اور دو پیچھے سے۔ گڈّی، جس کے آگے ایک بولد (بیل) جتا ہوا تھا، اس پر باراتی مرد اور بچے بیٹھے تھے۔ تب عورتوں کو بارات میں لے جانا بُرا سمجھا جاتا تھا۔ باراتیوں سے بھری کئی گڈیاں تھیں دُولھا بھی، انھیں میں سے ایک میں سوار ہو کر جا رہا تھا۔ گڈا، جسے دو بیل کھینچ رہے تھے، اس پر جہیز کا سامان لدا ہوا تھا۔

بھائی بھی ایک آنکھ پر پٹی باندھے، بَرات کے ساتھ ساتھ تھا۔ چلتے چلتے شکر دوپہر [1] ہوگئی۔ سُورج سوا نیزے پر آ گیا تھا۔ کہاروں نے ڈولا پیپل کے ایک گھنے درخت تلے جا اُتارا۔ تھکے ماندے براتی ٹھنڈی، گھنیری چھاؤں میں آرام کے لیے لیٹ گئے۔ ہوا کے سرد جھونکے آئے اور سب کی آنکھ لگ گئی، مگر بھائی جاگ رہا تھا۔ اتنے میں ایک چوڑھی (بھنگن) لہنگا پہنے، کمر پر گُو سے بھری ٹوکری ٹکائے، ہاتھ میں جھاڑو لیے، کولے مار کر چلتی ہوئی پاس سے گزری۔ اُس کے جی میں آئی ذرا ووہٹی (دلھن) کو تو دیکھتی جاؤں۔ چوڑھی ڈولے کے قریب جا بیٹھی اور پردہ اُٹھا کر دلھن کو دیکھنے لگی۔ سرخ رنگ کی سوتی خاشے [2] کی شلوار قمیص، ململ کے لال دوپٹے میں بہشت کی حُور ملبوس تھی۔ ناک میں نتھ، چھوٹی سی، سونے کی ایک باریک سی تار، جس میں تین موتی تھے۔ کانوں میں چاندی کی ڈنڈیاں [3] یا شاید مُرکیاں [4]، سفید گلے میں سونے کا انام تویتڑیاں [5] جو چھاتی پر لٹک رہا تھا۔ سِکّوں کی شکل کی تین تویتڑیاں دائیں جانب اور تین تویتڑیاں بائیں جانب، درمیان میں پان کے پتے جیسا انام تھا۔ (مُتوسّط طبقے میں صرف یہی ایک سونے کا زیور تھا، جو دلھن کو ملتا تھا۔) سَر کے عین درمیان میں چاندی کی ٹھوٹھی [6]، اُوپر کو اُٹھی ہوئی (بیٹی کو ٹھوٹھی ڈالنے کی بہت کم لوگوں میں ہمّت تھی)، مینڈھیوں میں پروئے ہوئے چاندی کے بگّل [6]، کلائیوں میں چاندی کی دو دو چوڑیاں۔ چوڑیوں سے آگے چاندی کا ایک ایک کڑا (کنگن)، ایک انگلی جتنا چوڑا۔ کڑے سے آگے پَری بند [1]، چاندی کا بنا ہوا، دو انگلاں (دو انگل کے برابر)

---

[1] شکر دوپہر: سخت دوپہر، کڑکتی دوپہر

[2] خاشا: ایک قسم کا سوتی کپڑا (غالباً یہ وہی کپڑا ہے، جو اُردو میں "خاصا" کہلاتا ہے)

[3] ڈنڈی: کانوں کا ایک زیور (جمع ڈنڈیاں)

[4] مُرکی: بالی، کان کا بالا (ایک زیور) (جمع: مُرکیاں)

[5] انام تویتڑیاں: گلے کا ایک زیور

[6] ٹھوٹھی، بگّل: بالوں میں سجانے کے دو زیور (یا تو سونے کے ہوتے تھے یا دونوں چاندی کے)

چوڑا، جس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے پتے سے لگے ہوئے، جو بانہہ ہلانے پر چھنکتے تھے۔ سفید انگلیوں میں چاندی کی ایک ایک انگوٹھی۔ گورے پیروں میں چاندی کی پنجریاں [2] دو انگلاں چوڑائی، جہاں پنڑی کھولنے کے لیے کُلف [3] لگا تھا، وہیں پانچ چھ بور [4] لگے ہوئے تھے، جو دلھن کے چلنے پر کھڑکتے (بجتے) تھے۔ یا پھر شاید سُگلے [5] تھے، چاندی کے بنے ہوئے، سارے کے سارے گھنگروؤں سے بھرے ہوئے۔

چوڑھی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سونے چاندی کے گہنے پات میں لدی دلھن دیکھ کر بھنگن کا دل بے ایمان ہو گیا۔ اُدھر دلھن، جو بھائی کی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی، کہنے لگی: ''نی! میری گل سُنیں۔ میرے ویرنوں اک اکھ توں وکھائی نئیں دیندا۔ جے تینوں کسے ایہو جیہے علاج بارے پتا ہووے، جیہدے نال میرے ویر دی اکھ ٹھیک ہو جاوے تے رب دے واسطے مینوں دس۔'' (اردو ترجمہ: اے میری بات سُننا، میرے بھائی کو ایک آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا۔ اگر تمھیں کسی ایسے علاج کے بارے میں پتا ہو، جس سے میرے بھائی کی آنکھ ٹھیک ہو جائے تو خُدا کے لیے مجھے بتاؤ۔) چوڑھی کے ہاتھ بہن کی کمزوری آ گئی۔ تھوڑی پہ انگلی رکھ کے، آنکھ مٹکا مٹکا کے بولی: ''ہائے میں مرگئی، نی اڑیئے! فکر نہ کر۔ اودھر پرے، کُجھ دُور اک دریا وگدا اے۔ اوہدے کنڈے تے ست چکر لا کے، جیہڑی دُعا وی منگی جاوے اوسی ویلے پوری ہو جاندی اے۔ کدی ردی نئیں جاندی۔ میرے نال چل، میں تینوں دریا تے لے جاندی آں''۔ (اردو ترجمہ: ہائے میں مَر گئی، اری! فکر نہ کر۔ اُدھر پرے، کُچھ دُور ایک دریا بہتا ہے۔ اُس کے کنارے سات چکر لگا کے جو دُعا بھی مانگی جائے اسی وقت پوری ہو جاتی ہے۔ کبھی رد نہیں ہوتی۔ میرے ساتھ چلو، میں تمھیں دریا پر لے جاتی ہوں۔)

سادہ لوح بہن اُس چھنال کی باتوں میں آ گئی۔ گھونگٹ نکالے، اسی طرح ڈولے میں سے نکلی اور چوڑھی کے ساتھ روانہ ہو گئی، بغیر کسی کو بتائے، چپکے سے، یہ سوچ کر کہ براتیوں کی آنکھ

---

[1] بَری بند: (فارسی۔ مذکر) بازو پر باندھنے کا ایک زیور

[2] پنجری: پاؤں کا ایک زیور

[3] کُلف: پنجری کھولنے کی جگہ

[4] بور: گھنگرو

[5] سُگلا: پازیب، پائل (پاؤں کا ایک زیور) (جمع: سُگلے)

کھلنے سے پہلے پہلے واپس آ جاؤں گی۔ چوڑھی آگے آگے تھی اور بہن پیچھے پیچھے۔ وہ دونوں دریا کے کنارے پہنچیں۔ جب بہن چوڑھی کے کہنے کے مطاق چکر لگانے لگی تو اس نے اسے روک کے کہا: ''نی اڑیئے! انج نئیں۔ پہلاں اپنے ایہہ ووہٹیاں والے لیڑے تے ٹوم چھلا لاہ کے مینوں پھڑا دے۔ فیر چکر لاویں، نئیں تے من دی مراد پوری نئیں ہووے گی۔'' (اردو ترجمہ: اری! اس طرح نہیں۔ پہلے اپنے یہ دُلھنوں والے کپڑے اور زیور اُتار کے مجھے پکڑا دے۔ پھر چکر لگانا، ورنہ مَن کی مراد پوری نہیں ہو گی) بہن نے اسی وقت سرخ لباس اور سنہری گہنے اُتار کے چوڑھی کے حوالے کر دیئے۔ دریا کنارے صدف میں سے موتی نکلا ہوا تھا۔ چوڑھی نے اپنا پُرانا سا دوپٹا سر سے اُتارا اور ہاتھ میں دے دیا۔ سفید بدن والی لڑکی نے جلدی جلدی دوپٹے سے ''بُکلتی''ؔ باندھی، آنکھیں بند کیں اور مُنہ ہی مُنہ میں اپنے بھائی کی آنکھ کی بینائی کے لیے دعائیں مانگتی ہوئی، دریا کنارے چکر لگانے لگی۔ بھنگن تاک میں تھی۔ ایک، دو، تین...... ساتویں چکر پر وہ یک لخت آگے بڑھی اور آن کی آن میں اُس نے بہن کو دریا میں دھکا دے دیا۔ پانی میں ایک چھپاکا سا ہوا اور بس۔

چوڑھی نے دلھن کا اُتارا ہوا سُرخ لباس، ٹوم گہنا جلدی جلدی خود پہنا، بھاگم بھاگ واپس آئی۔ دیکھا سب براتی اسی طرح سوئے پڑے ہیں۔ وہ چپکے سے ڈولے میں جا کے بیٹھ گئی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ مگر بھائی جاگ رہا تھا اور سب کُچھ دیکھ رہا تھا۔

اتنے میں پیپل کی ڈال پر ایک کوّا آن بیٹھا اور پکار پکار کر کہنے لگا: ''جے کوئی سُن دا، گن دا ہووے تے میری گل غور نال سنے۔ جیہڑا میری بٹھ چک کے انھی اکھ تے لاوے گا، اوسی ویلے سجاکھا ہو جاوے گا''۔ (اردو ترجمہ: اگر کوئی سنتا ہو تو میری بات غور سے سُنے۔ جو کوئی میری

ؔ بُکلتی: چادر یا دوپٹے کو سب سے پہلے کمر اور جانگھ کے گرد لپیٹنا، پھر اُس کے دونوں سروں کو آپس میں بل دے کر، دایاں سرا بائیں چھاتی کے اوپر سے اور بایاں سرا دائیں چھاتی کے اوپر سے گزار کر، دونوں کاندھوں پر ڈال کر، گردن کے پیچھے باندھ لینا۔ چادر یا دوپٹے کو باندھنے کا یہ خاص انداز اور اس کی حالت ہندی میں ''گاتی'' اور پنجابی میں ''بُکلتی'' کہلاتی ہے۔

گاتی، ساڑی، دھوتی۔ تینوں ایک ہی انداز کے پہناوے ہیں۔ ان سلے اور کپڑے کی ایک ہی چادر پر مشتمل۔ گاتی اور ساڑی عورتیں باندھتی ہیں۔ اسی لیے ان میں بدن کا اوپر والا حصّہ بھی چھپایا جاتا ہے۔ مرد دھوتی باندھتے ہیں، اس میں جسم کا اوپر والا حصّہ چھپانا ضروری نہیں۔

بیٹ اُٹھا کر اندھی آنکھ پر لگائے گا، اُسی وقت بینا ہو جائے گا۔)

بارات میں ایک آدمی جاگ پڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان آنکھ پر پٹی باندھے لیٹا ہے۔ وہ اُٹھا اور کوّے کی بیٹ، ذرا سی انگلی پہ لے کے لڑکے کی بیٹھی ہوئی آنکھ پر لگا دی۔ بیٹ کا لگنا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے لڑکے کی آنکھ ٹھیک ہو گئی۔ اسے سب صاف دکھائی دینے لگا۔

سہ پہر ہونے کو آئی تھی۔ باراتی اُٹھ بیٹھے۔ دُولھے کے باپو نے جلدی مچا دی۔ کہاروں نے فٹافٹ ڈولا اُٹھا کے دوبارہ کاندھوں پر رکھا اور چل پڑے۔ لیکن وہ حیران ہو رہے تھے کہ ڈولا اچانک اتنا بھاری کیسے ہو گیا؟ پہلے تو پھُول کی طرح ہلکا پھلکا تھا۔ وہ بار بار دُلھن سے پوچھتے کہ کہیں اپنے ساتھ اینٹ پتھر تو نہیں رکھ لیے؟ وہ ہانپ رہے تھے۔ بار بار دم لینے کے لیے رکتے؛ ڈولا زمین پر رکھتے؛ دو گھڑی بیٹھتے؛ پھر اُٹھاتے اور دوبارہ چل پڑتے۔ یُوں ہولے ہولے برات دُولھا کے گھر پہنچ گئی۔ اب بھائی نے واویلا کیا۔ دوہائی دی۔ سب کو حقیقت بتائی۔ جونہی لوگوں نے آگے بڑھ کر ڈولے کا پردہ اُٹھایا، کیا دیکھتے ہیں اندر چاند سے چہرے اور متناسب بدن والی، دودھ جیسی گوری چِٹّی، دلھن کی جگہ کالی کلوٹی، اُلٹا توا، کالی بلا، ہٹّی کٹّی، موٹی تازی، مسٹنڈی چوڑھی دُلھن کا سُرخ لباس اور سونے چاندی کے گہنے پہنے بیٹھی ہے۔ لوگوں نے اسے کھینچ کر ڈولے سے باہر نکالا۔ بھنگن نے مارے خوف کے، کانپتے کانپتے سب کچھ بتا دیا۔ جب انھیں پتا چلا کہ اس نے اصلی دلھن کو دریا میں دھکا دے دیا ہے، تو لوگ غصّے سے آگ بگولا ہو گئے۔ انھوں نے ڈنڈے مار مار کر چوڑھی کو مار ڈالا۔

اب سب لوگ بھاگتے، دوڑتے دریا کے کنارے پہنچے۔ انھوں نے ٹھیک اس مقام پر جال ڈالا جہاں دلھن دریا میں گری تھی۔ ان کے جال میں ایک بہت بڑی مچھلی پھنس گئی۔ انھوں نے مل کر جال کھینچا۔ مچھلی کو کنارے تک لے آئے۔ جب مچھلی کا پیٹ چاک کیا گیا تو بہن زندہ سلامت باہر نکل آئی۔ کدّو کی ایک بیل نے اس کا ننگ ڈھانپنے کے لیے فوراً اس پر اپنے بڑے بڑے سبز پتوں کا سایہ کر دیا۔ لوگ خوشی سے ناچنے لگے۔ اسی وقت ڈولا لایا گیا۔ دلھن سُرخ جوڑا اور پیلے گہنے پہن کے دوبارہ ڈولے میں جا بیٹھی۔ بھائی بہن کو زندہ سلامت پا کے شادکام ہوا اور بہن بھائی کو سجا کھا (بینا) دیکھ کر باغ باغ ہوئی۔ بھائی ہنسی خوشی واپس گھر کو ہوا، بہن شرماتی، لجاتی اپنے سسرال چلی۔ انھیں وداع کر کے میں بھی اپنے گھر لوٹ آئی۔

اپنی میری بات
اُتوں پئی رات
چھتنا سی کوٹھا
چھت لئی سَبات

(اردو ترجمہ: میری کہانی اتنی ہی تھی۔ اُوپر سے رات ہوگئی۔ میں نے کوٹھا تعمیر کرنا تھا اور کوٹھڑی تعمیر کرلی۔)

۱۵۔ دسمبر ۲۰۰۵ء

مَیں جیوندا، میں جاگ دا

دنیا بھر کے لوک ادب میں، نمایاں طور پر، بولنے والے جانوروں کا تصور ملتا ہے۔ حتیٰ کہ حکایت (Fable) جیسی ادبی اصناف میں بھی وہ نظر آتے ہیں، جیسے ''ای سوپ کی حکایات'' (Aesop's Fables) بہت سی لوک کہانیوں کے مرکزی کردار پرندے، چرندے، درندے اور حشرات الارض ہیں؟ جو آپس میں انسانوں کی طرح باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انسانوں کی طرح ان کی اپنی حکومت ہوتی ہے، وہ بادشاہوں کو منتخب کرتے ہیں، شادیوں کی خوشیاں مناتے ہیں اور ایک دوسرے سے انتقام لیتے ہیں (کبھی کبھی انسانوں سے بھی) یہ کہانی، جس کی راوی ''مامی میداں'' ہیں، اسی انداز کی کہانی ہے۔

یہ کہانی میرے بچپن کی یادگار ہے۔ اسے میں نے بار بار سُنا۔

بظاہر صدیوں پُرانی یہ لوک کہانی چھوٹے بچوں کے دل بہلاوے کے لیے ہے، لیکن اس میں اُس نفرت کا بہت بھرپور اظہار ہوا ہے، جو پُرانے زمانوں میں جابر اور مُطلق العنان بادشاہوں کے لیے عوام الناس کے دلوں میں چھپی ہوئی تھی۔

ایک تھا راجا۔ راجے نے ''کنگنی [1]'' کا کھیت بویا۔ ایک بٹیرا (بٹیر) روزانہ کھیت میں جاتا، چگھی [2] کے لیے۔ دانہ دُنکا چگتا اور پھلاہی کے درخت پر بنے اپنے آہلنے (گھونسلے) میں واپس آجاتا، بیوی بچوں کے پاس۔ سب مزے سے پلنے لگے۔ لیکن بٹیری کے دل میں کھٹکا تھا۔ ہزار اندیشے۔ سوچ سوچ کے دل تلے اُوپر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بٹیرے کو راجے کے کھیت میں جانے سے منع بھی کرتی، سمجھاتی بجھاتی اور کہتی: ''سرتاج! آپ سلامت رہیں ہم، رُوکھی سوکھی ہی میں خوش ہیں۔ ایسی چپڑی پہ لعنت جسے کھا کے ہم کسی ظالم کا نوالہ ہو جائیں۔ آپ نے دنیا کا ابھی کیا دیکھا ہے۔ آپ کے ہونٹوں سے دودھ کی بُو نہیں گئی۔ میرے منہ میں خاک۔ اگر کل کلاں کو راجے نے آپ کو پکڑ لیا تو؟'' بٹیرا کان میں تیل ڈال کر سو رہتا۔ بیوی کی بات کو کچھ اہمیت نہ دیتا۔ کہتا تو یہ کہتا: ''نیک بخت! کل کس نے دیکھی ہے؟ کل کی فکر میں آج کا سکھ کیوں گنوائیں۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

کوئی روز ہوئے، راجا درباریوں کے ساتھ سیر کرتا ہوا اپنے کھیت میں آیا۔ دیکھا تو ہر طرف خاک اُڑ رہی تھی۔ کھیت ویران ہو رہا تھا۔ راجے نے مَن میں کہا: ''کھیتی خصم سیتی''۔ دو چار

---

[1] ایک چھوٹے دانے کا اناج

[2] بٹیروں کا دانہ کھانا

دن راجا دیکھتا رہا۔ آخر ایک روز اُس نے فیصلہ کیا کہ میں خود کھیت کی راکھی (رکھوالی) کروں گا۔ راجا وَن کے ایک درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں جا بیٹھا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ بٹیرا اُڑتا ہوا آیا اور باجرے کے کھیت میں اُترا۔ دانہ دنکا چگنے لگا۔ راجے نے سب دیکھ لیا۔ اپنے کھیت کی تباہی کا بھید پالیا۔

اگلی صبح راجے نے کھیت میں جال لگا دیا۔ بٹیرا اپنی دنیا میں مست، پر پھڑ پھڑاتا آیا اور بے تکلّف کھیت میں اِدھر اُدھر پھُدکنے لگا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ آخر جال میں پھنس گیا۔ راجا ہنستا، کھلکھلاتا آیا اور بٹیرے کو پکڑ لیا۔ غریب کے پر باندھ دیے اور خوشی خوشی اُمَرا کے جِلَو میں راج محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ بٹیری کا مَن بے کل ہو گیا۔ طبیعت گھبرائی، آہلنے سے اُڑ کے تازہ ہوا میں آئی۔ اب جو منظر آنکھوں نے دیکھا، دل دھک سے ہو گیا۔ جس کا کئی دن سے کھٹکا لگا ہوا تھا، وہ بات ہو کر رہی۔ قسمت کا لکھا پُورا ہوا۔ راجا اپنے مصاحبوں کے ساتھ بٹیرے کو پکڑے، ہنستا مسکراتا چلا جا رہا تھا۔ بے چاری نصیبوں جلی راجے کے سَر پہ اُڑنے لگی۔ چیخ چیخ کے نوحہ و فریاد کرنے لگی؛ دوہائی دینے لگی۔ اور اپنے بٹیرے سے کہنے لگی:

"میں آکھ رہی، میں باکھ رہی

ے بعض راویوں کے نزدیک یہ کہانی توتے اور توتی کی ہے۔ راجے کی جگہ جٹ (جاٹ) کا ذکر ہے۔ اشعار میں بھی اختلاف ہے۔ توتی کہتی ہے:

توتیا! مَن موتیا! میں آکھ رہی، میں باکھ رہی
تُوں جٹ دے کھیت نہ جا ایہہ جٹ اے بُری بلا
ایہہ لیندے پھاہیاں لا

(اردو ترجمہ: اے توتے! اے میرے من موہن! میں کہتی رہی، میں شکایت کرتی رہی۔ تو جاٹ کے کھیت میں مت جانا۔ یہ جاٹ بُری بلا ہیں۔ یہ پھندے لگا کے پکڑ لیتے ہیں)

توتا آگے سے کہتا ہے:

توتیے! مَن موتیے! میں جیوندا، میں جاگ دا
میں صابن لا، لانوہناں آں میں گھوڑے کاٹھی پوہناں آں
تُوں چل بچیاں دے کول، میں آناں آں

(اردو ترجمہ: اے توتی! اے میری مَن موہنی! میں زندہ ہوں، میں جاگ رہا ہوں۔ میں صابن لگا لگا کے نہا رہا ہوں۔ میں گھوڑے پہ کاٹھی کس رہا ہوں۔ تو بچّوں کے پاس چل، میں آ رہا ہوں۔)

تُوں راجے کھیت نہ جائیں، وے بٹیریا! "

(اردو ترجمہ: میں کہتی رہی، میں شکایت کرتی رہی؛ تُو راجے کے کھیت نہ جائیں، اے بٹیر!)

بٹیرا، جسے راجے نے پکڑا ہوا تھا، بڑے جگرے سے بولا:

"میں جیوندا، میں جاگ دا

توں چل بچیاں دے کول، نی بٹیریئے!"

(اردو ترجمہ: میں زندہ ہوں، میں جاگ رہا ہوں۔ تو بچّوں کے پاس چل، اری بٹیری!)

شوہر کے حکم پر بٹیری واپس چلی گئی آ ہلنے میں، اپنے ننھے منّے بچّوں کے پاس۔

راجے کو رحم نہ آیا۔ اُس نے محل میں جا کے بٹیرے کو سونے کے پنجرے میں قید کر دیا۔ خاوند سلاخوں کے پیچھے ہو، بیوی کا جی گھر میں کیسے لگے۔ بے چاری قسمت کی ہیٹا پھر آ گئی۔ محل کی دیوار پہ آ کے بیٹھ گئی۔ ظالم کا دل نہ پسیجا۔ راجے نے شاہی خانساماں کو حکم دیا:

"بٹیرے کو ذبح کرو۔ فوراً میرے لیے مزے دار شوربا تیار کر کے لاؤ۔ آہا! آج تو میں بٹیرے کے گوشت سے روٹی کھاؤں گا۔"

جب بٹیرے کی گردن پہ چُھری رکھی گئی، بٹیری نے چیخ چیخ کر آسمان سَر پر اُٹھا لیا۔ بے چاری ابھاگن نے نالہ وفغاں کیا، چیخم دھاڑ مچائی، مگر پیش نہ گئی۔ بٹیرے سے کہنے لگی:

"میں آکھ رہی، میں باکھ رہی

تُوں راجے کھیت نہ جائیں، وے بٹیریا!"

بٹیرا چُھری کے نیچے سے، بڑی بہادری سے بولا:

"میں جیوندا، میں جاگ دا

تُوں چل بچیاں دے کول، نی بٹیریئے!"

خاوند کے حکم پر بٹیری واپس چلی گئی۔ ادھر بٹیرے کے گلے پہ چُھری پھر چکی تھی۔ اسے ذبح کیا جا چکا تھا۔ اُس کے پنکھ اُتار دیے گئے۔ چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کر دی گئیں۔ باورچی نے ہنڈیا چولھے پر چڑھا دی۔ دیسی گھی میں پیاز لہسن وغیرہ کو داغ کیا۔ بگھار لگایا۔ جب بٹیرے کی بوٹیاں ڈالنے لگا تو بٹیری پھر روتی دھوتی محل کی منڈیر پر آ بیٹھی اور آہ وزاری کرتی ہوئی اپنے بٹیرے سے کہنے لگی:

"میں آکھ رہی، میں باکھ رہی

تُوں راجے کھیت نہ جائیں، وے بٹیریا!"

بٹیرے کی تھرکتی ہوئی بوٹیوں سے آواز آئی:

''میں جیوندا، میں جاگ دا
تُوں چل بچیاں دے کول، نی بٹیریئے!''

اپنے بندے (خاوند) کا حکم مانتے ہوئے بٹیری پھر گھر لوٹ گئی۔

جب ہانڈی میں مرچ ڈالی گئی تو بٹیرے کی بوٹیوں سے آواز آئی:

اسیں لال سوہے ہوئے

(اردو ترجمہ: ہم لال سُرخ ہو گئے)

جب ہانڈی میں ہلدی ڈالی گئی تو بوٹیاں تھرک تھرک کے بولیں:

اسیں پیلے پیلے ہوئے

(اردو ترجمہ: ہم پیلے پیلے ہو گئے)

جب ہانڈی میں پانی ڈالا گیا تو بٹیرے کی بوٹیاں کہنے لگیں:

اسیں گڑبڑ گڑبڑ رِجھے

(اردو ترجمہ: ہم افراتفری کی حالت میں پکنے لگے، اُبلنے لگے)

سالن تیار ہو گیا۔ جب راجا دستر خوان پر کھانا کھانے بیٹھا، بوٹیوں سے آواز آئی:

اسیں نھیر کوٹھری چلّے

(اردو ترجمہ: ہم اندھیری کوٹھڑی (مراد ہے: پیٹ) میں چلے)

راجا کیا جانے بھوک کی سہار۔ راجے نے مزے لے لے کر کھانا کھایا۔ بٹیرے کی بوٹیاں کھائیں، خُوب سیر ہو کر مزے دار شوربا پیا۔ پھر ڈکار لے کر، پیٹ پر ہاتھ پھیر کر اُٹھا۔ پائیں باغ میں جا کر چہل قدمی کرنے لگا۔ بٹیری ایک پیپل کے درخت پہ آبیٹھی اور چھاتی پیٹتی ہوئی کہنے لگی:

''میں آکھ رہی، میں باکھ رہی
تُوں راجے کھیت نہ جائیں، وے بٹیریا!''

راجے کے پیٹ میں سے بٹیرے کی آواز آئی:

''میں جیوندا، میں جاگ دا
تُوں چل بچیاں دے کول، نی بٹیریئے!''

یہ سُن کر بٹیری بے چاری پھر لوٹ گئی۔

راجے کے پیٹ میں گڑبڑ ہونے لگی۔ اُس نے تالی بجائی۔ وزیراعظم سلطنت دوڑا دوڑا آیا۔ راجے نے حکم دیا کہ فوراً شاہی فوج کا ایک چاق و چوبند مسلح دستہ حاضر ہو۔ فوجی جوان آ گئے۔ راجا بولا:

''اپنی اپنی تلواریں میان سے نکال لو۔ میرے اردگرد گھیرا ڈال کے کھڑے ہو جاؤ۔ جونہی میں رفع حاجت کے لیے بیٹھوں اور بٹیرا اُڑتا ہوا باہر نکلے، اُسی لمحے تلواریں مار کر اُس کا کام تمام کردو۔ یاد رکھنا اگر ناکام ہوئے تو تم سب کا بال بچہ کولھو میں پیل ڈالوں گا اور تمھیں زمین پر لٹا کر ہاتھی کے پاؤں تلے کچل ڈالوں گا۔''

یہ سُن کے سپاہی خوف سے کانپنے لگے۔ بے چارے آنکھ جھپکنا بھول گئے۔ ننگی تلواریں لیے مستعد ہو کر راجے کے گرداگرد کھڑے ہو گئے۔ جونہی راجے نے رفع حاجت کی۔ چاروں اور سے دَھڑا دَھڑ تلواریں چلیں مگر یہ کیا؟ بٹیرا تو کب کا نکل کر، پھر سے اُڑ گیا تھا۔ ہاں شاہی باغ کی ہری ہری گھاس سُرخ خُون سے تر بتر ہو رہی تھی۔ سپاہیوں کی تلواریں لگنے سے راجے کے چُوتڑ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے اور وہ پڑا ہائے ہائے کر رہا تھا۔

بٹیرا آلھنے میں اپنی بٹیری کے پاس آیا اور بولا:

اسیں چنگے بھلے آئے
اسیں چِتڑ وڈھا کے آئے

(اردو ترجمہ: ہم تندرست و توانا (واپس) آئے۔ ہم (راجے کے) چُوتڑ کٹوا کے (واپس) آئے۔)

بٹیری اپنے بٹیرے کو زندہ سلامت دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ اُس کے بعد بٹیرا پھر سے اُڑا، راجے کے محل میں گیا۔ راجے کی سات رانیاں تھیں۔ اُن سے بولا: ''راجے نے پیغام بھیجا ہے کہ میری ساتوں رانیاں اپنے اپنے سر مُنڈا لیں۔''

رانیوں کے ٹخنوں ٹخنوں تک لمبے لمبے، کالے بال تھے۔ یہ سُن کر سب نے نائی کو بلوا کے اپنے سروں پر اُسترا پھروا لیا۔ بٹیرا محل کی منڈیر پہ بیٹھا، یہ منظر دیکھتا رہا۔ پھر وہاں سے اُڑا، اپنے آلھنے میں واپس آیا اور لہک لہک کر بٹیری سے کہنے لگا:

اسیں چنگے بھلے آئے
اسیں روڈ مداری کر کے آئے

(اردو ترجمہ: ہم تندرست و توانا (واپس) آئے۔ ہم (راجے کی رانیوں کو) گنجا کر کے (واپس)

آئے) بٹیرا اور بٹیری اپنے بچوں کے ساتھ پھلاہی کے پیڑ پہ ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

اتوار ۲۔ دسمبر ۲۰۰۷ء

مَیں لال مَوجے پاناں آں

اس لوک کہانی کی راوی ''مامی میداں'' ہیں۔ یہ چھوٹی سی، پیاری سی کہانی اُن کہانیوں میں شامل ہے جنھیں میں نے اپنے بچپن میں بار ہا سُنا۔

اس طرح کی کہانیاں، جن میں ایک ہی شعر یا بند بار بار دوہرایا جاتا ہے، بہت چھوٹے بچوں کے دل بہلاوے کے لیے کہی جاتی ہیں۔ ہاں، ان میں کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق بھی ہوتا ہے، جیسے اس کہانی میں سُستی، تن آسانی، بے عملی اور بہانہ بازی کا برا انجام دکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کہانیوں کا ایک معلوماتی پہلو بھی ہے، جیسے اس کہانی میں گندم کی بوائی سے لے کر کٹائی تک کے تمام مراحل نہایت ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں۔

ایک تھی چڑی (چڑیا)، ایک تھا کاں (کوا)۔ جب کاتک کا مہینہ آیا، چڑی کاں سے کہنے لگی: ''کانواں! کانواں! آجا کنک بیج لیئے'' (اردو ترجمہ: کوے! کوے! آؤ، گندم بوئیں) یہ سُن کر کاں فوراً بولا:

چل، چڑیئے! میں آناں آں
میں لال مَوجے پاناں آں
میں ٹھم ٹھم کردا آناں آں

(اردو ترجمہ: اے چڑیا! تو چل، میں آتا ہوں۔ میں لال سُرخ بوٹ پہن رہا ہوں۔ میں ٹھمک ٹھمک کر، مٹک مٹک کر (تیرے پیچھے پیچھے) آتا ہوں۔)

مگر کاں نہ آیا۔ چڑی بے چاری، اکیلی جان نے خود ہی سارے کھیت میں کنک بوئی۔ اب وٹاں (وٹ: پانی کا بند) بنانے کی باری آئی۔ چڑی پھر کاں کے پاس گئی اور بولی: ''کانواں! کانواں! آجا، وَٹ پالیئے'' (کوے۔ ے! آؤ، پانی کا بند باندھ لیں)۔ یہ سُن کر کاں فوراً بولا:

چل، چڑیئے! میں آناں آں
میں لال موجے پاناں آں
میں ٹھم ٹھم کردا آناں آں

مگر کاں نہ آیا۔ چڑی غریب نے خُود ہی وَٹ بنائی۔ اب کھیت کو پانی دینے کی نوبت آئی۔ چڑی پھر کاں کے پاس گئی اور بولی۔ ''کانواں! کانواں! آجا، پانی لائیے'' (اُردو ترجمہ: کوے!

کوے! آؤ کھیت کو پانی دیں) یہ سُن کر کاں فوراً بولا:

چل، چڑیئے! میں آناں آں
میں لال موجے پاناں آں
میں ٹھم ٹھم کردا آناں آں

مگر کاں نہ آیا۔ چڑی نے، تنِ تنہا، خُود ہی سارے کھیت کو پانی دیا۔ ہولے ہولے فصل اُگ آئی۔ رفتہ رفتہ پودے بڑے ہو گئے۔ ہری ہری فصل لہلہانے لگی۔ سِٹے (خوشے، اناج کی بالیاں) گندم کے دانوں سے بھر گئے۔ ان کا رنگ سبز تھا۔ پھر دھوپ میں پک کر سنہری ہو گیا۔ بیساکھ کا مہینہ تھا۔ واڈھی (فصل کی کٹائی) سر پر تھی۔ چڑی پھر کاں کے پاس گئی اور بولی: ''کانواں! کانواں! آ جا، کنک وڈھ لیئے'' (اُردو ترجمہ: کوے! کوے! آؤ گندم کاٹ لیں) یہ سُن کر کاں فوراً بولا:

چل، چڑیئے! میں آناں آں
میں لال موجے پاناں آں
میں ٹھم ٹھم کردا آناں آں

مگر کاں نہ آیا۔ چڑی، اکیلی جان، نے خود ہی گندم کی فصل کاٹی۔ اب پریاں (فَصل کے گٹھے) باندھنے کی نوبت آئی۔ چڑی پھر کاں کے پاس گئی اور بولی: ''کانواں! کانواں! آ جا پَریاں بنھ لیئے'' (اردو ترجمہ: کوے! کوے! آؤ فصل کے گٹھے باندھ لیں)۔ یہ سُن کر کاں فوراً بولا:

چل، چڑیئے! میں آناں آں
میں لال موجے پاناں آں
میں ٹھم ٹھم کردا آناں آں

مگر کاں نہ آیا۔ چڑی نے خود ہی کٹی ہوئی فصل گٹھوں کی شکل میں باندھی۔ اب کنک گاہنے[1] کا مرحلہ آیا۔ چڑی پھر کاں کے پاس گئی اور بولی: ''کانواں! کانواں! آ جا، کنک گاہ لیئے'' (اُردو ترجمہ: کوے! کوے! آؤ دانے بالیوں میں سے نکالیں) یہ سُن کر کاں فوراً بولا:

چل، چڑیئے! میں آناں آں

---

[1] گاہن/گاہنا: مسلنا، روندنا، اناج پر بیلوں کو پھرانا تا کہ دانے بالیوں میں سے نکل آئیں۔

میں لال موجے پاناں آں
میں ٹھُم ٹھُم کردا آناں آں

مگر کاں نہ آیا۔ چڑی بے چاری نے خود ہی پیڑی [1] لگائی، خود ہی گاہن کیا۔ اب کنک اُڑانے [2] کا موقع آیا۔ چڑی پھر کاں کے پاس گئی اور بولی: ''کانواں! کانواں! آجا، کنک اُڑا لیئے'' (اردو ترجمہ: کوّے! کوّے! آؤ اناج بھوسے سے الگ کرلیں) یہ سُن کر کاں فوراً بولا:

چَل، چِڑیئے! میں آناں آں
میں لال موجے پاناں آں
میں ٹھُم ٹھُم کردا آناں آں

مگر کاں نہ آیا۔ چڑی غریب نے خود ہی کنک اُڑائی۔ اناج علیحدہ کیا اور توڑی (بھُوسا) علیحدہ۔ جب بوہل (اناج کا ڈھیر) لگ گیا تو چڑی پھر کاں کے پاس گئی اور بولی: ''کانواں! کانواں! آجا، دانے ونڈ لیئے'' (اردو ترجمہ: کوّے! کوّے! آؤ اناج (آپس میں) بانٹ لیں) اس دفعہ کاں ٹھُم ٹھُم (ٹھمک ٹھمک) کرتا چڑی کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ کھیت میں پہنچ کر چالاک کاں نے یوں ونڈ پائی (تقسیم کی) کہ دانے خود لے لیے اور بے چاری چڑی کو توڑی دے دی۔ ساری محنت چڑی کی، اس غریب کو توڑی ملی۔ اور کاں جس نے تنکا نہ توڑا، ساری گندم کا مالک بن بیٹھا۔ چڑی نے توڑی اُٹھائی اور اس سے شرینہہ (سرس) کے درخت پر اپنے لیے ایک مضبوط آلھنا (گھونسلا) تیار کرلیا۔

اُسی رات آندھی چڑھی، غبار اُٹھا، گرد نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ جھکّو چل رہے تھے۔ چڑی اپنے توڑی کے آہلنے میں محفوظ تھی۔ اُدھر کاں اپنے گندم کے دانوں میں بار بار گھستا تھا۔ ہر بار دانے نیچے کھسک جاتے تھے۔ ساری رات جھکّو چلے، بجلی چمکی، بادل گرجے، مینہ چھاجوں برسا۔ اگلے دن جب پو پھٹی، کاں کی لاش اناج کے ڈھیر پہ پڑی نظر آئی۔ چڑی نے کاں کو چونچ سے اُٹھا کے دُور پھینکا اور کنک سے اپنے بھڑولے [3] بھر لیے۔

جمعہ ۲ر مئی ۲۰۰۸ء

---

[1] پیڑی: گاہنے کے لیے دائرے کی صورت میں بکھرا ہوا کھلیان۔

[2] کنک اُڑانا: ترنگلی (ایک شاخ دار، پنجا نما آلہ) سے فصل اوپر کو اُچھالنا تاکہ ہوا کی مدد سے بھوسا الگ ہو جائے اور دانے الگ۔

[3] بھڑولہ: (مذکر) غلہ دان، اناج محفوظ رکھنے کی کوٹھی

آیا، لا لیے! آیانی

اس کہانی مینا ور'' میں لال موجے پاناں آں'' نامی کہانی میں حیران کن مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کہانیوں کا انداز، مرکزی خیال اور اخلاقی سبق ایک ہی ہے۔ فرق ہے تو صرف کرداروں کا اور موقع محل کا۔ وہاں ''کوے'' کے ساتھ ''چڑیا'' ہے اور یہاں ''لالی''۔ وہاں ''گندم'' کا تذکرہ ہے اور یہاں ''دھان'' کا۔ بار بار دہرائے جانے والے شعر تو مختلف ہیں ہی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی لالی ؎ نے ''کاں'' (کوا) سے کہا: ''چوں چوں، چر چر، کانواں! کانواں! آجا ہم دونوں مل کر دھان بوئیں''۔ کاں نے جھٹ پٹ کائیں کرتے ہوئے حامی بھر لی۔

دھان بونے کے لیے پانی کی بہت ضرورت پڑتی ہے۔ پورے کھیت کو بنوں (مینڈ، کھیت کا کنارا) تک، لبالب پانی سے بھرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ لالی اور کاں نے کنواں کھودنے کا ارادہ کیا۔ دونوں نے اپنی اپنی چونچوں سے زمین کھودنی شروع کی۔ ابھی ذرا سی مٹی کھدی تھی کہ چٹاک سے کاں کی چونچ ٹوٹ گئی۔ وہ فوراً بھاگا بھاگا ترکھان (بڑھئی) کے پاس گیا، اپنے لیے لکڑی کی چونچ گھڑوانے۔

اُدھر بے چاری لالی نے تنِ تنہا، ہزاروں جتن کرکے، اپنی چونچ سے کنواں کھودا۔ جب کھیت سینچنے کا موقع آیا تو دوڑی دوڑی کاں کے پاس گئی اور بولی: ''چوں چوں، چر چر، کانواں! کانواں! آجا ہم دونوں مل کر کھیت میں پانی لگائیں۔'' یہ سُن کر کاں فوراً بولا:

کھوہ کھودینداں
چنجھ بھنیداں
چنجھ گھڑینداں
چنجھ چڑھینداں
آیا، لا لیے! آیانی

(اردو ترجمہ: کنواں کھودتے ہوئے میری چونچ ٹوٹ گئی۔ اب میں (ترکھان سے

؎ لالی کالی چونچ اور نیلے پیلے پنکھوں والی ایک چھوٹی سی، خوش آواز چڑیا

لکڑی کی) چونچ گھڑوا کے، (پھر اپنے مُنھ پر) چونچ چڑھا کے، میں آیا، اے لالی! میں ابھی آیا)

بے چاری لالی، اکیلی جان نے، بِنا کسی کی امداد کے، سارے کھیت میں پانی لگایا۔ اب دھان کی پنیری جمانے کا موقع آیا۔ بھاگی، دوڑی کاں کے پاس گئی اور بولی: ''چُوں چُوں، چِر چِر، کانواں! کانواں! آ جا ہم دونوں مل کر کھیت میں پنیری جمائیں''۔ یہ سُن کر کاں فوراً بولا:

کھوہ کھودینداں
چنجھ بھنیداں
چنجھ گھڑینداں
چنجھ چڑھینداں
آیا، لالیے! آیانی

غریب لالی نے بِنا کسی کے سہارے، سارے کھیت میں ایک ایک کر کے پنیری جمائی۔ ہولے ہولے پودے بڑے ہو گئے۔ سٹے [1] چاولوں سے بھر گئے۔ ہر طرف ہری ہری فصل لہلہانے لگی۔ دھیرے دھیرے فصل پک کر تیار ہو گئی۔ اب واڈھی [2] سر پر تھی۔ لالی بے چاری پھر بھاگم بھاگ کاں کے پاس گئی اور بولی: ''چُوں چُوں، چِر چِر، کانواں! کانواں! آ جا ہم دونوں مل کر مونجی [3] کاٹیں''۔ یہ سُن کر کاں فوراً بولا:

کھوہ کھودینداں
چنجھ بھنیداں
چنجھ گھڑینداں
چنجھ چڑھینداں
آیا، لالیے! آیانی

بے یار و مددگار لالی نے، تنِ تنہا، دھان کی فصل کاٹی۔ بانس یا جھاؤ سے بنے ایک

---

[1] سٹے: خوشے اناج کی بالیاں

[2] واڈھی: فصل کی کٹائی

[3] مونجی: دھان، چاول کا پودا

[4] چھڈان: چاول کے دانے الگ کرنا۔

اُلٹے کھانچے (ٹوکرے) پر مار مار کر مونجی علیحدہ کی۔ جب مونجی دھوپ میں خشک ہوگئی تو مونجی چھڑان ؎ کا موقع آیا۔ لالی پھر دوڑی دوڑی کاں کے پاس گئی اور بولی: ''چوں چوں، چچڑ چچڑ، کانواں! کانواں! آجا ہم دونوں مل کر بھوسے سے چاول کے دانے الگ الگ کریں۔'' یہ سُن کر کاں فوراً بولا:

کھوہ کھودیندااں

چنجھ بھنیدااں

چنجھ گھڑیندااں

چنجھ چڑھیندااں

آیا، لالیے! آیانی

مثل مشہور ہے: ''اکیلے دکیلے کا اللہ بیلی''۔ لالی نے خود ہی مونجی کو اکھلی [1] میں ڈالا، مونگلی [2] سے کوٹا۔ چھج (چھاج) سے چھان کر بھوسا اور چاول کے دانے الگ الگ کیے۔ پھر چاول دیگچی میں ڈالے، چولھے پہ رکھے، پکائے اور مزے سے کھائے۔

شام کو کاں پھدکتا، پچھتاتا، مٹکاتا لالی کے گھر آیا، چاول کھانے کے لیے۔ دروازہ بھیڑا ہوا تھا۔ کاں پکارا:

''لالیئے! لالیئے! کنڈا لاہ ، لالیئے! لالیئے! کنڈا لاہ

(اردو ترجمہ: اے لالی! اے لالی! کنڈی کھول، اے لالی! اے لالی! کنڈی کھول)

لالی غصّے سے بھری بیٹھی تھی، کاں پکارتا رہا، اُس نے دروازہ نہ کھولا۔ رات کو آندھی چڑھی۔ طوفان نے بھاری بھرکم درخت جڑ سے اکھاڑ ڈالے۔ پچھلے پہر تک جھکّڑ چلتے رہے، بجلی چمکتی رہی، بادل گرجتے رہے، بارش ہوتی رہی، مگر لالی نے دروازہ نہ کھولا۔ اگلے روز جب مطلع صاف ہوا، پَو پھٹی، سب پرندوں نے دیکھا، کاں کی لاش بیری کے پیڑ تلے، لالی کے گھونسلے کے نیچے زمین پر پڑی ہوئی تھی۔

ہفتہ ۸/مارچ ۲۰۰۸ء

---

[1] اکھلی: اُوکھلی، پتھر یا لکڑی کی کنڈی جو زمین میں گڑی ہوتی ہے۔

[2] مونگلی: موگری، لکڑی کی ہتھوڑی، مراد ہے: مُوسل

چالاک بگھیاڑ [1]

ہزاروں سالوں سے ہماری دھرتی کی نانیاں، دادیاں اس طرح کی کہانیاں اپنے نواسوں اور پوتوں کو سُنا رہی ہیں۔ بچوں کو ان میں کچھ بھی "قابلِ گرفت" نظر نہیں آتا۔ وہ تو بس ہنستے ہیں، کھل کھلا کے ہنستے ہیں اور ان کے ساتھ سنانے والی بھی۔ کیونکہ اس وقت وہ نوے سال کی بڑھیا نہیں رہتی، بلکہ انہی کی عمر کی ایک چھوٹی سی بچی بن جاتی ہے۔ یہ صرف بڑے ہیں جن کی آنکھیں "دیکھنے" میں اور جن کا ذہن "فیصلہ دینے" میں بہت جلد باز ہے۔ وہ فوراً کہتے ہیں: "چُپ، اُن میں فحاشی ہے۔" حالانکہ بچپن میں جب وہ خود یہ کہانیاں سُنتے تھے، تو انھیں ہرگز فحش نہیں لگتی تھیں۔ کیوں کہ فحاشی کی تعریف جہاں ہر عہد میں مختلف ہوتی ہے، وہیں ہر عہد کے ہر انسان کی نظر میں بھی مختلف رہتی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی گاؤں میں ایک جَٹ [2] رہتا تھا۔ اس نے باجرے کا کھیت لگایا۔ باجرا ایک قسم کا غلہ ہے۔ باجرے کا سِٹا [3] مکئی کے بھُٹّے کی مانند ہوتا ہے۔ لیکن اُس سے خاصا لمبا۔ جیسا چھلّی کے دانوں پر پردہ سا پڑا ہوتا ہے، ویسا باجرے میں نہیں ہوتا۔ باجرے کا سِٹا بگھیاڑ خاص طور پر بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ چنانچہ جَٹ نے باجرے کا کھیت لگایا تو بگھیاڑوں کی بَن آئی۔ وہ ہر روز بڑے دھڑلے سے حملہ آور ہوتے اور کھیت اُجاڑ کر نو دو گیارہ ہو جاتے۔ جَٹ بچارہ واویلا کرتا رہ جاتا۔

ایک دن جَٹ نے دل کڑا کیا اور عملی قدم اُٹھانے کی ٹھانی۔ اب کے جونہی بگھیاڑ اُس کا کھیت ویران کر کے نکلے، وہ ایک اونٹ پر سوار ہُوا اور جنگل میں ان کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ بگھیاڑ آگے آگے، جَٹ پیچھے پیچھے۔ راستے میں ایک ٹِبا (ٹیلا) آیا۔ اس میں کئی بڑے بڑے سوراخ تھے۔ یکے بعد دیگرے، سارے بگھیاڑ اُن میں جا کے چھُپ گئے۔ جَٹ اونٹ بھگاتا ہوا ٹبے کے پاس پہنچا، اونٹ سے اُترا اور ایک طرف کھڑا ہو کے سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ کافی سوچ بچار کے بعد اُسے ایک ترکیب سُوجھی۔ جَٹ نے اپنا اونٹ ایک موری کے مُنہ کے قریب بٹھا دیا اور خود ایک طرف چھپ کر تماشا دیکھنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ موری میں موجود بگھیاڑنی [4] اپنے بگھیاڑ سے کہنے لگی: "وے [5] بگھیاڑا! وے بگھیاڑا! ذرا باہر نکل کے دیکھ تو سہی، یہ ہمارے

---

[1] بگھیاڑ: بھیڑیا [2] جَٹ: (پنجابی) ا: جاٹ کا مخفف، ایک قوم یا ذات ۲۔ زمین دار ۳۔ کسان
[3] سِٹا: (مذکر) باجرہ، جوار یا مکئی کا بھُٹا [4] بگھیاڑنی / بگھیاڑی: بگھیاڑ (بھیڑیا) کی مادہ۔
[5] وے: (ندائیہ) اَے! ہے! ارے

گھر کے باہر کیا بلا بیٹھی ہوئی ہے''۔ پہلے ڈرتے ڈرتے بگھیاڑ باہر نکلا، پیچھے پیچھے بگھیاڑنی بھی چلی آئی۔ اونٹ کی ناک میں نکیل تھی۔ دونوں نکیل پکڑ کر خوش ہونے لگے۔ ابھی پورے طور سے اس کھیل سے جی نہیں بھرا تھا کہ اونٹ اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ دونوں دائیں بائیں نکیل سے یوں لٹکنے لگے جیسے بیل سے توری۔ بگھیاڑ لٹکتا رہا۔ بگھیاڑنی نیچے گر گئی۔ اُدھر سے جٹ بھی آ گیا۔ بگھیاڑنی تو بھاگ کے موری میں جا چھپی لیکن بگھیاڑ جٹ کے ہتھے چڑھ گیا۔ پہلے تو جٹ نے ایک موٹا سا ڈنڈا لے کر بگھیاڑ کی جی بھر کے ٹھکائی کی۔ پھر رسوں سے باندھ کے اپنے گھر لے آیا۔

اُسی روز جٹ کے ہاں ایک نائی آ پہنچا، سَدّا (دعوت نامہ) دینے کے لیے۔ ساتھ والے گاؤں میں جٹ کے رشتے دار رہتے تھے۔ اُن کے لڑکے کا بیاہ تھا۔ نائی اس کا سَدّا دینے آیا تھا۔ جٹ شادی پر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جانے سے پہلے بگھیاڑ کی طرف اشارہ کر کے اس نے اپنی بیوی سے کہا: ''بھلی لوک[1] میرے بعد ہر روز بلا ناغہ، صبح شام بگھیاڑ کے سات چھتر (جوتے) مارنا''۔ جٹی بولی (بہری) تھی۔ اُس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ جٹ نے کیا ہدایت کی ہے۔ اُدھر جٹ بھی جلدی میں تھا۔ اُس نے بھی خیال نہ کیا۔ اپنے اونٹ پہ بیٹھا اور یہ جا، وہ جا۔ جٹ کے جانے کے بعد جٹی بگھیاڑ سے پوچھنے لگی: ''وے بگھیاڑا! وے بگھیاڑا! جٹ تیرے بارے میں مجھ سے کیا کہہ کر گیا تھا؟'' بگھیاڑ بھی بلا کا چالاک اور مکار تھا، فوراً بولا: ''نی جٹیے[2]! نی جٹیے! جٹ تجھے یہ کہہ کر گیا کہ مجھے ہر روز، صبح شام، بلا ناغہ دیسی گھی میں چوری کوٹ کے کھانے کے لیے دینا۔'' جٹی بے چاری سادہ لوح، بگھیاڑ کی باتوں میں آ گئی۔ اب وہ صبح شام مکئی کی روٹیاں، دیسی گھی اور دیسی شکر میں کوٹ کوٹ کر بگھیاڑ کو کھلانے لگی۔ گھر میں گھی اور شکر سے بھری کئی چاٹیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جٹی نے سب کی سب خالی کر دیں۔ گھر میں آٹا گھی، شکر ختم ہو گیا تو ہمسائی سے ادھار مانگ لائی۔ غرض بگھیاڑ کے تو وارے نیارے ہو گئے۔ جٹی نے چوری کھلا کھلا کے اُس کی صحت کو قابلِ رشک بنا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بگھیاڑ خوب موٹا تازہ ہو گیا۔

ادھر جنگل کے سب بگھیاڑوں کو، جٹ کے ہاتھوں بگھیاڑ کے پکڑے جانے کا حال معلوم ہو چکا تھا۔ ایک بگھیاڑ کو جب اس کی یاد نے کچھ زیادہ ہی ستایا تو وہ اُس سے ملنے اور خیر خیریت دریافت کرنے کے لیے جٹ کے گھر چلا آیا۔ حُسنِ اتفاق سے جٹی گھر میں نہیں تھی۔ کسی

---

[1] بھلی لوک: نیک بخت، بھاگوان

[2] اری جٹی! اے جٹی!

ہمسائی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ بگھیاڑ گھر میں اکیلا تھا۔ دونوں جی بھر کے، ایک دوسرے کے گلے ملے۔ خلافِ توقع، بگھیاڑ کی صحت دیکھ کر جنگل سے ملنے کے لیے آنے والے بگھیاڑ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بڑی دیر تک حیرانی کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا۔ جب رہا نہ گیا تو مجبور ہو کر پوچھ ہی بیٹھا کہ ''ماما بگھیاڑ! تم تو قید میں پڑے ہو۔ سوچا تھا کہ بیمار اور مریل سے ہو چکے ہو گے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے۔ تم تو پہلے سے بھی کہیں بڑھ کے صحت مند اور موٹے تازے ہو چکے ہو۔ بتاؤ تو سہی، آخر راز کیا ہے؟'' بگھیاڑ مسکرا کے بولا: ''بھانجے! صحت تو بنی ہی ہے۔ صبح شام چُوری جو کھاتے ہیں''۔ یہ سُنتے ہی جنگل سے آئے بگھیاڑ کے مُنہ میں بے اختیار پانی بھر آیا، کہنے لگا: ''ماما بگھیاڑ! چند دن مجھے بھی چُوری کھانے کا موقع دو۔ دیکھو تو کتنا کمزور ہو رہا ہوں۔ میری بھی کُچھ صحت بن جائے گی۔'' بگھیاڑ بولا: ''ماما وہی جو ضرورت میں بھانجے کے کام آئے۔ لو، تم میری جگہ سنبھالو اور میں تمھاری جگہ پہ آ جاتا ہوں۔'' جنگل سے آئے ہوئے مہمان بگھیاڑ نے اُس کی رسیاں کھول دیں۔ ماما بگھیاڑ آزاد ہو گیا۔ اُس نے اپنی جگہ بھانجے بگھیاڑ کو خُوب کس کر رسیوں سے باندھ دیا اور خود وہاں سے رفُو چکر ہو گیا۔

مثل مشہور ہے: سر منڈواتے ہی اولے پڑے۔ قسمت دیکھیے، اُسی دن، ایک ہفتے بعد، جٹ بیاہ میں شرکت کر کے گھر واپس آ گیا۔ آتے ہی جٹی سے پُوچھا: ''بھلی لوک! میری عدم موجودگی میں، ہر روز صبح شام بگھیاڑ کے سات جوتے مارتی رہی ہو؟'' وہ بولی: ''ہاں ہاں، میں ہر روز صبح شام، بلا ناغہ بگھیاڑ کو چوری کھلاتی رہی ہُوں۔ دیکھو تو گھر میں موجود گھی، شکر اور آٹے سے بھری سب چاٹیاں خالی کر دی ہیں۔ آج کل تو میں ادھار پہ کام چلا رہی ہوں۔'' یہ سننے کی دیر تھی کہ جٹ آگ بگولا ہو گیا۔ اُس نے پاؤں سے جوتا اُتار لیا اور جٹی کی ٹھکائی کرنی شروع کر دی۔ جٹی بے چاری کو وہ بے بھاؤ کی پڑیں کہ توبہ ہی بھلی۔ جٹی نے چیخیں ماریں؛ آسمان سر اُٹھا لیا۔ محلے دار بھاگے بھاگے آئے اور بڑی مشکل سے جٹی کو چھُڑایا۔

جٹ غُصّے سے بھوت ہو گیا تھا۔ اب ڈنڈا اُٹھا کے بگھیاڑ کی طرف لپکا۔ بے چارہ چُوری کے خواب دیکھ رہا تھا، اُلٹی شامت آ گئی۔ جٹ بگھیاڑ پہ غُصّہ اُتارنے لگا۔ جونہی ڈنڈا پڑتا، بگھیاڑ چیخ کے کہتا: ''نہیں نہیں، میں نے چوری نہیں کھائی۔ نہیں نہیں، میں نے چُوری نہیں کھائی۔'' مرتا کیا نہ کرتا۔ جٹ سے اپنی جان چھڑانے کے لیے بگھیاڑ نے ایک چال چلی۔ کہنے لگا: ''تھوڑی دیر کے لیے مجھے پیٹنا بند کر دو۔ میری ایک تجویز سنوں۔ جی کو لگے تو مان لینا، ورنہ ہاتھ ڈنڈے سے کتنا

دور ہے۔ ڈنڈا اُٹھانا اور پھر سے میری پٹائی شروع کر دینا۔'' جٹ سفر سے تازہ تازہ لوٹا تھا۔ ابھی بیوی کی ٹھکائی سے پوری طرح فارغ نہیں ہوا تھا کہ بگھیاڑ کی پٹائی کرنے لگا۔ جٹ تھکن سے چور چور تھا۔ سانس لینے کے لیے رُک گیا اور بولا: ''اچھا ٹھیک ہے، بتاؤ تمھاری کیا تجویز ہے؟'' بگھیاڑ ہانپتا ہوا بولا: ''ایسے کرو کہ مجھے گاؤں کے میلے میں لے جاؤ۔ میں وہاں لوگوں کو ایک تماشا دکھاؤں گا۔ لوگ خوش ہو کے پیسے دیں گے اور یوں چند دنوں میں تمھارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔'' یہ سُنتے ہی جٹ کے کان کھڑے ہو گئے۔ بگھیاڑ سے پُوچھنے لگا: ''یہ تو بتاؤ کہ تم تماشا کیا کر کے دکھاؤ گے؟'' بگھیاڑ نے تیر نشانے پر بیٹھتا دیکھا، تو بولا: ''تم میری پیٹھ میں ہری مرچیں کوٹ کر بھر دینا، بس پھر تماشا دیکھنا۔'' یہ سننے کی دیر تھی، جٹ باغ باغ ہو گیا۔ وہ خیالوں میں ڈوبا، سوچ سوچ کر ہی پھولا نہ سما رہا تھا۔

چند دن بعد گاؤں میں میلہ شروع ہو گیا۔ جٹ بگھیاڑ کو میلے میں لے گیا۔ جیسا بگھیاڑ نے سمجھایا تھا، جٹ نے ویسا ہی کیا۔ ہری مرچیں کونڈے میں ڈال گھوٹنے؎ سے خُوب رگڑیں اور پھر بگھیاڑ کی پیٹھ میں اچھی طرح بھر دیں۔ بگھیاڑ سُوسُو کرنے لگا۔ مرچوں کی جلن کے باعث وہ ہر طرف میلے میں اُچھلتا، کودتا پھرتا تھا۔ اُسے دیکھنے کے لیے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ ہجوم اُس کی بے بسی اور بے کسی کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ لڑکے بالے تالیاں بجاتے تھے۔ بگھیاڑ اُچھلتا ہوا جس طرف بھی جاتا، لوگوں کی بھیڑ ہنستی، قہقہے لگاتی، پیچھے پیچھے جاتی۔ اچانک بگھیاڑ نے پاد مارا۔ مرچیں اُڑ کر لوگوں کی آنکھوں میں پڑ گئیں۔ سب سی سی کر کے آنکھیں ملنے لگے۔ میدان خالی دیکھ کے چالاک بگھیاڑ نو دو گیارہ ہو گیا اور لوگ آنکھیں ملتے رہ گئے۔

جمعہ ۲۸ راگست ۲۰۰۹ء

***

؎ گھوٹنا: (مذکر) کوئی چیز گھوٹنے (رگڑنے، پیسنے) کا آلہ

لومڑی کی چالاکی

دُنیا بھر کے لوک ادب میں لومڑی اپنی چالاکی اور مکاری کی وجہ سے بہت بدنام ہے۔ خواہ "ای سوپ کی حکایات" (Aesop's Fables) ہوں۔ خواہ "کلیلہ دمنہ"، لومڑی ہر جگہ نظر آتی ہے۔

جنگل کا راجا شیر جنگل کے کم زور جانوروں پر بہت رعب ڈالا کرتا تھا۔ بلا کا مغرور تھا۔ اکثر گیدڑوں، بندروں کو جمع کرتا؛ ان کے درمیان بڑے تکبر سے چلتا اور گردن اکڑا کے کہتا: "میں جنگل کا راجا ہوں۔ ہے کوئی میرے جیسا؟ میری مرضی، جسے چاہے چھوڑ دوں، جسے چاہے کھا لوں۔" سب جانور متاثر ہوتے؛ ہاں میں ہاں ملاتے؛ اس کی بات کو حرف بحرف مان جاتے۔ لومڑی، جو مکاری میں نہایت مشہور ہے، شیر کی اس روز روز کی اکڑفوں سے تنگ آ چکی تھی۔ ایک دن لومڑی کو غصہ چڑھ گیا۔ اس نے شیر کو سبق دینے کا فیصلہ کرلیا۔

جنگل سے کچھ فاصلے پر ایک گاؤں واقع تھا۔ ایک رات لومڑی کسی بھرائی[1] کے گھر سے، چپکے سے ڈھول اُٹھا لائی۔ صبح ہوئی، دیکھا کہ شیر اکڑ اکڑ کے قدم رکھتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ لومڑی نے ڈھول کے چمڑے میں سوراخ کیا اور اُس کے اندر چلی گئی۔ سوراخ میں سے شیر کو دیکھتی رہی۔ اب شیر جدھر جاتا، لومڑی بھی ڈھول لڑھکا کر اُس کے پیچھے پیچھے چلی جاتی۔ ڈھول نہ ہوا، کھدو[2] ہوگئی۔ زمین پر لڑھکتی ہوئی شیر کا تعاقب کر رہی ہے اور شیر گھبرا کے، ڈر کے اِدھر اُدھر بھاگ رہا ہے۔ ساتھ ہی لومڑی اونچی اور بھاری آواز میں کہہ رہی تھی: "میں بادشاہ سلامت ہوں۔ میں بادشاہ سلامت ہوں۔" شیر جی ہی جی میں کہہ رہا تھا کہ الٰہی! یہ کون سا نیا بادشاہ جنگل میں آیا ہے۔ جس طرف بھی جاتا ہوں، پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔ شیر بھاگ بھاگ کے ہنھ (تھک) گیا۔ آخر ڈھول کے سامنے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگنے لگا۔ شیر نے واسطے دیئے؛ جان بخشی کے لیے التجائیں کیں۔ دھیرے دھیرے تھوڑا بہت اِدھر اُدھر چل کے دیکھا۔ جب اندازہ ہوا کہ بادشاہ یعنی ڈھول مزید پیچھا نہیں کر رہا تو اس کی جان میں جان آئی۔ ہانپتا کانپتا جنگل میں ایک طرف کو چل دیا۔ جب نظروں سے اوجھل ہوگیا تو لومڑی چھلانگ مار کر ڈھول میں سے باہر نکل آئی۔ کئی جانور جھاڑیوں میں چھپے یا درختوں پر بیٹھے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ لومڑی سب سے

---

[1] بھرائی : ایک قوم، جو ڈھول بجاتی ہے۔

[2] کھدو : گیند، دھجیوں کا بنا ہوا گیند

ہنسی مذاق کرنے لگی کہ دیکھا آج شیر کو کیسا بے وقوف بنایا۔ جنگل کے جانور بھی لومڑی کے ہاتھوں شیر کی درگت بننے پر باغ باغ ہُوئے جاتے تھے۔

اگلی رات لومڑی کسی اور بھرائی کے گھر سے ایک ڈھول اور اُٹھالائی۔ صبح ہُوئی تو اسے جنگل کے چالاک بندروں کے حوالے کردیا۔ بندر ڈھول لے کر پیڑ پر چڑھ گئے۔ نیچے لومڑی پھر پھٹے ہُوئے چمڑے کے راستے اپنے ڈھول میں دبک کر بیٹھ گئی۔ ادھر قسمت کا ہیٹا شیر اپنے کچھار سے نکلا۔ جونہی ان کے نرغے میں آیا، لومڑی پہلے کی طرح ڈھول کولڑھکاتی ہُوئی اُس کے پیچھے لپکی۔ اُوپر سے بندر ڈگا[1] لگانے لگے، ڈھول پیٹنے لگے۔ غرض شیر جس طرف بھی جاتا تھا، ڈھول لڑھکتا ہوا پیچھے پیچھے آتا تھا۔ اُدھر درختوں پر ایک اور ڈھول خوف ناک آوازیں نکالتا ہُوا تعاقب کررہا تھا۔ یک نہ شُد دو شُد۔ شیر بے چارہ اور بھی گھبرا گیا، یہ سوچ کر کہ کل تو ایک تھا، آج دو دو بادشاہ سلامت پیچھا کررہے ہیں۔ نیچے بھی تعاقب ہو رہا ہے اور اُوپر بھی۔ شیر بوندل[2] گیا۔ کبھی بھاگتا ہوا اِس طرف جاتا تھا، کبھی اُس طرف۔ جب دوڑتے دوڑتے تھک گیا تو ایک جگہ ٹھہر گیا اور معافی مانگنے لگا کہ میں تمھارا بھائی ہُوں۔ خُدا کے لیے میری جان بخش دو۔ آخر بے چارا ہانپتا کانپتا، گرتا پڑتا ایک جانب روانہ ہوگیا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ اُدھر شیر نگاہوں سے اوجھل ہوا، اِدھر لومڑی ڈھول میں سے باہر کودی، بندروں نے درختوں پر سے چھلانگیں لگائیں۔ سب ہا ہا ہی کرنے لگے۔ لومڑی، بندر اور دوسرے جانور جو اِدھر اُدھر دبکے یہ ڈراما دیکھ رہے تھے، ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ گئے۔

اس کے بعد جنگل کے سب جانوروں نے یہ وطیرہ بنالیا کہ جب کبھی شیر اُنھیں ڈراتا دھمکاتا، اُن پر رعب بٹھانے کی کوشش کرتا اور انھیں تنگ کرتا، وہ شیر کو دھمکی دینا شروع کردیتے کہ بلائیں بادشاہ سلامت کو، اگر تم باز نہیں آتے۔ وہ ہمیں کہہ گیا ہے کہ جب شیر تم لوگوں کو ستائے تو مجھے بلالینا۔ ان کی یہ دھمکی سُن کر شیر کے پاؤں تلے کی مٹی نکل جاتی۔ وہ گھبرا کے کہتا کہ خُدا کے لیے اس بادشاہ سلامت کو نہ بلانا۔ تم جو کہو گے، میں کروں گا۔

سوموار ۱۴ر فروری ۲۰۱۱ء

---

[1] ڈگا: (۱) ڈنکا (۲) اعلان، ڈھنڈورا، تشہیر

[2] بوندلنا: حواس باختہ ہونا، بدحواس ہونا، گھبرانا

چبّڑ کی مُہم

اس لوک کہانی کا مرکزی کردار ''چبڑ/چبھڑ'' ہے۔ چبڑ خربوزے کی قسم کا ایک چھوٹا سا پھل ہے۔ ایک قسم کا ''جنگلی خربوزہ'' ہے۔ خربوزے کی طرح بیل پہ اُگتا ہے؛ لیکن جسامت میں خربوزے سے چھوٹا ہوتا ہے۔ رنگ سبز، مگر پکنے کے بعد پیلا ہو جاتا ہے۔ کچے چبڑ کی شکل خربوزے سے زیادہ تربوز سے ملتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بیجوں سے بھرا ہوتا ہے۔ تاثیر گرم ہے۔ اندازۂ جون سے ستمبر تک اگنے کا موسم ہے۔ خودرو ہے۔ دوسرے پودوں کے ساتھ کھیتوں میں آپ ہی آپ اگ آتا ہے۔ ریتلی زمین کا پودا ہے۔ دیہاتوں میں لوگ اس کا سالن بھی پکاتے ہیں اور چٹنی بھی بناتے ہیں۔ چبڑ سے مراد ''پچکا ہوا یا ٹیڑھا میڑھا'' بھی لی جاتی ہے، چنانچہ ٹیڑھے منہ والے کو ''چبڑ موہنا (موہنواں)'' کہا جاتا ہے۔

پرانے وقتوں کی بات ہے، پنجاب کے ایک گاؤں میں میاں بیوی رہتے تھے۔ اُن کی شادی کو کئی برس گزر چکے تھے مگر ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ گھر میں ویرانی برستی تھی۔ دونوں کا جی اُلٹتا تھا۔ دن رات خُدا سے دعائیں مانگا کرتے۔

ایک روز کا ذکر ہے، شوہر کھیت میں فصل کی کٹائی کر رہا تھا۔ اچانک سامنے چبڑ کی ایک بیل آ گئی۔ بیل چھوٹے بڑے چبڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ کسان نے سارے چبڑ توڑ لیے، جی ہی جی میں کہنے لگا: ''بیوی سے کہوں گا ان کی مزے دار چٹنی بنائے''۔ ساتھ ہی کسان کے مُنھ میں پانی بھر آیا۔

شام کو تھکا ماندہ گھر واپس آیا۔ آتے ہی آواز دی: ''اری نیک بخت! کہاں ہو؟'' گھر والی بھاگی بھاگی آئی۔ کسان نے چبڑ اُس کے پلّے (دامن) میں ڈالتے ہوئے کہا: ''بھاگوان! کل دوپہر جب روٹی لے کر کھیتوں میں آنا تو چبڑ کی چٹنی بنا کے ضرور لانا۔'' بیوی ''جی اچھا'' کہہ کے کچے صحن میں چارپائیاں بچھانے لگی۔

اگلے روز صبح تڑکے، فجر کی نماز پڑھ کے شوہر کھیتوں میں چلا گیا۔ بیوی گھر کے کام دھندوں میں مصروف ہو گئی۔ ہنڈیا چولھے پہ رکھ دی۔ پھر آٹا گوندھ کر روٹیاں پکانے لگی، تاکہ خاوند کے لیے دوپہر کا کھانا تیار ہو جائے اور وہ وقت پر کھیت میں پہنچا آئے۔ اسی اثنا میں چبڑوں کی چٹنی بنانے کا خیال آیا۔ دوڑی دوڑی گئی، چھکّے (چھینکے) پر سے چبڑ اُٹھا لائی۔ کونڈے میں ڈالے اور گھوٹنے ؎ سے چٹنی کوٹنے لگی۔ جلدی جلدی میں یہ پتا نہ چلا کہ ایک چبڑ اُچھل کر زمین

؎ گھوٹنا: (مذکر) کوئی چیز گھوٹنے (رگڑنے، پیسنے) کا آلہ

پر گر گیا ہے اور لڑھکتا ہوا پیڑھی کے نیچے چلا گیا ہے، غرض نمک مرچ ڈالا، مزے کی چٹنی تیار ہوگئی۔ وقت نکلا جاتا تھا۔ عورت نے ایک کٹوری میں کریلوں کا سالن، بیچ میں دیسی گھی، ایک پیالی میں گھی شکر، ایک کٹورے میں لسوڑے [1] کا اور ڈیلوں [2] کا اچار اور ایک میں چترّ کی مزے دار چٹنی، تین بڑی بڑی پیاز کی گٹھیاں اور چھ روٹیاں چھابے (چنگیر) میں رکھیں۔ اُوپر پوناں (دستر خوان کا رومال، طعام پوش) دیا۔ لسی کا گھڑا اُٹھایا، جانے ہی لگی تھی کہ بے اختیار لبوں سے آہ نکلی اور بولی: ''کاش میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میرا سہارا بنتا، اپنے باپ کو روٹی دینے کھیتوں میں خود جاتا''۔ یہ سُن کر چترّ فوراً پیڑھی کے نیچے سے نکل آیا اور بولا: ''امی! امی! آپ کیوں زحمت کرتی ہیں۔ مجھے حکم کیجیے، میں ابا کو کھانا دے آتا ہوں۔'' عورت نے بے اختیار نیچے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ خُدا کی قدرت کے واری جایئے۔ اُس کے رنگ نیارے۔ عورت کی گود بھری تھی تو کس انداز سے بھری تھی۔

کسان کی بیوی بہت خوش ہوئی اور چترّ سے کہنے لگی: ''میں تیرے صدقے، تو آج سے میرا بیٹا ہے، میرے گھر کی رونق ہے''۔ اس نے چترّ کے چھوٹے سے سر پہ روٹیوں سے بھَرا چھابا اور لسی کا گھڑا رکھ دیا۔ اُسے راستہ سمجھا دیا۔ چترّ خوشی سے اُچھلتا کودتا باپ کو کھانا دینے کے لیے کھیتوں کی طرف روانہ ہوگیا۔

چھوٹا سا چترّ سَر پہ اتنا بھاری بوجھ لیے لہکتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ راستے میں ایک کھالا آیا۔ کُچھ فاصلے پر پیپل کی گھنی چھاؤں میں رہٹ چل رہا تھا، بیل گھوم رہے تھے۔ تازہ ٹھنڈا پانی کھالے میں بہہ رہا تھا۔ کھالے میں لمبی لمبی، ہری گھاس اُگی ہوئی تھی، جو پانی کے بہنے سے لہلہا رہی تھی۔ کبھی کبھار پیپل کے سوکھے پتے بہتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ چترّ کنارے پر رُک گیا۔ اس کے لیے اتنا چوڑا کھالا پار کرنا ممکن نہیں تھا۔ کھالے کے دوسری طرف کھیتوں میں اُسے اپنا ''ابا'' ہل چلاتا ہوا نظر آیا۔ چترّ اُچھل اُچھل کر پکارنے لگا: ''ابا!، ابا!'' وہ آدمی بہت حیران ہوا کہ میرے تو کوئی اولاد ہی نہیں۔ یہ کون مجھے ''ابا'' کہہ رہا ہے۔ اُس نے بیل روک دیے، اور حیرت سے دائیں بائیں تکنے لگا۔ چترّ پھر پکارا: ''ابا! ابا! میں ادھر کھالے کے کنارے کھڑا ہوں۔ جلدی جلدی آؤ اور مجھے کھالا پار کراؤ۔'' کسان بھاگا بھاگا اس کی طرف آیا۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے

---

1. ایک نہایت چیپ دار پھل
2. بیر کی مانند ایک پھل، کریر کا پھل

لگا۔ چتیرؔ بولا: ''ابا! نیچے دیکھو، میں گھاس میں کھڑا ہوں۔ مجھے امّی نے بھیجا ہے، آپ کو کھانا دینے کے لیے''۔ کسان نے نیچے گھاس میں دیکھا۔ وہ حیرت میں گُم صُم کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ چند لمحوں بعد اُسے ہوش آیا۔ اُس نے فوراً چتیرؔ کے سر سے چنگیر اور گھڑوا اُٹھایا۔ چتیرؔ بولا: ''ابا! اب مجھے کھالا بھی پار کرا دیجیے'' کسان نے چتیرؔ کو اُٹھا کے کھالا پار کرا دیا۔ چتیرؔ خوش خوش باپ کے پیچھے پیچھے اُچھلتا ہوا کھیتوں میں چلا آیا۔

چتیرؔ کہنے لگا: ''ابا! آپ آرام سے بیٹھ کے روٹی کھائیں۔ میں آپ کی جگہ ہل جوتتا ہوں۔'' کسان بولا: ''بیٹے! اگر بیلوں نے تم پر پھوسی (گوبر) کردی، تو کیا ہوگا؟'' چتیرؔ کہنے لگا: ''ابا! آپ فکر نہ کریں۔ جب دائیں طرف والا بیل پھوسی کرنے لگے گا، میں بائیں طرف ہو جاؤں گا۔ جب بائیں طرف والا بیل پھوسی کرنے لگے گا، میں دائیں طرف ہو جاؤں گا۔'' یہ سُن کر کسان کھیت کی مینڈ پہ اُگے ٹاہلی (شیشم) کے ایک گھنے درخت تلے چلا گیا اور اُس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ اُدھر چتیرؔ ہل چلانے کے لیے کھڑا ہو گیا اور بڑے رعب سے بیل ہانکنے لگا۔ بیل چلنے لگے۔ چتیرؔ زمین جوتنے لگا۔ اتنے میں دائیں جانب والے بیل نے دُم اُوپر اُٹھائی۔ چتیرؔ سمجھا کہ شاید پھوسی کرنے لگا ہے۔ وہ فوراً بائیں طرف ہٹ گیا اور اتنے میں بائیں جانب والے بیل نے پھوسی کر دی۔ گوبر نیچے، عین چتیرؔ کے اُوپر آ کر گرا۔ وہ سر سے پاؤں تک گوبر میں ڈھک گیا۔ بے چارے نے بہت شور مچایا، گوبر میں سے نکلنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر کُچھ پیش نہ گئی۔ چتیرؔ گوبر کے نیچے چھپ چکا تھا۔

اسی دوران میں راجا شکار کھیلتا ہوا وہاں سے گزرا۔ اُس کے حکم پر سپاہیوں نے چتیرؔ کے باپ کو پکڑ لیا۔ راجا غُصّے سے چلایا: ''تمھیں جرأت کیسے ہوئی سرکاری زمین پر ناجائز قبضہ کرنے کی۔ تم نے کس کی اجازت سے یہاں ہل چلایا؟'' راجا کسان اور اُس کے دونوں بیلوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ چتیرؔ چوں کہ گوبر تلے دبا ہوا تھا اس لیے اُسے پتا ہی نہ چلا کہ اُس کے ابا کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا؟ حُسنِ اتفاق سے ایک مسافر وہاں سے گزر رہا تھا۔ اُسے کُچھ آوازیں سنائی دیں، جیسے کوئی کہہ رہا ہو: ''مجھے نکالو۔'' مسافر کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ ٹھٹھک کر رُک گیا۔ جب دوبارہ یہی آواز آئی تو وہ پکارا: ''کون؟'' جواب میں کسی نے کہا: ''میں چتیرؔ، میں گوبر کے نیچے دبا ہوں۔ خُدا کے لیے میری مدد کرو۔ مجھے یہاں سے نکالو۔'' اُس نے گوبر ایک طرف ہٹایا۔ چتیرؔ کو اندر سے نکالا۔ چتیرؔ آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے دیکھا، باپ کہیں

نظر نہ آیا تو اس نے اس آدمی کو گریبان سے پکڑ لیا اور بولا: ''بتاؤ میرا ابا کہاں ہے؟'' اُلٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ مسافر بے چارہ بھونچکا رہ گیا۔ بولا: ''کون ابا؟'' چبڑ کہنے لگا: ''وہی جو ٹاہلی کے نیچے بیٹھا روٹی کھا رہا تھا، وہ کہاں گیا؟'' مسافر نے جواب دیا: ''اُسے تو راجے کے سپاہی پکڑ کے لے گئے۔'' چبڑ نے پُوچھا: ''کیوں پکڑ کے لے گئے؟ میرے ابا نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟'' یہ سُن کر مسافر نے ٹھنڈی آہ بھری اور بولا: ''زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ شاہوں کے مزاج کا بھلا کیا پتا چلتا ہے۔ جی چاہے تو تعریف سُن کر سولی پہ لٹکا دیں۔ جی چاہے تو گالی سُن کر جاگیریں دان کر دیں۔'' چبڑ نے مسافر کا گریبان چھوڑ دیا، اُس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے ابا کو راجے کی قید سے چھڑانے تنِ تنہا روانہ ہو گیا۔

رستے میں چبڑ نے سوچا: ''اتنا لمبا سفر پیدل کیسے طے ہو گا؟'' اچانک ایک طرف اُسے ''اک [1]'' اگا ہوا دکھائی دیا۔ فوراً ایک ترکیب چبڑ کی سمجھ میں آ گئی۔ اُس نے ''اک'' کے ایک موٹے، مضبوط، ہرے پتے کی مدد سے ''گڈھ'' (ریڑھی، چھکڑا، بیل گاڑی) بنائی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ ''گڈھ'' کے آگے جوتا کسے جائے؟ سوچتے سوچتے چبڑ کو اپنے دوست ''چھونے [2]'' کا خیال آیا۔ فوراً بھاگا بھاگا اُس کے بل کی جانب گیا۔ دروازے پر دستک دی۔ چوہا باہر نکل آیا۔ چبڑ کو دیکھا تو خوش ہو کر حال چال پُوچھا اور پھر بولا: ''کہو، چبڑ یار! کیسے آنا ہوا؟'' چبڑ نے اپنی بپتا الف سے ی تک کہہ سنائی۔ چوہا بولا: ''ارے یار! بس اتنی سی بات ہے۔ لو، میں حاضر ہوں۔ مجھے اپنی ''گڈھ'' کے آگے جوت لو''۔ یہ سُن کر چبڑ کہنے لگا: ''صاحب! سوچ لو۔ کہیں وہی بات نہ ہو: چوہا بل میں سماتا نہیں، دُم سے باندھا چھاج۔'' مگر چوہے نے تسلی دی؛ بلکہ اپنے ایک اور دوست چوہے کو بھی بلا لایا۔ چبڑ نے دونوں چوہوں کو اپنی گڈھ کے آگے جوت لیا اور اللہ کا نام لے کر سفر کا آغاز کر دیا۔

انھوں نے کھیتوں اور کھلیانوں کو پار کیا۔ آگے جنگل شروع ہو رہا تھا۔ گوندنی کی چھاؤں میں ایک بلا (بلّی کا نر) اور ایک گیدڑ باتیں کر رہے تھے۔ جب چبڑ اُن کے پاس سے گزرنے لگا تو وہ پکارے: ''چبڑ یار! کہاں جا رہے ہو؟'' چبڑ کہنے لگا:

---

[1] آک، ایک درخت جس کے مختلف علاقوں میں مختلف نام لیے جاتے ہیں، جیسے آکھ، اکھڑا، اکواڑ، اکوار اور مدار۔ ''آک کا دوڈا'' آک کا پھل ہے، جس میں روئی کی مثل رواں ہوتا ہے، جسے ''آک کی بڑھیا'' کہتے ہیں۔ آک کے پتے پھوڑے پھنسیوں پر باندھے جاتے ہیں۔

[2] چھونا ''پیٹ کے کیڑے'' کو کہتے ہیں، لیکن یہاں راوی نے اس سے ''چوہا'' مراد لی ہے۔

اَک دی میں گڈھ بنائی ، دو چھونے جُتّے
باپ نُوں چھڈاون چلیا، چڑھ پوتُوں وی اُتّے

(اردو ترجمہ: میں نے آک سے چھکڑا بنایا، اُس کے آگے دو چوہے جوت دیئے۔ میں اپنے باپ کو چھڑانے کے لیے جارہا ہوں۔ تم بھی اُس کے اُوپر چڑھ جاؤ)۔

بِلّا اور گیدڑ دونوں چھلانگ لگا کر چتبڑ کی گڈھ پر بیٹھ گئے۔ سفر پھر شروع ہوا۔ اب جنگل کُچھ گھنا ہونے لگا تھا۔ اچانک شریںھ (سرس کا درخت) کے پیچھے سے ایک بگھیاڑ (بھیڑیا) نکل آیا اور بولا: ''چتبڑ یار! کہاں جارہے ہو؟'' چتبڑ کہنے لگا:

اَک دی میں گڈھ بنائی ، دو چھونے جُتّے
باپ نُوں چھڈاوَن چَلیا، چڑھ پوتُوں وی اُتّے

بگھیاڑ چھلانگ لگا کر چتبڑ کی گڈھ پر سوار ہو گیا۔ چتبڑ نے اس سے کہا: ''میرے دائیں پَٹ (ران) کے نیچے بیٹھ جاؤ''۔ سفر پھر شروع ہوا۔ اب جنگل بہت گھنا ہو چکا تھا۔ سورج کی کرنیں درختوں سے چھن چھن کر زمین تک پہنچ رہی تھیں۔ اچانک پھلاہی کے ایک درخت کے عقب میں اُگی جھاڑیوں میں سے شیر نکل آیا اور بولا: ''چتبڑ یار! کہاں جارہے ہو؟'' چتبڑ کہنے لگا:

اَک دی میں گڈھ بنائی ، دو چھونے جُتّے
باپ نُوں چھڈاوَن چَلیا، چڑھ پوتُوں وی اُتّے

شیر نے بھی چھلانگ لگائی اور چتبڑ کی گڈھ پر چڑھ گیا۔ چتبڑ نے اس سے کہا: ''میرے بائیں پَٹ کے نیچے بیٹھ جاؤ۔'' سفر پھر شروع ہوا۔ کچھ اور آگے بڑھے تو کیا دیکھا، وَن کے ایک بہت بڑے جھنڈ کو آگ لگی ہوئی ہے۔ تڑاق تڑاق کر کے پیڑوں کے ٹہنے ٹوٹ رہے ہیں۔ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کررہے ہیں۔ جب چتبڑ پاس سے گزرنے لگا تو آگ جل بھن کر، مُنہ لال کر کے بولی: ''چتبڑ یار! کہاں جارہے ہو؟'' چتبڑ کہنے لگا:

اَک دی میں گڈھ بنائی ، دو چھونے جُتّے
باپ نُوں چھڈاون چلیا، چڑھ پوتُوں وی اُتّے

آگ بھی چتبڑ کے ہم راہ چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ چتبڑ نے آگ سے کہا: ''میرے دائیں کان میں گھس جاؤ۔'' آگ پل مارتے میں چتبڑ کے دائیں کان میں سما گئی۔ اب سامنے کالے، ادھ جلے وَن کے درخت کھڑے تھے، جن سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔

چلتے رہے، چلتے رہے، یہاں تک کہ جنگل ختم ہُوا۔ اب جو آنکھ اُٹھا کے دیکھا تو سامنے دریا بہہ رہا تھا۔ دریا لیٹے لیٹے بولا: "چِنبڑ یار! کہاں جا رہے ہو؟" چِنبڑ کہنے لگا:

اُک دی میں گڈھ بنائی ، دو چھونے جُتے

باپ نُوں چھڈاون چلیا، چڑھ پوتُوں وی اُتے

دریا بھی چِنبڑ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ چِنبڑ نے دریا سے کہا: "میرے بائیں کان میں گھس جاؤ۔" دریا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، آن کی آن میں سارے کا سارا چِنبڑ کے بائیں کان میں سما گیا۔ اب دریا کی جگہ ایک لمبا، چوڑا، گہرا، بل کھاتا، ریتلا رستہ رینگ رہا تھا، جس میں پانی کی ایک بوند بھی نام کو نہ تھی۔

یہ قافلہ کچُھ ہی دور گیا ہو گا کہ راجے کے محل کے برج اور منارے دکھائی دینے لگے۔ سب اُس کی اور بڑھے۔ پائیں باغ سے گزر کر جب قصر کے بڑے دروازے پر پہنچے تو پہرے دار نے روک لیا، اور بولا: "کس سے ملنا ہے؟" چِنبڑ نے جواب دیا: "راجے سے۔" اس پر پہرے دار بولا: "کیا کام ہے؟" چِنبڑ کہنے لگا: "یہ تو ہم راجے ہی کو بتائیں گے۔" غرض پہرے دار نے راجے کو اطلاع دی۔ راجے نے چِنبڑ کو اپنے حضور میں بلا لیا۔

چِنبڑ شاہی دربار میں پہنچا۔ راجا سونے کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ دائیں بائیں دو حسین کنیزیں کھڑی پنکھا جھل رہی تھیں۔ تخت کے آگے دونوں طرف، آمنے سامنے چاندی کی کرسیوں پر راجے کے درباری براجمان تھے۔ کرسیوں کی دونوں قطاروں کے درمیان، تختِ شاہی کے روبرو سرخ قالین بچھا تھا۔ چِنبڑ گڈھ سمیت قالین پر آگے بڑھتا ہوا راجے کے سامنے پہنچا اور یوں گویا ہوا: "حضور! میرے ابا اور ان کے بیلوں کو بنا کسی جرم کے آپ کے حکم سے آپ کے سپاہی پکڑ کر لے آئے ہیں۔ وہ اس وقت شاہی قید خانے میں بیڑیاں پہنے ہوئے ہیں۔ آپ سے مہربانی دُور نہیں۔ آپ جیسے راجے کو رحم کرنا ہی سوبھا دیتا ہے۔ مہربانی کیجیے اور میرے ابا اور ان کے دونوں بیلوں کو چھوڑ دیجیے، ورنہ نتائج کے ذمہ دار آپ ہوں گے"۔ راجا بڑا گھمنڈی تھا۔ چِنبڑ کی درخواست کا اس پر الٹا اثر ہوا۔ اس نے اُس کے باپ کو چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا اور بولا: "ننھی سی جان اور یہ مزاج۔ چھوٹا منھ اور بڑی بات۔ ہمیں دھمکی دیتا ہے۔ پکڑ کے مرغیوں کے دڑبے میں پھینک دو۔ مرغیاں خود ہی چونچیں مار مار کر اسے مار ڈالیں گی"۔ سپاہیوں نے چِنبڑ کو پکڑا اور دڑبے میں دھکا دے دیا۔ چِنبڑ نے فوراً بلّے اور گیدڑ کو حکم دیا: "شاہی دڑبے میں جتنے مرغے

مرغیاں ہیں، سب کو کھا جاؤ۔" حکم ملنے کی دیر تھی، بلّے اور گیدڑ نے چٹ پٹ سب مرغے مرغیوں کا صفایا کر دیا۔ شاہی خاندان تازہ انڈوں اور مرغ کی رانوں کے لیے ترسنے لگا۔ اُدھر راجے کے کان پر جوں نہ رینگی۔ اُس نے حکم دیا: "چتنو کو پکڑ کے شاہی اصطبل میں پھینک دو۔ خود ہی گھوڑوں کے سموں کے نیچے آ کے کچلا جائے گا۔" سپاہیوں نے چتنو کو پکڑا اور اصطبل میں دھکا دے دیا۔ چتنو نے اپنے دائیں "پٹ" کے نیچے چھپے بگھیاڑ کو حکم دیا: "شاہی اصطبل میں جتنے گھوڑے ہیں، سب کو کھا جاؤ۔" حکم ملنے کی دیر تھی، بگھیاڑ نے طویلے کے سب گھوڑوں کو پھاڑ کھایا۔ گھوڑوں کا رکھوالا روتا دھوتا راجے کے پاس آیا۔ راجے نے حکم دیا: "چتنو کو پکڑ کے شاہی مویشی خانے میں پھینک دو۔ گائیں، بھینسیں خود ہی چارے کے ساتھ کھا جائیں گی۔" سپاہیوں نے چتنو کو پکڑا اور شاہی مویشی خانے میں دھکا دے دیا۔ چتنو نے اپنے بائیں "پٹ" تلے چھپے شیر کو حکم دیا: "شاہی مویشی خانے میں جتنی گائیں، بھینسیں ہیں سب کو کھا جاؤ۔" حکم ملنے کی دیر تھی، شیر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پل بھر میں سب مویشیوں کو چیر پھاڑ کے رکھ دیا۔ ڈھور ڈنگر چرانے والا روتا دھوتا آیا لیکن راجا اپنی ضد پر قائم رہا۔ راج ہٹ، بالک ہٹ، تریا ہٹ اور جوگی ہٹ شروع دن سے دنیا میں مشہور ہیں۔

مرغے، مرغیوں، گھوڑوں اور مویشیوں کے نقصان پر غصّے میں آ کر راجے نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا: "دوڑو، چتنو کو پکڑو، جانے نہ پائے۔" سپاہی چتنو کو پکڑنے کے لیے بھاگے۔ اس پر چتنو نے فوراً آگ کو حکم دیا: "اے آگ! میرے کان سے نکل اور شاہی محل کو جلا کے راکھ کا ڈھیر بنا دے۔" دیکھتے ہی دیکھتے آگ چتنو کے دائیں کان سے نکلی اور سارے قصر پر پھیل گئی۔ برج منارے، کنگرے، در، دریچے، تڑ تڑ جلنے لگے۔ رانیاں، راج کماریاں، راج کمار، داسیاں، داس سب چیختے چلاتے محل سے نکل کے دوڑے چلے جا رہے تھے۔ اب راجے کی آنکھیں کھلیں۔ طبیعت بحال ہوئی۔ راجا جو [illegible] کے پیچھے ڈنڈا لیے پھر رہا تھا، بھاگا بھاگا چتنو کے پاس گیا۔ اپنا سر اُس کے قدموں میں رکھ دیا۔ اپنے کیے کی معافی مانگی اور التجا کی کہ محل کو لگی آگ بجھا دیجیے۔ چتنو نے فوراً شرط رکھی: "پہلے میرے ابا اور ان کے بیلوں کو آزاد کیجیے۔" راجے کے حکم سے فوراً کسان کی زنجیریں کاٹ دی گئیں، بیڑیاں توڑ دی گئیں اور وہ آزاد ہو کر اپنے بیٹے چتنو سے آ ملا۔ دونوں بیل بھی واپس کر دیے گئے۔ اب چتنو نے دریا کو حکم دیا: "اے دریا! میرے کان سے نکل اور شاہی محل کی آگ بجھا دے۔" دیکھتے ہی دیکھتے دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا چتنو کے بائیں کان سے نکلا اور پورا قصر اس میں ڈوب گیا۔ چند لمحوں بعد جب پانی اُترا تو لوگوں نے دیکھا کہ محل سارے کا سارا نہیں

جلا؛ کافی کچھ بچ گیا ہے۔ سب نے خُدا کا شکر ادا کیا۔

اب چبڑ کا قافلہ ہنستا مسکراتا گھر کو لوٹا۔ سب سے پہلے لمبا، چوڑا، گہرا، بل کھاتا، خشک، ریتلا رستہ آیا؛ جسے دیکھتے ہی دریا چبڑ کے بائیں کان سے نکلا اور پہلے کی طرح وہاں جا کر لیٹ گیا۔ چبڑ نے دریا کا شکریہ ادا کیا اور یہ قافلہ آگے بڑھ گیا۔ اب وَن کا جُھنڈ آیا، جسے دیکھتے ہی آگ چبڑ کے دائیں کان سے نکلی اور درختوں کو جا لگی۔ وَن پھر پہلے کی طرح تڑتڑ جلنے لگے۔ چبڑ نے آگ کا شکریہ ادا کیا اور یہ قافلہ آگے بڑھ گیا۔ اب رستے میں گھنا جنگل تھا۔ وہ لوگ جنگل میں داخل ہو گئے۔ چلتے چلتے جب پھلاہی کا درخت آیا تو شیر چبڑ کے بائیں پٹ کے نیچے سے نکلا، اُس نے خُدا حافظ کہا اور اُس کے پیچھے جھاڑیوں میں جا چُھپا۔ چبڑ نے شیر کا شکریہ ادا کیا اور یہ قافلہ آگے بڑھ گیا۔ جب شرینہ کا درخت آیا تو بگھیاڑ چبڑ کے دائیں پٹ کے نیچے سے نکلا، خُدا حافظ کہا اور اس کی اوٹ میں چلا گیا۔ چبڑ نے بگھیاڑ کا شکریہ ادا کیا اور یہ قافلہ آگے بڑھ گیا۔ اب گوندنی کا درخت آیا، بلّے اور گیدڑ نے بھی چبڑ کو خُدا حافظ کہا اور اس کی چھاؤں میں جا کر پہلے کی طرح باتیں کرنے لگے۔ چبڑ نے اپنے دونوں دوستوں کا شکریہ ادا کیا اور یہ قافلہ آگے بڑھ گیا۔ اب چوہوں کا بل آ گیا۔ دونوں چوہیاں باہر کھڑی، بے تابی سے شوہروں کا انتظار کر رہی تھیں۔ اپنے سرتاج دیکھے تو اُن کی جان میں جان آئی۔ چوہوں کے بچے بھی دوڑے دوڑے آئے اور ''ابا! ابا!'' کہتے ہوئے اپنے باپوں سے لپٹ گئے۔ چبڑ نے اپنے دونوں یاروں کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

جب چبڑ، اس کا باپ اور دونوں بیل گھر پہنچے تو چبڑ کی امّی پریشان حال گھر کی دہلیز پہ بیٹھی تھی۔ جب اسے خاوند کی زبانی سارے واقعے کا پتا چلا تو اس نے اپنے بیٹے چبڑ کی خُوب خُوب بلائیں لیں، اس کا ماتھا چوما۔ کسان نے بھی چبڑ کی خُوب پیٹھ ٹھونکی۔ کسان اور اس کی بیوی نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنی جناب سے انھیں چبڑ جیسا بہادر اور ہونہار فرزند عطا کیا۔ اُس کے بعد تینوں مل کر ہنسی خوشی رہنے لگے۔

اتوار ۲۶۔ اکتوبر ۲۰۰۸ء

میراثی اور مولوی

یہ بہت مزے دار لوک کہانی ہے۔ اس کا مزاح امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ "میراثی" ہماری کئی لوک کہانیوں میں ہیرو کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ کردار اپنی چالاکی، ہوشیاری، شرارتوں اور اپنے مزاح کی وجہ سے عوام الناس میں نہایت مقبول اور پسندیدہ ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، پنجاب کے کسی گاؤں میں ایک مولوی رہتا تھا۔ کرنا خدا کا کیا ہوا، مولوی کا پڑوس کے گاؤں میں بیاہ ہو گیا۔ جب مولوی مکلاوہ لینے جا رہا تھا، تو راستے میں اس کی ملاقات ایک میراثی سے ہوئی۔ مولوی نے دل میں سوچا: "اکیلے جانے کے بجائے، اپنے ساتھ میراثی کو لے جاتا ہوں۔ راستے میں باتیں کرتے ہوئے جائیں گے تو سفر کٹنے کا پتا بھی نہیں چلے گا اور یوں بھی ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔" چنانچہ مولوی میراثی سے کہنے لگا کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ میراثی تو پہلے ہی دل میں امید لگائے بیٹھا تھا، فوراً مولوی کے ہم راہ جانے پر تیار ہو گیا۔

دونوں سفر کرتے رہے۔ میراثی بہت چالاک تھا۔ جب مولوی کا سسرال قریب آیا، دُور سے، کھیتوں کے پار مولوی کی بیوی کا گاؤں نظر آنے لگا تو میراثی مولوی سے کہنے لگا: "دوست! پیٹ کا کھایا کوئی نہیں دیکھتا، تن کا پہنا سب دیکھتے ہیں۔ ایک حُسن آدمی ہزار حُسن کپڑا۔ انسان کی عزت کپڑوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ بندہ اپنے لباس سے پہچانا جاتا ہے۔ تم تو خیر سے اُن کے جوائی (داماد) ٹھہرے، کیسے بھی کپڑے پہن لو، کچھ فرق نہیں پڑے گا لیکن مجھے ان کپڑوں میں دیکھیں گے، تو میرا تو کچھ نہیں بگڑے گا، ہاں تمھاری ناک ضرور کٹ جائے گی۔ تمھارے سسرال والے کیا کہیں گے کہ مولوی کا دوست اور ان حالوں میں۔ سو اگر اپنی عزت بچانا چاہتے ہو، تو میرے کپڑے تم پہن لو اور اپنی پوشاک مجھے پہنا دو۔ باقی جو تمھاری صلاح۔ اپنا تو کام تھا آگاہ کرنا۔" مولوی میراثی کی باتوں میں آ گیا۔ چنانچہ وہیں شیشم کے درختوں کی چھاؤں تلے، کھڑی فصلوں کی اوٹ میں، انھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ لباس تبدیل کیے۔ میراثی کے سادہ اور غریبانہ کپڑے مولوی نے پہن لیے اور مولوی کی عمدہ اور قیمتی پوشاک میراثی نے زیبِ تن کر لی۔

دونوں چلتے چلتے گاؤں میں داخل ہوئے۔ جب مولوی کی بیوی کے گھر پہنچے تو مولوی کی ساس، سسر، سالے، سالیاں سب جوائی کو خوش آمدید کہنے کے لیے بھاگے بھاگے دروازے پر آئے۔ دہلیز کے دونوں کناروں پر سرسوں کا تیل گرایا گیا۔ میراثی نے بڑی شان اور بڑے رعب

سے قدم اندر رکھا۔ پیچھے پیچھے حیرت میں ڈوبا ہوا مولوی بھی داخل ہوا۔ گھر والوں نے میراثی کو تو ہاتھوں ہاتھ لیا، لیکن بے چارے مولوی کی کسی نے جھوٹوں مُنھ بات نہ پوچھی۔ پس پردہ اصل معاملہ یہ تھا کہ سسرالیوں نے میراثی کے اچھے کپڑوں کی وجہ سے دھوکا کھایا۔ وہ میراثی کو اپنا جوائی مولوی سمجھے اور مولوی کو اپنے جوائی کا نوکر۔ دوسری طرف چالاک میراثی نے ان کی غلط فہمی کو دور کرنے کے بجائے اس سے خُوب خُوب فائدہ اُٹھایا۔ خُوب اکڑ کے، ٹانگیں پھیلا کے، تکیے کے سہارے چارپائی پر بیٹھا۔ حُقے کے کش لگائے۔ مزے مزے کے کھانے کھائے۔ غرض مولوی کی ساس، بیوی اور سالیوں سے اپنی خُوب خدمتیں کروائیں۔ میراثی کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور چھٹا سر کڑھائی میں تھا۔ مولوی یہ سب کُچھ دیکھتا تھا اور دل ہی دل میں کُڑھتا تھا۔

ستم بالائے ستم، گھر والوں نے مولوی کو، اپنے جوائی کا نوکر گردانتے ہوئے، اپنی بکریاں چرانے کے لیے گاؤں سے باہر کھیتوں میں بھیج دیا۔ پہلی ذلتیں تو مولوی نے جیسے تیسے سہہ لی تھیں لیکن یہ بے عزتی ایسی نہیں تھی، جسے آسانی سے برداشت کیا جا سکتا۔ مولوی بھی علم پڑھا ہوا تھا۔ جادو ٹونے سے واقف تھا۔ بے چارہ کہاں چرواہے کے کتے کی طرح بکریوں کے آگے پیچھے دوڑتا۔ سو وہ کیکر کے ایک گھنے پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ گیا اور بولا: "جُڑ تو"۔ بس اتنا کہنے کی دیر تھی، سب بکریاں آپس میں جُڑ گئیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ چپکی ہوئی، ہری گھاس کھاتی چلی جا رہی تھیں۔ مولوی ریوڑ کو اکٹھا رکھنے کی زحمت سے بچا، کیکر تلے بیٹھا، سارا وقت آنکھیں بند کیے مزے سے مُرلی بجاتا رہا۔ جب شام ہوئی، ریوڑ کو واپس گھر لے جانے کا موقع آیا، تو مولوی نے مُرلی ایک طرف رکھی اور بولا: "کھل تو"۔ بس اتنا کہنے کی دیر تھی، بکریاں کھل گئیں، ایک دوسرے سے جُدا ہو گئیں اور مولوی انھیں ہانکتا ہوا گھر لے آیا۔

جونہی مولوی نے گھر میں قدم رکھا، کیا دیکھتا ہے، میراثی مزے سے چارپائی پہ بیٹھا ہے اور سب سے خدمتیں کروا رہا ہے۔ میراثی نے مولوی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ اہلِ خانہ سے ٹہل سیوا کروانے اور ٹھٹھا مذاق کرنے میں مصروف رہا۔ مولوی کو یوں محسوس ہوا جیسے میراثی اس سے کہہ رہا ہو: "تو کس باغ کا بتھوا ہے۔" جب تک معاملہ مولوی کی ساس اور سالیوں کا تھا، بے چارہ کسی نہ کسی طرح دل پر جبر کرتا رہا لیکن جب مولوی کی بیوی سُرخ لباس پہنے، بڑا سا گھونگٹ نکالے، چھوئی موئی بنی، شرماتی لجاتی، ہاتھوں میں سویوں کی پلیٹ پکڑے، میراثی کو اپنا شوہر سمجھتے ہوئے، اُس کی طرف بڑھی؛ تو یہ منظر مولوی کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اب اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ معاملہ واقعی

بہت آگے بڑھ گیا تھا، اب اس کا سدِ باب ضروری تھا۔ یہ مُنہ اور مسور کی دال، میراثی کو خوابوں کی دنیا سے نکال کے حقیقت کی دنیا میں لانا، اسے اس کی اوقات یاد دلانا لازم ٹھہر گیا تھا۔ چنانچہ جونہی مولوی کی دلھن سویوں سے بھری تھالی میراثی کو پکڑانے لگی اور میراثی، شرمندہ شرمندہ سا، لال سُرخ چہرہ، ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ، آنکھیں جھکائے، ہاتھ بڑھائے پکڑنے لگا، عین اس موقع پر مولوی نے آہستہ سے زیرِ لب وہی منتر پھونکا: "جُڑ تُو"۔ بس اتنا کہنے کی دیر تھی، دونوں کے ہاتھ پلیٹ سے جڑ گئے۔ ایک طرف مولوی کی بیوی چارپائی کے پاس کھڑی زور لگا رہی ہے۔ دوسری طرف میراثی چارپائی پہ بیٹھا زور آزمائی کر رہا ہے مگر ہاتھ تھے کہ ٹس سے مس نہ ہوتے تھے، جیسے گوند سے چپک گئے ہوں۔ اُدھر مولوی کی بیوی پریشان، اِدھر میراثی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ مولوی کی ساس، کچھ دور ایک پیڑھی پہ بیٹھی یہ سب منظر دیکھ رہی تھی، وہیں سے پکاری: "نی! خیر تے ہے؟ کیویں کھڑی ایں؟" (اردو ترجمہ: اری! خیر تو ہے؟ کس لیے کھڑی ہو؟) بیٹی ڈری ڈری، سہمی ہوئی چیخی:

"نی مائیں! تھالی نے میرے ہتھ پھڑ لیے نیں۔ تھالی مینوں چھڈے گی تے تراں گی۔" (اردو ترجمہ: اے ماں! پلیٹ نے میرے ہاتھ پکڑ لیے ہیں، پلیٹ مجھے چھوڑے گی تو چلوں گی) یہ سُن کر مولوی کی ساس اپنی جگہ سے اُٹھی اور دوڑی آئی۔ اُدھر اس نے اپنی بیٹی کو چھڑانے کے لیے پلیٹ کو پکڑ کے کھینچنا چاہا، ادھر مولوی نے پھر زیرلب کہا: "جُڑ تُو"۔ لیجیے صاحب! مولوی کی ساس کے ہاتھ بھی تھالی سے چپک کے رہ گئے۔ اب تینوں خود کو آزاد کروانے کے لیے زور لگا رہے ہیں اور چیخیں مار رہے ہیں۔ مگر تھالی ہے کہ چھوڑنے کا نام نہیں لے رہی۔ اپنی بیوی، بیٹی اور داماد کی پکاریں سُن کے مولوی کا سسر بھاگا بھاگا آیا۔ جیسے ہی اُس کے ہاتھوں نے پلیٹ کو چھوا، مولوی نے پھر مُنہ ہی مُنہ میں کہا: "جُڑ تُو"۔ مولوی کے سسر کے ہاتھ بھی پلیٹ سے جڑ گئے۔ کافی دیر تک وہ چاروں پلیٹ سے دنگل لڑتے رہے، چیخیں مارتے رہے، خود کو چھڑانے کے لیے زور آزمائی کرتے رہے۔ مولوی کی سالیاں ڈری، سہمی دُور کھڑی یہ سارا منظر دیکھتی رہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی قریب آنے اور پلیٹ کو چھونے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ مولوی انھیں تنگ کر کے خُوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے میراثی سے خُوب بدلہ لیا تھا۔ آخر جب کچھ پیش نہ گئی تو میراثی، مولوی کی بیوی، ساس اور سسر، چاروں رونے لگے۔ مولوی سے یہ نظارہ دیکھا نہ گیا۔ اس کا دل بھر آیا اور اس نے آہستہ سے کہا: "کھل تُو" پھر کیا تھا، سب کے ہاتھ کھل گئے۔ پلیٹ نے سب کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ مولوی کی بیوی نے سویوں سے بھری تھالی وہیں پھینکی اور بھاگ کر کمرے میں جا

تھی۔ باقی تینوں بھی حیران پریشان بڑی دیر تک انگلیوں کو موڑ موڑ کر دیکھتے رہے کہ سب ٹھیک ہے یا نہیں؟ انھیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر یہ اُن کے ساتھ ہوا کیا تھا؟

اتنے میں رات پڑ گئی۔ جیٹھ ہاڑ کے دن تھے۔ صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے چارپائیاں بچھا دی گئیں۔ مولوی اور میراثی سونے کے لیے لیٹے۔ دن بھر میراثی کی خُوب خدمت ہوئی تھی۔ اس نے اپنی گنجائش سے کہیں بڑھ کے کھانے کھائے تھے۔ اگرچہ دل نے کہا بھی تھا کہ: ''کھانا پرایا ہے، پیٹ تو پرایا نہیں،'' لیکن ایسے موقعوں پر دل کی کون کافر سنتا ہے۔ اس لیے جب آدھی رات ہوئی، میراثی کو شدید حاجت ہوئی۔ بے چارہ اُٹھ بیٹھا۔ مولوی کے سسر، ساس، بیوی، سالے، سالیاں سب اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے خراٹے لے رہے تھے۔ خوش قسمتی سے بغل میں مولوی کی چارپائی بچھی تھی۔ میراثی نے جھنجھوڑ کے اسے جگایا۔ مولوی ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھا۔ میراثی اس کی مِنت سماجت کرتے ہوئے کہنے لگا: ''مولوی! اس وقت مجھے سخت حاجت ہوئی ہے، خُدا کے لیے میرے ساتھ باہر کھیتوں میں چلو۔'' تب گھروں میں بیت الخلا بنانے کا رواج نہیں تھا۔ سب مرد عورتیں، بوڑھے بچے رفع حاجت کے لیے باہر کھیتوں میں جاتے تھے۔ مولوی میراثی کے ہم راہ جانے پر رضامند ہو گیا۔ دونوں چُپ چپاتے، رات کے اندھیرے میں گھر سے نکلے۔ گاؤں سے کافی باہر کھیتوں میں آ گئے۔ مولوی تاروں بھرے آسمان کے نیچے، کُچھ دُور کھڑا ہو گیا اور میراثی بیٹھ کے رفع حاجت کرنے لگا۔ جب فراغت ہوئی تو صفائی کا مسئلہ درپیش ہوا۔ قریب ہی کسی کسان نے ٹاہلی (شیشم) کا پیڑ کاٹ کے پھینکا ہوا تھا۔ اس کا تنا، جو خُوب لمبا اور کافی چوڑا تھا، زمین پر پڑا تھا۔ مولوی اس کی طرف اشارہ کر کے میراثی سے کہنے لگا: ''ارے یار! اس تنے پر بیٹھ جاؤ۔ اس سے اچھی طرح پیٹھ گھساؤ، سب صاف ہو جائے گا۔'' میراثی نے ایسا ہی کیا۔ تنے کے سرے پر بیٹھ کر اپنی پیٹھ گھسانے لگا۔ مولوی میراثی سے اس قدر تنگ آیا ہوا تھا کہ پہلے والے انتقام سے اس کی پوری طرح تسلی نہیں ہوئی تھی۔ یہ میراثی سے بدلہ لینے کا ایک اور نادر موقع تھا۔ اس نے آہستہ سے مُنھ ہی مُنھ میں کہا: ''جُڑ تو''۔ تنا میراثی کی پیٹھ سے جڑ گیا۔ اب جونہی وہ اُٹھنے لگا، پیڑ کا تنا بھی اُس کے ساتھ ہی اُوپر اُٹھا۔ اس نئی مصیبت سے میراثی بھونچکا رہ گیا۔ اس نے تنے کو اپنی پیٹھ سے علیحدہ کرنے کی بہتیری کوشش کی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ میراثی جس طرف بھی جاتا، ٹاہلی کا بھاری بھرکم تنا اُس کے پیچھے پیچھے جاتا۔ بے چارہ گاؤں میں پہنچا تو اور آفت آئی۔ جس گلی سے بھی گزرتا، تنا کبھی دائیں، کبھی بائیں گھروں کی دیواروں اور دروازوں سے

ٹکراتا۔ سارا گاؤں اس آفتِ ناگہانی سے جاگ گیا۔ جس گھر کے دروازے سے بھی تنا ٹکراتا، آواز پیدا ہوتی، گھر والے آنکھیں ملتے ہوئے، بھاگے بھاگے باہر نکلتے کہ خُدا خیر کرے، آدھی رات کو کیا بلا نازل ہوگئی۔ گلی میں یہ عجب نظارہ دیکھ کر اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں کہ ایک شخص کی پیٹھ میں ٹاہلی کا بھاری بھرکم تنا دھنسا ہوا ہے۔ وہ جس طرف بھی جاتا ہے، تنا اُس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ کچھ دیر تو لوگ حیران ہو ہو کر، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے، پھر یک لخت وہ ہا ہا ہی ہی کرنے لگتے۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ بعضے تو ہنستے ہنستے لوٹ جاتے۔

ادھر مولوی دل ہی دل میں خُوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میراثی نے تو جو کیا سو کیا مگر مولوی نے بھی اس سے خُوب انتقام لیا۔ سارے گاؤں کے سامنے اس کی خُوب فضیحت ہو رہی تھی۔ بڑی بوڑھیاں دل کھول کے قہقہے لگا رہی تھیں۔ جوان عورتیں چادروں میں لپٹی، گھروں کی چھتوں پہ کھڑی، ہونٹوں میں دوپٹوں کے کنارے دبائے ہنس رہی تھیں۔ گلیوں میں مرد اور بچے قہقہے لگاتے، تالیاں بجاتے، آوازے کستے میراثی کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ہولے ہولے چلتا یہ ہجوم، میراثی کے ساتھ ساتھ مولوی کے سسرال کے سامنے آپہنچا۔ باہر شور سُن کر سب سسرالیے ہڑبڑا کے اُٹھے اور دروازے کی طرف بھاگے۔ وہاں عجب منظر تھا۔ اپنے جوائی کی یہ حالت دیکھ کر بے چارے پانی پانی ہوگئے۔ سارے گاؤں کے سامنے ان کی تو جیسے ناک ہی کٹ گئی۔ مولوی کی بیوی تو کسی کا سامنا کرنے کے قابل نہ رہی۔ بچاری کمرے میں بند ہو کر رہ گئی۔ میراثی کی آنکھیں کھولنے کے لیے یہ سزا کچھ زیادہ ہی تھی۔ اب اس نے روتے ہوئے سب کے سامنے اس راز سے پردہ اُٹھایا کہ میں تو میراثی ہوں۔ تمھارا اصلی جوائی یہ مولوی ہے۔ پھر اس نے گڑگڑا کے مولوی سے اپنے کیے کی معافی مانگی۔ اس پر مولوی کا دل بھی بھر آیا۔ اس نے اسے معاف کردیا اور ہولے سے کہا: "کھل تُو"۔ بس اتنا کہنے کی دیر تھی، درخت کا تنا میراثی کی پیٹھ سے جُدا ہوگیا۔ یوں کہیں جا کے میراثی کی جان کی خلاصی ہوئی۔ اس نے سکھ کا سانس لیا۔ جان بچی، لاکھوں پائے۔

اب حقیقت کھُل چکی تھی۔ مولوی کے سسرالیوں نے مولوی کو سر آنکھوں پر بٹھا لیا۔ ساس سالیاں اُس کے ناز نخرے اُٹھانے میں لگ گئیں۔ سسر اور سالے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ بیوی گھونگٹ اوڑھے، دروازے کے پیچھے سے چوری چوری اسے دیکھ رہی تھی۔ مولوی چارپائی پہ کسی ساہوکار کی طرح بیٹھا مسکرا مسکرا کے میراثی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میراثی کو کوئی جھوٹوں مُنھ نہ پوچھ رہا تھا۔ اب میراثی کے ساتھ وہی سلوک ہو رہا تھا، جیسا اس سے پہلے مولوی کے ساتھ ہوا تھا۔ جیسی

کرنی، ویسی بھرنی۔ لیکن وہ بھی میراثی تھا۔ شرارت اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر تک تو دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتا رہا۔ پھر مولوی سے بدلہ لینے کا مصمّم ارادہ کر کے پُرسکون ہو گیا۔

چوں کہ رواج ہے کہ جب داماد مکلاوہ لینے کے لیے آتا ہے تو عام طور پر ایک رات اپنے سسرال میں ضرور گزارتا ہے۔ مولوی ایک رات گزار چکا تھا، مگر وہ رات اس نے اپنے سسرال میں داماد کی حیثیت سے نہیں بلکہ نوکر بن کر بِتائی تھی۔ اسی لیے اُس کے سسرال والوں نے اسے روک لیا کہ ایک شب ہمارے ہاں اور بسر کرو تا کہ ہم اپنے جوائی کی خدمت کا حق ادا کر سکیں، جی بھر کے دل کی حسرتیں نکال سکیں۔ غرض سارا دن مولوی کی آؤ بھگت ہوتی رہی۔ اس نے ایسے ایسے رنگ برنگے، قسم قسم کے کھانے کھائے اور اتنی مقدار میں کھائے کہ زندگی میں پہلے کبھی نہیں کھائے تھے۔ جب آدھی رات ہوئی، مولوی کی آنکھ کھل گئی۔ اسے شدید پیاس لگی ہوئی تھی۔ پہلو میں ایک چارپائی پر میراثی گھوڑے بیچ کے سو رہا تھا۔ مولوی نے جھنجھوڑ کر میراثی کو جگایا۔ میراثی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ مولوی نے اسے پانی لانے کے لیے کہا۔ کچھ دُور صحن میں کنوئیں کے ٹھنڈے میٹھے پانی سے بھرا مٹی کا گھڑا رکھا تھا۔ پاس ہی پانی پینے کے لیے مٹی کا پیالہ بھی پڑا تھا۔ میراثی مولوی کے لیے پانی لینے آیا۔ یہ مولوی سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کا سنہری موقع تھا۔ میراثی کے شرارتی ذہن نے اسی لمحے ایک سازش کا تانا بانا بننا شروع کر دیا۔ اس نے مٹکا انڈیلا، پانی سے پیالہ بھرا۔ قریب ہی صابن کی ایک ٹکیا پڑی ہوئی تھی۔ اس نے صابن اچھی طرح پانی میں گھول دیا اور یہی صابن گھلا پانی لے جا کے مولوی کو پلا دیا۔ اس طرح یکے بعد دیگرے اس نے صابن گھول گھول کے پانی کے کئی پیالے مولوی کو جا پلائے۔ اندھیرے کے باعث مولوی کو پتا ہی نہ چلا کہ وہ جو پانی پی رہا ہے، اس میں کیا ملا ہوا ہے۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد اُس کے پیٹ میں گڑبڑ ہونے لگی، مروڑے اُٹھنے لگے۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ بھاگ کر، گاؤں سے باہر، کھیتوں میں جا کے رفع حاجت کی جاتی۔ مولوی نے میراثی کو مدد کے لیے پکارا۔ وہ پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ جلدی سے ڈگ بھرتا ہوا پانی کے مٹکے کی طرف گیا، گھڑا انڈیل کے سارا پانی زمین پر بہا دیا۔ خالی گھڑا اُٹھا کے مولوی کے پاس لے آیا اور کہنے لگا: ''مولوی! اس وقت تو یہی ایک ترکیب ہو سکتی ہے کہ تم یہ خالی مٹکا زمین پہ رکھو اور اُس کے مُنہ پر بیٹھ جاؤ اور رفع حاجت کرتے جاؤ۔'' مرتا کیا نہ کرتا۔ اب سوچنے کا وقت کس کافر کے پاس تھا۔ مولوی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ سے گھڑے پر سوار ہو گیا۔ پیٹ چھوٹ رہا تھا۔ دست پر دست آ رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں گھڑا بھر گیا۔ مولوی فارغ ہو چکا تھا۔ وہ میراثی سے پُوچھنے لگا کہ اس مٹکے کا کیا کروں۔ اب میراثی

کے ذہن میں تیار ہونے والی سازش کے اگلے مرحلے کو عملی جامہ پہنانے کا وقت تھا۔ میراثی نے فوراً جواب دیا: ''کرنا کیا ہے، اسے اُٹھاؤ، گھر سے نکلو اور گاؤں سے باہر کہیں دُور پھینک آؤ۔ رات ماں کا پیٹ ہے کسی کو کیا پتا چلے گا۔ ہاں اگر یہ مٹکا یہاں پڑا رہا تو پو پھٹتے ہی سب کو خبر ہو جائے گی۔ نئی نویلی دلھن کے آگے تمھاری بہت فضیحت ہوگی۔'' مولوی تو یہ سوچ کر ہی کانپ اُٹھا۔ اس نے اسی وقت میراثی کی ہدایت کے مطابق گھڑا اُٹھا کے سر پر رکھا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ اب سازش کے آخری حصے پر عمل درآمد کا وقت تھا۔ میراثی نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر سب گھر والوں کو جگایا اور پکار پکار کے کہنے لگا: ''اللہ کے بندو! تم یہاں مزے سے پڑے سو رہے ہو اور اُدھر تمھارا جوائی آدھی رات کو چپکے چپکے تمھاری بیٹی کو چھوڑ کے جانے کس طرف چلا جا رہا ہے؟'' یہ سننے کی دیر تھی، سب گھر والے چارپائیوں سے چھلانگیں مار کے کودے اور اپنے جوائی کو آوازیں دیتے ہوئے اُس کے پیچھے بھاگے۔ مولوی نے جب انھیں آتے دیکھا تو پریشانی میں اپنی رفتار تیز کر دی۔ اِدھر سسرالیے بھی دوڑنے لگے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ مولوی آگے آگے بھاگ رہا تھا اور سسرالیے پیچھے پیچھے۔ چونکہ مولوی نے سر پر بھاری مٹکا اُٹھا رکھا تھا، اس لیے اس کی رفتار ان کی نسبت کم تھی۔ چناں چہ جلد ہی انھوں نے اسے جا لیا۔ جیسے ہی انھوں نے اُسے پکڑ کے کھینچا، گھڑا مولوی کے سر سے نیچے آ رہا، زمین پر گرا، ایک دھماکہ ہوا، چھینٹیں اُڑیں اور سب لوگوں کے کپڑے غلاظت سے بھر گئے۔

خُدا خُدا کر کے صبح ہوئی۔ مولوی کے سسرال والوں نے داماد اور بیٹی کو رخصت کیا لیکن اس وقت بھی ان سب پر حیرت طاری تھی۔ انھیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ گزشتہ رات والا واقعہ کیا تھا؟ وہ جتنا غور کرتے تھے، اتنا ہی اُلجھ کے رہ جاتے تھے۔ مگر مولوی کی سمجھ میں سب آ رہا تھا۔ چناں چہ جیسے ہی وہ تینوں: مولوی، مولوی کی بیوی اور میراثی گاؤں سے باہر نکلے، مولوی نے ہاتھ جوڑ کے میراثی سے معافی مانگی اور کہا: ''خُدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ تم اپنی راہ لو اور میں اپنی۔ مجھ سے سخت غلطی ہو گئی جو تمھیں اپنے ساتھ لے آیا۔ میرے باپ دادا کی توبہ اگر زندگی میں پھر ایسا کروں۔ میں تو سارے دُولھوں کو وصیت کر کے مروں گا کہ مکلاوہ لینے اکیلے ہی آنا، کبھی کسی کو ساتھ نہ لانا۔ خاص طور پر کسی میراثی کو تو ہرگز نہیں۔'' اتنا کہہ کر مولوی اپنی نئی نویلی دلھن کو لیے اپنے رستے پہ روانہ ہو گیا اور میراثی ہنستا مسکراتا اپنی راہ چل پڑا۔

اتوار، ۳۰ راگست ۲۰۰۹ء

میراثی اور دیو

یہ ”میراثی سیریز (Series)“ کی دوسری کہانی ہے۔ بے حد دلچسپ اور مزے دار۔ اس دردبھری زندگی میں ایسی پیاری کہانیاں ایک نعمت سے کم نہیں۔ آہوں کی اس دُنیا سے نکال کر یہ لوک کہانیاں ہمیں ایک ایسے جہان میں لے جاتی ہیں، جہاں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہیں، قہقہے ہی قہقہے۔ ہماری اور آپ کی اس دنیا میں موت کی حکمرانی ہے مگر ان لوک کہانیوں کے دیس میں موت کا کوئی وجود نہیں۔ یہاں فقط زندگی ہی زندگی ہے۔ ہر طرف چھائی ہوئی زندگی؛ حسین، پیاری، بےفکر، گاتی، گنگناتی زندگی جس کا انجام یقیناً موت نہیں ہے۔

پرانے وقتوں کی بات ہے، کسی گاؤں میں دو دوست رہتے تھے۔ ایک نائی تھا اور ایک میراثی۔ دونوں دوست کمائی کرنے کے لیے اپنے گاؤں سے نکلے۔ چلے جا رہے ہیں، راستے میں چنوں کا کھیت نظر آیا۔ میراثی بُوٹ توڑنے لگا۔ خود بھی کھانے لگا، اپنے دوست نائی کو بھی کھلانے لگا۔ ہرے ہرے چنے بہت مزے دار تھے۔ مثل مشہور ہے: چنا اور چغل مُنھ لگا بُرا۔ دونوں نے خُوب چھولیا[1] کھایا۔ پھر آگے روانہ ہوئے۔

چلے جا رہے ہیں، چلے جا رہے ہیں۔ چلتے چلتے رستے میں ایک جگہ ڈھول پڑا نظر آیا۔ ڈھولکیا کہیں پاس ہی، کسی کھیت میں بیٹھا رفع حاجت کر رہا تھا۔ میراثی نائی سے کہنے لگا: ”کیوں نہ ہم ڈھول اُٹھالیں؟“ نائی ڈرپوک تھا۔ کہنے لگا: ”ناں، ناں، بھرائی[2] ہمیں پکڑ لے گا۔“ یہ سُن کر میراثی بولا: ”کڈ میرا چھولیاں دا دانہ“ (اردو ترجمہ: نکال میرا چنے کا دانہ)۔ چنے کا دانہ تو پیٹ کی آگ بجھانے میں صرف ہو چکا تھا۔ بے چارہ نائی اسے کہاں سے واپس کرتا۔ سو اس دھمکی پر وہ میراثی کا ساتھ دینے پہ رضامند ہو گیا۔ میراثی نے چپکے سے ڈھول اُٹھایا اور دونوں آگے روانہ ہوئے۔

چلے جا رہے ہیں، چلے جا رہے ہیں، چلتے چلتے رستے میں ایک کنواں نظر آیا۔ کنوئیں کی منڈیر پر ایک بوکا[3] پڑا ہوا تھا۔ میراثی نائی سے کہنے لگا: ”کیوں نہ ہم بوکا اُٹھالیں؟“ کمزوردل کا مالک نائی پھر منع کرتے ہوئے بولا: ”ناں، ناں کنوئیں کا مالک ہمیں پکڑ لے گا۔“ یہ سُن کر میراثی نے پھر اسے دھمکی دی: ”کڈ میرا چھولیاں دا دانہ“۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بے چارہ نائی پھر ساتھ دینے پر آمادہ ہو گیا۔ میراثی نے بوکا اُٹھایا اور دونوں آگے روانہ ہوئے۔

---

[1] چھولیا: (مذکر) سبز چنا، کچے چنوں کے خوشے

[2] بھرائی: ایک قوم، جو ڈھول بجاتی ہے۔

[3] بوکا: (مذکر) چمڑے یا بڑ کا ڈول، چرسا

چلے جا رہے ہیں، چلے جا رہے ہیں، چلتے چلتے رستے میں ایک جگہ نائی کی گُتھی [1] پڑی نظر آئی۔ نائی کہیں پاس ہی، کسی کھیت میں بیٹھا رفع حاجت کر رہا تھا۔ میراثی اپنے دوست نائی سے کہنے لگا: "کیوں نہ ہم گُتھی اُٹھالیں؟" ڈرپوک نائی نے پھر یہ کہہ کر منع کیا: "ناں، ناں، نائی ہمیں پکڑ لے گا۔" یہ سُن کر میراثی نے پھر دھمکایا: "کڈ میرا چھولیاں دا دانہ۔" نائی بے چارہ پھر چُپ ہو گیا۔ میراثی نے چُپکے سے گُتھی اُٹھائی اور دونوں آگے روانہ ہوئے۔

چلے جا رہے ہیں، چلے جا رہے ہیں، چلتے چلتے رستے میں ایک جگہ بُوھیا کا گھر نظر آیا۔ میراثی اور نائی کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ دونوں گھر میں داخل ہوئے اور بڑی بی سے پانی پلانے کے لیے کہا۔ وہ اس وقت کسی کام میں مصروف تھی۔ اس نے برآمدے میں ایک طرف رکھے پانی کے مٹکے اور مٹی کے پیالے کی طرف اشارہ کر دیا کہ بیٹا جاؤ اور جا کر خود پی لو۔ میراثی اور نائی گھڑے کی طرف بڑھے۔ وہیں پاس ہی بڑھیا نے مٹی کی ایک بھڑولی [2] انڈوں سے بھر کے رکھی ہوئی تھی۔ انڈے سینے کے لیے اس پر مُرغی بٹھا رکھی تھی۔ بچے نکلنے کا انتظار تھا۔ جب میراثی اور نائی بھڑولی کے قریب سے گزرے تو میراثی نائی سے کہنے لگا: "کیوں نہ ہم بھڑولی اُٹھالیں؟" بزدل نائی نے حسبِ سابق منع کرتے ہوئے کہا: "ناں، ناں، بڑھیا ہمیں پکڑ لے گی۔" یہ سُن کر میراثی نے وہی بات کہی: "کڈ میرا چھولیاں دا دانہ۔" یہ سُنتے ہی نائی کی پھر ہوا نکل گئی۔ پانی پینے کے بعد میراثی نے انڈوں اور مُرغی سمیت بھڑولی اُٹھا کے سر پر رکھی اور چل پڑا۔ ایک تو بڑھیا بے چاری کو ویسے ہی کم نظر آتا تھا، دوسرے اپنے کام میں اس قدر جتی ہوئی تھی کہ اسے پتا ہی نہ چلا، اُس کے ساتھ کیا چھل ہو گیا۔

چلے جا رہے ہیں، چلے جا رہے ہیں، چلتے چلتے رستے میں میراثی اور نائی کی ملاقات ایک دیو سے ہوئی۔

میراثی: تُو کون ہے؟

دیو: میں دیو ہوں اور تُو کون ہے؟

میراثی: میں دیواں دا وی پَر دے (اردو ترجمہ: میں دیووں کا بھی باپ)، تُو کیا کر سکتا ہے؟

دیو: میں ناخن مار کر خون نکال سکتا ہوں۔ تو کیا کر سکتا ہے؟

---

[1] گُتھی (مونث) حجام کا تھیلا، جس میں وہ اپنے اوزار مثلاً اُسترا، قینچی وغیرہ رکھتا ہے۔

[2] بھڑولی (مونث)، بھڑولا (مذکر): غلہ دان، اناج محفوظ رکھنے کی کوٹھی۔

میراثی: میں اُسترا مار سکتا ہوں۔

دیو نے ناخن مارا۔ میراثی کے جسم سے تھوڑا سا خُون نکل آیا۔ جواباً میراثی نے نائی کی گُتھّی میں سے اُسترا نکال کے مارا، دیو لہولہان ہو گیا۔

میراثی: تو اور کیا کر سکتا ہے؟

دیو: میں اپنا پیٹ بجا سکتا ہوں۔

دیو نے پیٹ بجایا۔ کافی شور پیدا ہوا۔ جواباً میراثی نے بھرائی کا اُٹھایا ہوا ڈھول بجایا، جسے سُن کر دیو یہ کہتا ہوا ڈر کے بھاگ کھڑا ہوا: ''دوڑو، دیواں دا پردے (دیووں کا باپ) آ گیا، بھاگو، دیواں دا پَردے آ گیا۔'' دیو ہانپتا کانپتا اپنے ساتھی دیووں کے پاس پہنچا اور انھیں بھی ''دیووں کے پردے'' کے بارے میں بتایا۔ سب خوف کے مارے تھر تھرانے لگے۔ اُدھر میراثی اور نائی دونوں آگے روانہ ہوئے۔

چلے جا رہے ہیں، چلے جا رہے ہیں، چلتے چلتے رات ہو گئی۔ ایک تو رات کا وقت، اُوپر سے دیووں سے بھرا جنگل۔ میراثی اور نائی بوہڑ (بڑ) کے ایک پُرانے، گھنے پیڑ پر چڑھ گئے۔ چوں کہ بوہڑ کے پتے بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں، اس لیے وہ دونوں باآسانی اُن میں چُھپ کر بیٹھ گئے۔ آدھی رات کو بوہڑ تلے دیو جمع ہونا شروع ہوئے۔ وہ اپنے سب سے بوڑھے جٹا دھاری دیو کو بھی اُٹھا کر لا رہے تھے۔ کوئی اس کی ٹانگیں اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ کسی نے دونوں بازو پکڑ رکھے تھے۔ کوئی اُس کی گھنی، اُلجھی ہوئی، لمبی ڈاڑھی اُٹھائے آ رہا تھا۔ اس بوڑھے دیو کی آنکھوں کے سامنے دیووں کی کئی پیڑھیاں جوان ہو کر موت کی نیند سو چکی تھیں۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ بوڑھے دیو کو لے جا کر بوہڑ کے نیچے سونے کی ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔

جنگل سے سوکھی لکڑیاں جمع کر کے آگ کے الاؤ روشن کیے گئے۔ قورمہ، زردہ، بریانی، مُتنجن، فرنی کی دیگیں پکائی جانے لگیں۔ حلوے کے بڑے بڑے کڑاہے پکائے جا رہے تھے۔ نیچے دیووں کی محفل گرم تھی۔ اُوپر بوہڑ کے پیڑ پہ بیٹھے میراثی کو سخت پیشاب آ گیا۔ اتنا سخت کہ سہار ممکن نہ رہی۔ نائی نے بہتیرا ڈرایا، منع کیا کہ دیو ہم دونوں کو ہڑپ کر جائیں گے۔ لیکن میراثی بوہڑ کے بڑے بڑے پتوں میں چُھپا، چاروں اور گھوم کر پیشاب کی دھار مارنے لگا۔ نیچے بیٹھے دیو بھیگنے لگے۔ وہ سمجھے شاید بارش آ گئی۔ اسی اثنا میں اچانک میراثی نائی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ''دوست! پھر نہ کہنا۔ پکڑ سکتے ہو تو پکڑ لو۔ میرے سر پر رکھی ہوئی بھڑولی، مُرغی اور انڈوں سمیت،

گرنے لگی ہے۔اور لو صاحب! یہ چلی۔" بے چارہ نائی ہاتھ بڑھا بڑھا کے روکتا ہی رہ گیا لیکن کم بخت میراثی کے آگے اس کی پیش نہ گئی۔ میراثی نے آن کی آن میں، دیکھتے ہی دیکھتے بھڑولی نیچے بیٹھے دیووں کی جماعت پر گرادی۔ مُرغی کٹ کٹ کرتی ہوئی بوڑھے دیو پر گری۔ ساتھ ہی بہت سے انڈے پڑے۔ رہی سہی کسر بوکے نے نکال دی۔ میراثی نے بھڑولی کے ساتھ وہ بھی نیچے پھینکا۔ بوکا تیر کی طرح نشانے پر لگا۔ سیدھا ایک دیو کے سر پہ پڑا۔ پھر کیا تھا، دیو کا سر بوکے میں پھنس گیا۔ وہ چیختا چلاتا، چھلانگیں مارتا ہوا بھاگا۔ دکھائی تو دیتا نہیں تھا، سو کبھی کسی درخت سے جا ٹکرایا تو کبھی کسی ساتھی دیو سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ پہلے بارش، پھر بھڑولی، مُرغی، انڈے اور آخر میں مُنھ پر بوکا لیے ہوئے کوئی مخلوق، اُوپر سے رات۔ مصیبت پر مصیبت۔ دیو سمجھے کہ وہی بلا آگئی۔ غرض شب کے اندھیارے میں وہ دھما چوکڑی مچی کہ توبہ ہی بھلی۔ آخر سب دیووں نے بھاگنا شروع کر دیا، یہ کہتے ہوئے: "دوڑو، دیواں دا پردے آ گیا، بھاگو، دیواں دا پردے آ گیا۔" انھیں اپنی اپنی پڑ گئی۔ اپنے سردار، سب سے بوڑھے دیو کو بھی وہیں چھوڑ کر چلتے بنے۔ وہ بے چارہ ہانپتا، کانپتا، پکارتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے بمشکل رینگتا ہوا چلا آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں تتّر بتّر ہو چکے تھے۔ میدان خالی تھا۔ یہ دیکھ کر میراثی اور نائی بوہڑ کے درخت سے نیچے اُترے۔ دیگیں پک کے تیار تھیں۔ آگے بڑھ کے دیگوں کے مُنھ کھولے۔ بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ سوندھی سوندھی خوشبو پھیل رہی تھی۔ مزے مزے کے کھانے منتظر تھے۔ اِدھر پیٹ میں چُوہے دوڑ رہے تھے۔ بس پھر کیا تھا، دونوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دیگوں پر ٹوٹ پڑے۔ ایسے کھانا کھایا جیسے صدیوں کے بھوکے ہوں۔ جب خُوب پیٹ بھر گیا تو نیند بھی مزے کی آئی۔ دونوں گھوڑے بیچ کر سوئے۔ اگلے روز بھی پہر دن چڑھے تک پڑے سوتے رہے۔ پھر جاگے، قریب بہتی ایک ندی سے غسل کیا۔ واپس آئے۔ دیگیں اب بھی بھری ہوئی تھیں۔ پیٹ بھر کے کھانا کھایا اور دیگوں کو ویسے ہی چھوڑ کر آگے روانہ ہوئے۔ چلے جا رہے ہیں،

چلے جا رہے ہیں، چلتے چلتے شام ہوگئی۔ آگے ایک بستی آئی۔ جب وہ بستی میں داخل ہوئے، تو رات پڑ چکی تھی۔ میراثی نائی سے کہنے لگا: "کیوں نہ ہم چپکے سے کسی گھر کی چھت پر چڑھ جائیں۔ مزے سے اُوپر سوئیں گے۔ جب پَو پھٹے گی، سورج نکلے گا تو خود بخود آنکھ کھل جائے گی۔ کود کر نیچے آ جائیں گے اور اپنی راہ لیں گے۔" یہ سُنتے ہی نائی پھر خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ بولا: "

ے موگھا/موگھ : (مذکر) سوراخ، ہوا کی آمد و رفت کے لیے چھت کے عین اوپر بنا ہوا سوراخ

ناں، ناں، گھر والوں کو پتا چل گیا تو وہ ہماری خوب پٹائی کریں گے۔" لیکن میراثی کسی کی کب سنتا تھا۔اس نے پھر نائی کو دھمکایا: "کڈ میرا چھولیاں دا دانہ"۔نائی کہنے لگا: "یار! تیرے اس چنے کے دانے نے بہت تنگ کیا ہوا ہے۔جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی، جب میں نے تجھ سے لے کر کھایا تھا۔چل بابا چل۔جو کرنا ہے، کر۔میں تیرے ساتھ ہوں۔تیرا چنے کا دانہ جو کھایا ہوا ہے۔کون کہتا ہے: ایک سور ما چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا؟"

پرانے وقتوں کی بستی تھی۔مٹی کے چھوٹے چھوٹے گھر۔انسانی قد کے برابر دیواریں۔ کسانوں کا گاؤں تھا۔لوگ شام ہوتے ہی، کھا پی کر کب کے سو چکے تھے، تا کہ صبح صادق سے پہلے جاگ جائیں اور اپنے اپنے کھیتوں میں جا کر کام میں مصروف ہو جائیں۔اس وقت بستی میں ہُو کا عالم تھا۔گلیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔میراثی دیوار پھاند کر، چپکے سے ایک گھر کی چھت پر چڑھ گیا۔نائی نے بھی پیروی کی۔ پیچھے پیچھے وہ بھی چلا آیا۔دونوں مزے سے پاؤں پھیلا کر، کچی چھت پر لیٹ گئے اور خوابِ خرگوش کے مزے لینے لگے۔آدھی رات کو میراثی کی آنکھ کھل گئی۔ اسے بڑا سخت پیشاب آیا ہوا تھا۔نائی بھی جاگ گیا۔اس نے بہتیرا کہا کہ یہیں چھت پر پیشاب کر لو۔مٹی کی چھت ہے۔کچھ ہی دیر میں پانی جذب ہو جائے گا اور کسی پتا بھی نہیں چلے گا۔مگر میراثی بھی ایک نٹ کھٹ تھا۔جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔اس نے نائی کی بات ایک کان سے سُنی اور دوسرے کان سے نکال دی۔بے چارہ منع کرتا ہی رہ گیا، میراثی چھت پر بنے مٹی کے موگھے کے پاس جا کھڑا ہوا اور عین اس میں پیشاب کی دھار مارنے لگا۔نیچے کمرے میں جٹ اور جٹی اپنے بچوں کے ساتھ سوئے ہوئے تھے۔جٹی ہال ہال کرتی (دوہائی دیتی) اُٹھ کھڑی ہوئی اور پکار پکار کے جٹ کو جگانے لگی: "اُٹھو، بارش آ گئی۔اُٹھو، بارش آ گئی۔" جٹ بھاگا بھاگا کمرے سے نکلا کہ صحن میں موجود کپڑا لتّا اور دوسرا سامان اکٹھا کر کے کمرے میں لے آئے تا کہ مینھ میں بھیگ نہ جائے۔مگر یہ کیا، باہر آیا تو مطلع صاف تھا۔ننھے ننھے تارے ٹمٹما رہے تھے۔بے چارہ بہت سٹپٹایا۔ بارش کو جٹی کا خواب وخیال سمجھا۔کمرے میں واپس آیا۔اپنی خجالت مٹانے کے لیے بیوی کو خُوب ڈانٹا اور سب گھر والے دوبارہ لمبی تان کر سو گئے۔

کُچھ دیر گزری تھی کہ میراثی کو زبردست حاجت ہوئی۔نائی نے پھر بہتیرا روکا، ڈرایا دھمکایا لیکن میراثی پھر سُنی اَن سُنی کرتا ہوا موگھے پہ جا بیٹھا اور سکون سے حاجت رفع کرنے لگا۔اب کے موگھ کے عین نیچے بچے سوئے ہوئے تھے۔پاخانہ سیدھا بچوں کے چہروں پہ جا کے گرا۔وہ اُٹھ

کے رونے بلکنے لگے۔ جنّی نے پھر شوہر کو آواز دی: ''اجی سُنتے ہو کیا؟ گڈو کے ابّا! اُٹھیے دیکھیے تو سہی یہ کیا چیز اُوپر سے گر رہی ہے۔ اُف توبہ! کتنی بدبو ہے'' جواب میں جٹ نے جنّی کو موٹی سی گالی دی اور غُصّے سے پھنکار کر بولا: ''خاموش، نامراد! بچوں کو لے کر چُپ چاپ پڑی رہ۔ پہلے بھی تُو نے بلا وجہ میری نیند خراب کی تھی۔'' اس کے بعد جنّی کو دوبارہ کُچھ کہنے کی جراٗت نہ ہوئی۔ جب دن چڑھا تو میراثی اور نائی چھت سے نیچے کودے اور اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔

چلے جارہے ہیں، چلے جارہے ہیں، چلتے چلتے دوپہر ہوگئی۔ رستے میں ایک کنواں آیا۔ دونوں وہاں پہنچے اور ڈول سے پانی نکال نکال کر پینے لگے۔ اتنے میں ایک جاڑی (گڈریا) اپنا ریوڑ لیے وہاں آ پہنچا اور بکریوں کو پانی پلانے لگا۔ میراثی شیطانِ مجسّم تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے شیطان کے کان کاٹتا تھا۔ اس سے تو شیطان بھی پناہ مانگتا تھا۔ ظالم نے چپکے چپکے جانے کیا منتر پڑھا کہ بکریاں خود بخود کنوئیں میں گرنے لگیں۔ جو بکری بھی کنوئیں کی منڈیر کے پاس جاتی، دھڑام سے اندر گرتی۔ جاڑی حیران، پریشان۔ بچارے کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ذرا سی دیر میں ساری بکریاں کنوئیں کے اندر تھیں۔ میراثی دل ہی دل میں ہنستا ہوا جاڑی سے کہنے لگا: ''یار! لگتا ہے تیری بکریاں بہت پیاسی تھیں، جو یوں کنوئیں میں گرتی چلی گئیں۔ اب اس کا ایک ہی حل ہے کہ بھاگ کر جا، کہیں سے لکڑی کی کوئی سیڑھی اُٹھا کے لا اور اپنی بکریوں کو باہر نکالنے کے لیے کنوئیں کے اندر اُتر۔'' جاڑی بھاگا بھاگا گیا۔ کُچھ دیر بعد جانے کہاں سے لکڑی کی ایک سیڑھی اُٹھا لایا۔ سیڑھی کنوئیں میں لگائی گئی۔ جاڑی ڈرتا، گھبراتا، ہولے ہولے نیچے اُترا۔ دوسری طرف میراثی نے اپنا صافہ کنوئیں میں لٹکایا۔ جاڑی ایک ایک کر کے بکریاں پکڑتا جاتا، ان کی ٹانگیں صافے سے باندھتا جاتا اور اُوپر سے میراثی صافے کو کھینچ کھینچ کر باری باری باہر نکالتا جاتا۔ یوں یکے بعد دیگرے ساری بکریاں کنوئیں سے باہر نکل آئیں۔ پیچھے پیچھے، سیڑھی چڑھ کر جاڑی بھی باہر آ گیا۔ اپنی بکریوں کو زندہ سلامت دیکھ کر، انھیں دوبارہ پا کر جاڑی بہت خوش ہوا۔ اس نے مدد کرنے پر میراثی کا شکریہ ادا کیا اور پیش کش کی کہ آدھی بکریاں تم لے لو، لیکن میراثی نے انکار کر دیا کیوں کہ اس سارے کھیل سے اس کا مطمعِ نظر جاڑی کو دھوکا دے کر آدھی بکریاں ہتھیانا نہیں تھا۔ اس کا مقصد محض ہنسی، دل لگی تھا۔ جاڑی کاندھے پر ڈنڈا رکھے، اپنے گلّے کو ہانکتا ہوا، خوش خوش گھر کو چل پڑا۔ میراثی اور نائی بھی اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔

چلے جا رہے ہیں، چلے جا رہے ہیں، چلتے چلتے رستے میں ایک گھنا جنگل آیا۔ اتفاق دیکھیے کہ اسی جنگل میں دیو بھاگے بھاگے آ کر چھپے تھے۔ اچانک میراثی اور نائی سے اُن کا آمنا سامنا ہو گیا۔ دیو چلانے لگے: ''دیواں دا پردے آگیا، دیواں دا پردے آگیا۔'' لیکن اب بھاگنے کا موقع نہیں تھا۔ بے چارے کب سے جان بچانے کے لیے، مارے مارے پھر رہے تھے۔ وہ چوہے بلّی کے اس کھیل سے تنگ آ چکے تھے۔ سو بے اختیار، سب دیو میراثی کے پاؤں میں گر گئے اور رو رو کر اُس سے اپنی جان بخشی کی التجا کرنے لگے۔ میراثی بولا: ''صرف ایک شرط پر میں تمھاری جان بخشوں گا۔ فوراً میرے لیے ایک نہر کھود دو۔'' یہ سُنتے ہی سارے دیو ہاتھ باندھ کے مؤدّب کھڑے ہو گئے اور بولے: ''آپ کا حکم سر آنکھوں پر، دیواں دے پردے!'' بس پھر کیا تھا، وہ اسی وقت نہر کھودنے میں جُت گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دریا سے نہر کھود کر اس جنگل تک لے آئے۔ اب میراثی نے اگلا فرمان جاری کیا: ''اس نہر میں سب ڈبکیاں لگاؤ۔'' مرتا کیا نہ کرتا۔ دیو یک زبان ہو کر بولے: ''آپ کا حکم سر آنکھوں پر، دیواں دے پردے!'' بچارے نہر میں ڈبکیاں لگانے لگے۔ اب میراثی نے نئی چال چلی۔ جو دیو بھی پانی میں غوطہ مارتا، میراثی آگے بڑھ کر اسے پانی کے اندر ہی گاڑ دیتا۔ اس طرح یکے بعد دیگرے کئی دیو جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ وہ پھر آ آ کر میراثی کے پیروں میں گرنے لگے اور رو رو کر معافی مانگنے لگے۔ لیکن میراثی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اب بچارے بھاگم بھاگ اپنی عورتوں کو لے آئے۔ دیونیوں نے بھی سر کے بال بکھیر لیے۔ میراثی کے پاؤں میں سر رکھ کر، رو رو کر دوہائی دینی شروع کی کہ بھیا! ہم تیری بہنیں ہیں۔ بھائی بہنوں کے سہاگ کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کی مانگ نہیں اجاڑتے۔ دیو خطا کا پتلا۔ اگر ہمارے شوہروں سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو ہماری خاطر، اپنی بہنوں کی خاطر معاف کر دو۔'' اس پر میراثی تھوڑا سا پسیجا۔

غرض قصہ مختصر، آخر میراثی اور دیووں کے بیچ معاملہ یوں طے پایا کہ دیو اپنی جان بخشی کے عوض سات بادشاہیوں کا خزانہ میراثی یعنی ''دیواں دے پردے'' کو دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ پھر کیا تھا، انھوں نے اپنے وعدے کے مطابق راتوں رات خزانوں سے بھرے، پورے کے پورے سات محل ہی اُٹھا کر میراثی کی خواہش پر اُس کے گاؤں کے باہر لا کر رکھ دیے۔ اگلی صبح جب گاؤں کے لوگوں کی آنکھیں کھلیں تو انھیں اپنے گھروں میں چارپائیوں پر لیٹے لیٹے ہی بُرج منارے نظر آئے۔ وہ سب بھاگے بھاگے گاؤں سے باہر نکلے۔ اپنے غریبانہ سے گاؤں کے

اردگرد سات عظیم الشان محل دیکھ کر اُن کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ ''چڑھے چَن تے کُل جہان ویکھے۔''؂ میراثی نے ایک محل تو اپنے جگری دوست نائی کو دے دیا کہ اس ساری مہم کے دوران میں، اُس نے ہر ایک قدم پر میراثی کا ساتھ دیا تھا اور یوں ثابت کیا تھا کہ ایک سے دو بھلے۔ میراثی نے دل کھول کر اپنے گاؤں والوں میں بھی دولت بانٹی۔ کچے گھروں کی جگہ انھیں پکے اور خوب صورت گھر تعمیر کروا کے دیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب غریبوں کی حالت بدل گئی۔ لوگ دن رات میراثی کو دعائیں دیتے تھے۔ میراثی اور اُس کے گاؤں کے لوگ جب تک جیئے، ہنسی خوشی جیئے۔

اتوار ۱۱۔اکتوبر ۲۰۰۹ء

؂ چاند چڑھتا ہے تو سارا جہان دیکھتا ہے۔

ٹُنڈے؎ کی کارستانیاں

پریوں کی کہانی (Fairy Tale) اور دیوی دیوتاؤں کے قصے (Myth) کے برعکس، لوک کہانی (Folk Tale) کے کردار عام طور پر نہ تو بادشاہ ہوتے ہیں اور نہ ہی شہزادیاں۔ وہ اکثر اپنی زندگی کی شروعات غریب یا بدنصیب افراد کے طور پر کرتے ہیں۔ وہ معمولی لوگ ہوتے ہیں، جو غیر معمولی کام کرگزرتے ہیں۔ متعدد لوک کہانیاں غریب لوگوں کے بارے میں ہیں، جو اپنے ذہنوں کا استعمال کر کے یا اپنی بہادری کے بل بوتے پر جیت جاتے ہیں اور خوش نصیبی اُن کے قدم چومتی ہے۔ یہ بے حد دل چسپ اور مزے دار کہانی بھی اسی قبیل کی کہانی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، کسی گاؤں میں چار بھائی رہتے تھے۔ چوتھے اور سب سے چھوٹے بھائی کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا۔ تینوں بڑے بھائی اُس پر ہنستے تھے اور اسے "ٹُنڈا" اور "ٹنڈن" کہہ کے پکارا کرتے تھے۔ بے چارہ رات دن بھائیوں کے مذاق کا نشانہ بنتا تھا۔ تینوں بڑے بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ ان کی بہت خُوب صُورت بیویاں تھیں۔ گھریلو سُکھ کے مزے اُٹھاتے تھے۔ ٹنڈا غیر شادی شدہ تھا۔ بڑے بھائی اپنے آپ میں مست تھے۔ انھیں چھوٹے بھائی کی شادی کی کوئی فکر نہیں تھی۔

ایک دن ٹنڈے نے سوچا، خُدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ یہ بات تو طے ہے کہ میرے بڑے بھائی میری شادی کریں گے نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو، میں بے نام ونشاں ہی دنیا سے کُوچ کر جاؤں۔ جو آپ اپنا سگا نہیں، سگے اس کے خاک سگے بنیں گے۔ مجھے خود ہی اپنے بارے میں کُچھ سوچنا چاہیے۔ خود ہی اپنا بیاہ کروانا چاہیے۔

ٹُنڈے نے پائی پائی جوڑ کر اپنی شادی کے لیے کُچھ روپے جمع کر رکھے تھے۔ اپنی دلھن کے لیے کُچھ کپڑا لتا، زیور گہنا بھی بنوا رکھا تھا۔

ایک روز گاؤں میں عجب حادثہ ہوا۔ اچانک ایک نزجوان، حسین، کنواری لڑکی کی موت واقع ہوگئی۔ گاؤں والے اس جوان موت پر بے حد دکھی تھے۔ لڑکی کو گاؤں کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ ٹنڈا جنازے سے لوٹا تو چلتے چلتے، رستے میں اس نے سوچا، میں تو لنجا ہوں۔ کوئی باپ اپنی بیٹی کی، کوئی بھائی اپنی بہن کی شادی مجھ سے نہیں کرے گا۔" اچانک اُس کے ذہن میں ایک اچھوتا

؎ ٹنڈا: لنجا، ہاتھ کٹا آدمی

خیال آیا۔ ٹنڈے نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ فوراً گھر گیا۔ اُس نے پوشیدہ جگہ سے اپنے جوڑے ہوئے رُوپے، گہنے، کپڑے نکالے۔ وہاں سے وہ ناک کی سیدھ ماچھیوں[1] کے ہاں پہنچا۔ انھیں روپے دے کر کہنے لگا: ”بترو (دوستو)! تیار رہنا۔ میرا نکاح ہو گیا ہے۔ آج رات ہم نے تمھاری بھابی کی ڈولی لے کے آنا ہے۔“

آدھی رات کو ٹنڈا کہاروں کو لیے قبرستان میں جا پہنچا۔ کہار پہلے تو حیران ہوئے کہ بھابی کی ڈولی اُٹھانے کہاں آ پہنچے ہیں۔ چوں کہ روپے کھائے ہوئے تھے، اس لیے بے چون و چرا ٹنڈے کے کہنے پر قبرستان میں بنی سب سے تازہ قبر کی کھدائی کرنی شروع کر دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُنھوں نے قبر کھود کے، خُوب صُورت لڑکی کی نہائی دھوئی لاش باہر نکال لی۔ ٹنڈے نے کفن علیحدہ کیا اور لاش کو اپنے لائے کپڑے، زیور پہنا دیے۔ مری ہوئی لڑکی بالکل دلھن بن گئی۔ وہ روپ چڑھا (نکالا) کہ چندے آفتاب، چندے ماہتاب۔ ایک نظر دیکھنے والا بے اختیار بلائیں لے۔ اُسے پالکی میں ٹل[2] کا سہارا دے کر بٹھا دیا گیا۔ پالکی میں رنگ برنگے ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ دو ماچھی آگے ہوئے، دو پیچھے۔ اُنھوں نے پھول کی طرح بانس اُٹھا کے اپنے کاندھوں پر رکھ لیے۔ دُولھا مرے یا دلھن، نائی کو اپنے ٹکے سے کام۔ کہار ڈولی اُٹھائے چل پڑے۔ ٹنڈا سہرا لگائے، دُولھا بنا، گھوڑی پہ سوار آگے آگے روانہ ہوا۔

صبح سویرے یہ مختصر بارات ایک گاؤں کے پاس سے گُزری۔ حُسنِ اتفاق سے گاؤں کے چودھری کی حسین و جمیل بیٹی تین، چار سہیلیوں کے ساتھ صبح کی سیر کرنے کے لیے کھیتوں میں آئی ہوئی تھی۔ پُروا چل رہی تھی۔ اوس میں بھیگی کھیتیاں لہلہا رہی تھیں۔ چودھرانی پھولا پُھولا پھر رہی تھی۔ ایک تو صبح کے معطر ماحول میں طبیعت رنگ پر آئی ہوئی تھی؛ اس پر سامنے جو نظر کی تو کیا دیکھتی ہے کہ ایک بارات خراماں خراماں چلی جا رہی ہے۔ دُولھے میاں آگے آگے گھوڑے پر اٹھلاتے ہوئے جا رہے ہیں۔ ماتھے پہ سہرا، پگ (پگڑی) کا طرلا (طرّہ، شملہ) نکلا ہوا۔ گدرائے بدن والی حسین چودھرائن کے مَن میں چُہل آئی: ہم تو دلھن ضرور دیکھیں گے۔ اس نے اپنی سہیلیوں کو ساتھ لیا، اٹھلاتی ہوئی آگے بڑھی اور بارات کا راستہ روک کے کہنے لگی: ”ارے ارے! ذرا کی ذرا ڈولی نیچے رکھو۔ پردہ اُٹھاؤ۔ ہمیں ووہٹی (دلھن) دکھاؤ۔“ ٹنڈا بولا: ”نہ بابا نہ میری ووہٹی

---

[1] ماچھی: (مذکر) ایک قوم
[2] ٹل اتھکہ اٹر: (مونث) تھم، وہ لکڑی جو چھت کے کم زور ہونے کی وجہ سے اس کے نیچے کھڑی کی جاتی ہے، سہارہ، ٹیک

تو بڑی نازک ہے۔ بالکل چھوئی موئی ہے۔ کہیں اسے ہوا لگ گئی تو مر جائے گی۔ اور اب! ہاں، میرے پیر نے بھی سختی سے منع کیا ہے کہ اگر اپنی ووہٹی کسی کو دکھائی تو یہ مر جائے گی۔" غرض یہ بات ساری دنیا میں مشہور ہے۔ سونے پہ سہاگا، یہ عجیب و غریب بات سُن کے لڑکیوں کو اور تجسس ہوا کہ ایسی دلھن تو ہم ضرور بالضرور دیکھیں گے، جو محض دیکھنے سے مر جاتی ہے۔ کچھ کسان ہل جوت رہے تھے، کچھ کھیتوں میں نلائی کر رہے تھے اور کچھ فصلوں کو پانی دے رہے تھے۔ انھوں نے جو گاؤں کے چودھری کی بیٹی کو باراتیوں سے بحث مباحثہ کرتے دیکھا تو وہ بھی وہاں آن دھمکے۔ جب ساری صورتِ حال کا پتا چلا تو لوگ یک زبان ہو کر بولے: "ارے! یہ تو آج تک ہم نے نہ کہیں دیکھا، نہ سُنا کہ دیکھنے سے ووہٹی مر جائے۔" پھر وہ ہنس کر بولے: "بابا! یہ ہمارے گاؤں کی لڑکیاں ہیں۔ ووہٹی دیکھنا چاہتی ہیں تو دکھا دے۔ اگر تیری ووہٹی مر گئی تو تو ان میں سے جس لڑکی پہ ہاتھ رکھے گا، اسی سے تیرے دو بول پڑھا دیں گے اور تیرے ساتھ کر دیں گے۔" یہ سُن کر ٹنڈا بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا: "اب اپنی بات پہ قائم رہنا۔ مرد کی ایک زبان ہوتی ہے۔" سب نے مذاق مذاق میں ہاں کر دی۔ چودھری کی بیٹی نے دھڑکتے دل کے ساتھ ڈولی کا ریشمی پردہ اُٹھایا۔ دلھن گھونگھٹ کاڑھے نیم دراز تھی، جونہی گھونگھٹ اُٹھا، ہائیں یہ کیا۔ دلھن تو واقعی مر چکی تھی۔ یہ دیکھ کر ٹنڈے نے شور مچا دیا: "ہائے ہائے! ظالموں نے میری نئی نویلی ووہٹی کو مار ڈالا۔ میں کہتا رہا، لیکن کسی نے میری ایک نہ سنی۔ اب اپنا وعدہ پورا کرو۔ مجھے رشتہ دو۔ میں تم لوگوں سے ساک (رشتہ) لے کر ہی جاؤں گا۔" گاؤں والوں کی خُوب گُو ہا چھی چھی ہوئی۔ کچھ اور راہ چلتے لوگ بیچ میں پڑے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ اب تو وعدہ پورا کرنا ہی پڑے گا۔ چار و ناچار لوگوں نے ٹنڈے سے کہا: "تو جس لڑکی سے کہے تیرا بیاہ کیے دیتے ہیں۔" ٹنڈے نے فوراً بڑھ کے چودھری کی بیٹی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا: "میں تو بس اسی کو اپنی ووہٹی بناؤں گا۔" اگرچہ لوگوں نے لاکھ کہا کہ یہ وہ گڑ نہیں جو مکھیاں کھائیں۔ کوئی بولا: کہاں راجا بھرج، کہاں گنگوا تیلی۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت ہے، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ چودھرانی کو ہاں کرنا پڑی: نہ چاہتے ہوئے ٹنڈے سے دو بول پڑھوانا پڑے: ٹنڈے کی دلھن بننا پڑا۔

کوئی کہتا تھا: "مخمل میں ٹاٹ کا پیوند"۔ کوئی کہتا: "حور کے پہلو میں لنگور"۔ غرض جتنے منھ اتنی باتیں۔ لیکن ٹنڈے نے ایک کان بہرا، ایک گونگا کر لیا۔ لوگ بکتے رہے مگر "کانواں دے آکھیاں، ڈھگے نہیں مردے"[1]۔ وہ اِس کان سُن کے اُس کان اڑاتا رہا۔ ٹنڈے نے برات پیچھے

---

[1] کوؤں کے کہنے سے بیل نہیں مر جاتے۔

موڑی اور اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک اُجاڑ جگہ ویران سا قبرستان آیا۔ وہیں مُردہ دُلھن کو کفن پہنا کر کریر[1] کے ایک جھنڈ کے پاس دفن کر دیا گیا۔ چودھری کی بیٹی نے اُس کے اُترے ہوئے سرخ کپڑے اور زیور گہنے وَنْ کے درختوں کی اوٹ میں جا کے پہنے اور جب باہر آئی تو دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے۔ ایسے لگتا تھا جیسے بہشت کی حور زمین پہ اُتر آئی ہے۔ ٹُنڈے کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جاگتی آنکھوں سے سپنا دیکھ رہا ہو۔ وہ بار بار اپنے چٹکی بھر کے دیکھتا تھا کہ واقعی یہ حقیقت ہی ہے۔ گدرائے ہوئے، دودھ کی طرح گورے چٹے بدن والی چودھرائن شرماتی لجاتی ٹنڈے کی ڈولی میں جا بیٹھی۔ کہاروں نے ہنستے کھیلتے، ڈولی کے بانس اُٹھا کے کاندھوں پر رکھ لیے۔ ٹنڈا دُولھا بنا، ٹھاٹھ سے اپنی گھوڑی پر جا بیٹھا۔ جب یہ بارات گاؤں میں داخل ہوئی تو ہر طرف ایک شور مچ گیا۔ لڑکے بالے پکار پکار کے کہنے لگے: ”ٹنڈا ووہٹی لے کے آیا، ٹنڈن ووہٹی لے کے آیا۔“ گاؤں کی عورتیں گھروں کی چھتوں پر کھڑی ہو ہو کے، گلیوں میں سے گزرتی ٹنڈے کی برات دیکھنے لگیں۔

غرض ٹنڈا چاند کا ٹکڑا ڈولی میں لیے اپنے گھر میں داخل ہوا۔ تینوں بڑے بھائی حیران پریشان بھاگے بھاگے آئے۔ جب اتنی خُوب صورت دلھن دیکھی تو سر پیٹ کر رہ گئے۔ اُن کے تو وہم و گمان میں یہ بھی نہیں تھا کہ کبھی ٹنڈے کی شادی ہو گی۔ اس پر طُرّہ یہ کہ اتنی سوہنی (حسین) ووہٹی۔ بھائی جل بھُن کر کوئلہ ہو گئے۔ وہ ٹنڈے سے پُوچھنے لگے: ”ٹنڈن! ٹنڈن! تو کہاں سے اور کیسے اتنی سوہنی ووہٹی بیاہ کے لایا ہے؟“ ٹنڈا بڑے فخر سے چھاتی پر ہاتھ مار کے، گردن اُٹھا کے بولا: ”کل ہمارے گاؤں میں جو لڑکی مر گئی تھی، میں اس کی لاش ڈولی میں ڈال کر ساتھ والے گاؤں میں لے گیا۔ وہاں جا کے میں نے ہوکا[2] لگایا: ”مریاں لے لو، جیوندیاں دے دو، مریاں لے لو، جیوندیاں دے دو[3]۔“ یہ سُن کے گاؤں والوں نے مری ہوئی لڑکی لے لی اور بدلے میں یہ زندہ لڑکی دے دی۔“

بس پھر کیا تھا، بھائیوں کی رال ٹپک پڑی۔ اگرچہ ان کی بیویاں بہت خُوب صُورت تھیں، لیکن حرص و ہوس سے اندھے ہو کر انھوں نے سوچا، ہماری زنانیاں تو بہت پُرانی ہو گئی ہیں۔

---

[1] کریر، کریل، کرینہ: ایک خاردار جھاڑی۔

[2] ہوکا، ہوکر: ا۔ ہانک، آواز، پکار، ۲۔ اعلان، ڈھنڈورا، منادی، ۳۔ خوانچہ فروش یا بنجاروں کی آواز۔

[3] اُردو ترجمہ: مُردہ (عورتیں) لے لو، زندہ (عورتیں) دے دو۔

دن رات ایک ہی صورت دیکھ دیکھ کر ہماری تو آنکھیں سُوج گئی ہیں۔ایک ہی طرح کی آواز سُن سُن کے کان پک گئے ہیں۔بس بھئی بس، بہت ہو گیا۔اب تو آنکھوں کی ضیافت کے لیے کوئی اور ہی حسین مکھڑا ہونا چاہیے، کانوں میں رس پڑنے کے لیے کوئی اور ہی میٹھی میٹھی آواز ہونی چاہیے۔ نہ سوچا نہ سمجھا، انھوں نے اسی رات اپنی بیویوں کو قتل کیا۔ رات گئے ڈولیوں میں ڈال کے، کہاروں کے کاندھوں پر رکھے، اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار اسی گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے، جہاں سے ٹنڈا چودھری کی بیٹی لے کر آیا تھا۔ابھی فجر کا تارا ابھی نہیں ڈوبا تھا کہ گاؤں میں جا پہنچے اور لگے ہوکے لگانے: ''مریاں لے لو، جیوندیاں دے دو۔'' گاؤں کے لوگ آنکھیں ملتے ہوئے، جمائیاں لیتے ہوئے گھروں سے نکلے کہ الٰہی خیر، یہ کیا آفت آ پڑی ہے۔ جب انھیں اصل بات کا پتا چلا تو سَٹ پٹا کے رہ گئے، کہ یہ کون سی نئی پھیری پھیر رہے ہیں۔انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، تینوں بھائیوں کو پکڑ لیا۔ کہار ڈولیاں وہیں چھوڑ کے یوں غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ گاؤں والوں نے ڈنڈے نکال لیے اور تینوں کو روئی کی طرح تُوم ڈالا۔وہ خبر لی کہ تو بہ ہی بھلی۔تینوں بھائیوں نے اپنی بیویوں کی لاشوں کو وہیں چھوڑا اور روتے پیٹتے، گرتے پڑتے، پیٹھ سہلاتے لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔واقعی کسی کا پکّا گھر دیکھ کر اپنا کچا نہیں گرانا چاہیے۔ پیچھے سے ان کی بیویوں کو گاؤں والوں نے دفن کیا۔ بچارے کئی ہفتوں تک چار پائی سے پیٹھ لگائے، ہائے اوئی کرتے رہے۔کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا۔

ٹنڈا اپنی نئی نویلی دلھن کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہا تھا۔بس تھوڑی روپے پیسے کی کمی تھی۔ بے چارے کے پاس صرف ایک مریل سی بھینس تھی، جو بھائیوں نے کمال مہربانی کرتے ہوئے اسے دی تھی۔ یہ باپ کی وراثت سے واحد شے تھی، جو اُس کے حصے میں آئی تھی۔ تمام زمینوں، بھینسوں پر بڑے بھائیوں کا قبضہ تھا۔ ظاہر ہے جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔اب شادی ہوئی تو ٹنڈے کا ہاتھ تنگ ہو گیا۔ بچارہ رات دن خُدا سے دعائیں مانگتا تھا کہ مولا! اتنی خُوب صُورت عورت دی ہے تو ساتھ دولت بھی دے۔ بھلا کباب کے بغیر شراب پینے کا کیا مزا۔

ٹنڈا روزانہ اپنی مریل بھینس چرانے کے لیے دریا کے کنارے لے جاتا۔ بھینس دریا کے پاس اُگی تازہ، ہری ہری گھاس چرنے لگتی۔ ٹنڈا ٹاہلی (شیشم) کے ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں جا کر بیٹھ جاتا۔ کچھ دیر بعد 'چھیو چھیو' '' کہہ کے اپنی بھینس کو دریا سے پانی پلاتا۔ دوپہر کو چودھری کی بیٹی سر پر روٹیوں کا چھابا (چنگیر)، سالن کی کٹوری اور لسی کا گڑوا رکھے آتی۔

پاس ہی ایک بوڑھا چھیڑو[2] بھی اپنی پچاس ساٹھ بھینسیں چرایا کرتا تھا۔ ایک دن ٹنڈا بوڑھے سے پُوچھنے لگا: ''بابا! تیرے پیچھے روٹی نہیں آتی؟'' بابا بولا: ''بیٹا! میں اکیلا ہوں۔ چھڑا چھانٹ (مجرد)؛ نہ بیوی، نہ بچے؛ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ میرا کوئی والی وارث نہیں۔ میرے پیچھے کون روٹی لے کر آئے گا؟ شام کو گھر جاتا ہوں۔ خود ہی آٹا گوندھتا ہوں، ہانڈی چڑھاتا ہوں اور دال دلیا جو پکتا ہے، صبر شکر کر کے کھالیتا ہوں۔'' بابا جی کے دال دلیے کے متعلق سُن کر ٹنڈے نے اپنے ذہن میں کھچڑی پکانا شروع کر دی۔ چند دن بعد اس نے بوڑھے کو رسیوں سے باندھا اور اُٹھا کے دریا میں لا پھینکا۔ اس کی ساری بھینسوں کو ہانک کے اکٹھا کیا اور اپنے گھر لے آیا۔ اُس کے بھائیوں نے جو پچاس ساٹھ بھینسیں دیکھیں تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ حیران ہو کر پُوچھنے لگے: ''ٹنڈن! او ٹنڈن! تیرے پاس تو ایک مریل سی بھینس تھی۔ یہ اتنی بھینسیں کہاں سے لے آیا؟'' ٹنڈا بولا: ''بھائیو! آج کل دریا چڑھا ہوا ہے۔ دریا میں مجھے سبز چوغہ پہنے خواجہ خضر نظر آئے۔ میں نے دریا میں بے دھڑک چھلانگ لگا دی۔ میں خواجہ خضر کے پاس گیا۔ انھوں نے مجھے یہ سب مال ڈنگر (مویشی) دیا ہے۔ بھائیو! کُچھ نہ پوچھو۔ وہاں تو بڑے مزے تھے۔ دریا کی موجوں میں بڑی موجیں تھیں۔ اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ سب کہنے لگے: ٹنڈن یہیں رہو۔ کھاؤ، پیو، مزے اُڑاؤ۔ لیکن میں نے کہا: نہ بابا نہ، پیچھے میرا گھر اکیلا ہے۔ میں نے واپس جانا ہے۔ تب خواجہ خضر نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا: ٹنڈن بیٹا! یہاں خُدا کا دیا بہت ہے۔ یہ مال ڈنگر ساتھ لے جاؤ۔ اور ہاں اگر اور بھی کوئی غریب ہو تو اسے بھی بھیج دو۔ ایسے ہی بھوکے نہ مرتے رہو۔''

یہ سُن کر ایک دفعہ پھر بھائیوں کے مُنھ میں پانی بھر آیا۔ انھوں نے دل میں کہا: ''ہم بھی خواجہ خضر سے بھینسیں لے کر آتے ہیں۔ ہمارا بھائی ٹنڈا بھی پچاس ساٹھ بھینسیں لیے پھرتا ہے تو پھر ہم کیوں نہ بہتے دریا میں ہاتھ دھوئیں۔ ہم بھی دریا میں خواجہ خضر سے ملتے ہیں۔'' بڑی خوشامد سے کہنے لگے: ''پیارے بھائی ٹنڈن! ہمیں بھی خواجہ خضر سے ملا۔'' ٹنڈا بولا: ''کیوں نہیں''۔ قریب ہی ایک بوڑھی کھاری کھڑی تھی۔ ٹنڈے کی باتیں اُس کے بھی کان میں پڑ گئیں۔ اس نے سوچا: میں بھی بہتی گنگا میں چلّو بھر لوں۔ کھاری کا ایک ہی بیٹا تھا، منت مرادوں کا پالا ہوا۔ وہ ٹنڈے سے بڑی لجاجت سے کہنے لگی: ''جب خواجہ خضر سے بھینسیں لینے جاؤ تو میرے بیٹے کو بھی ساتھ ہی

---

[1] چھیو: (مونث) گائے، بیل اور بھینس وغیرہ کو بلانے اور پانی پلانے کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے (تلفظ چھی او)

[2] چھیڑو: مویشی چرانے والا شخص، گڈریا۔

لیتے جانا۔ ہم سارا سارا دن زمین داروں کی جھڑکیاں سنتے ہیں۔ ہماری بھی تقدیر جاگ جائے گی۔ ہمیں بھی بیس پچیس بھینسیں مل جائیں گی۔" ٹنڈا بولا: لمّاں! میرا کیا جاتا ہے۔ میں نے کون سی بھینسیں اپنے پلّے سے دینی ہیں۔ سو بسم اللہ، جب ہم جانے لگیں، تم بھی اپنے بیٹے کو ہمارے ساتھ کر دینا۔" پھر وہ ان سے مخاطب ہوا: "ہم کل صبح سویرے خواجہ خضر سے ملنے دریا پر جائیں گے اور ہاں اپنے ساتھ پانچ چھ سورسّے بھی لیتے آنا۔ ظاہر ہے اتنی بھینسیں، ہم رسّوں کے بغیر کیسے دریا سے کھینچ کر کنارے تک لائیں گے۔" سب خوش ہو گئے اور آنے والے دنوں کے میٹھے خواب دیکھنے لگے۔ ان کے خوابوں میں ہر طرف بھینسیں ہی بھینسیں پھر رہی تھیں اور اڑنگ [1] رہی تھیں۔

اگلی صبح ٹنڈا، ٹنڈے کے تینوں بڑے بھائی، کمھاری اور اس کا بیٹا سب ہنستے کھیلتے، بھینسیں لینے کے لیے، ہاتھوں میں رسّے پکڑے دریا کی طرف روانہ ہوئے۔ ٹنڈا انھیں دریا کے اس حصے پر لے گیا، جہاں سب سے زیادہ اور سب سے گہرا پانی تھا۔ پھر دریا کے کنارے کھڑے ہو کر اس طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: "اسی جگہ کل میں گیا تھا۔ یہیں خواجہ خضر رہتے ہیں۔ میں تم سب کو بھی یہیں پھینکتا ہوں۔ شام تک تم بھی بھینسیں لے کر آ جاؤ گے۔" سب ہنسی خوشی تیار ہو گئے۔ سب سے پہلے ٹنڈے نے اپنے تینوں بھائیوں کے ہاتھ پاؤں باندھے، پھر کمھار کی باری آئی۔ اُس کے بعد سب کو باری باری اُٹھا کے دریا میں پھینک دیا۔ کمھاری بھی دریا کے کنارے، پاس ہی کھڑی دیکھ رہی تھی۔ جب وہ پانی میں غوطے کھانے لگے، لہروں کے تھپیڑوں سے آگے بہنے لگے، کمھاری بولی: "وے [2] ٹنڈن! وے ٹنڈن! یہ تو سب ڈوب رہے ہیں اور آگے کو بہتے چلے جا رہے ہیں۔" یہ سُن کر ٹنڈا بولا: "مائی! اس جگہ سیکورٹی بڑی ہے۔ سپاہیوں نے کہا ہو گا یہ دروازہ بند ہے، اگلے دروازے سے آؤ۔" پھر وہ کمھاری کو لے کے یہ کہتا ہوا گاؤں واپس آ گیا کہ مائی! آ جا ہم چلتے ہیں۔ وہ لوگ خود ہی شام تک لوٹ آئیں گے۔ گھر آ کے بوڑھی کمھاری نے پہلا کام یہ کیا کہ صحن میں جلدی جلدی بہت سی نئی کھرلیاں [3] لا کے رکھ دیں کہ میرا بیٹا بھینسیں لے کر بس آتا ہی ہو گا۔

شام ہو گئی مگر کمھار اور ٹنڈے کے تینوں بھائی واپس نہ آئے۔ رات کا دوسرا پہر تھا۔ کمھاری اپنے بیٹے کی راہ تکتے تکتے ہار گئی۔ آخر ٹنڈے کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ ٹنڈا آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا تو بولی: "ارے ٹنڈن! وہ تو آئے نہیں۔" ٹنڈا بولا: "مائی! فکر نہ کرو۔ میں تڑکے دریا پہ

---

[1] اڑنگن/اڑنگنا: ۱۔ چیخنا، حلق پھاڑ کر چیخنا ۲۔ ڈکرانا، مویشی کا ڈکرانا

[2] وے: (ندائیہ) اے! ارے! ارے!

[3] کھرلی: آکور، چوپایوں کو چارہ ڈالنے کی مٹی یا لکڑی کی بنی ہوئی مستطیل شکل کی چیز

جاؤں گا اور ان کا پتا کر کے آؤں گا۔" اگلے روز کمھاری پھر آئی اور پریشان پریشان سی، آتے ہی کہنے لگی: "وے ٹنڈن! کچھ پتا چلا؟" ٹنڈا بولا: "مائی! میں صبح فجر کی بانگ کے وقت ہی دریا پہ چلا گیا تھا۔ میری اُن سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھ سے کہنے لگے: ہم نے واپس نہیں جانا۔ یہاں تو بڑی موجیں ہیں، بڑے مزے ہیں۔ میں نے بڑا ترلا مارا (منتیں کیں) لیکن انھوں نے میری ایک نہ سنی۔ تیرے بیٹے نے خاص طور پہ یہ پیغام دیا ہے کہ میری ماں سے کہنا میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بھینسوں کا دودھ پی رہا ہوں، مکھن کھا رہا ہوں۔" بوڑھی ماں نے سُنا تو آنکھیں چمکنے لگیں، باغ باغ ہوگئی اور ٹنڈے کو دعائیں دے کر، لاٹھی ٹیکتی، یہ کہتی ہوئی گھر کی اور چل دی: "ہماری تو جیسے تیسے گزرنی تھی، گزر گئی۔ خُدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، بیٹے کی طرف سے جی مطمئن ہوا۔ چلو نگاہوں سے دور سہی، ہے تو اچھی جگہ۔ اب میں سکون سے مر سکوں گی۔"

ٹنڈے نے اپنے بھائیوں کے گھر بار، زمین جائیداد، روپے پیسے اور مویشیوں پر قبضہ جما لیا۔ خُوب صورت عورت تو ملی ہی تھی، اب بے شمار دولت بھی ہاتھ آ گئی۔ ٹنڈا گاؤں کا چودھری بن گیا اور بڑی شان سے گردن اکڑائے، سر اونچا کیے پھرنے لگا۔ ہر وقت مزے کرنے لگا۔

جمعرات ۲۶ر فروری ۲۰۰۹ء

سونے کے بالوں والی عورت

یہ ایک مہماتی کہانی ہے۔ بے حد دل چسپ اور مزے دار۔ اس میں ایک ہیرو ہے، ایک ہیروئن اور ان کا مددگار ایک لمحادیو۔ اس خوب صورت کہانی کا انداز الف لیلہ کی کسی داستان کی مانند ہے۔ یہاں موموکمنی (کٹنی) بھی اپنی پوری آن بان کے ساتھ دکھائی دیتی ہے، جو چودھویں صدی سے سترہویں صدی عیسوی تک کے ہندوستان کا ایک بھرپور اور جاندار کردار تھا۔ کہانی ''گگو ماتا'' میں سونے کے بالوں والا مرد ہے؛ یہاں سونے کے بالوں والی عورت ہے۔

پرانے وقتوں کی بات ہے، کسی گاؤں میں ایک کسان احمد رہتا تھا۔ اُس کے سات بیٹے تھے۔ وہ روزانہ گاؤں کی مسجد میں نماز پڑھنے کے بعد خُدا کے حضور دعا مانگتا کہ اُس کے ساتوں بیٹوں کی شادیاں ایک ہی گھر میں ہوں۔ دوسری طرف ایک اور گاؤں میں ایک کسان اکبر رہتا تھا۔ اس کی سات بیٹیاں تھیں۔ وہ بھی ہر روز گاؤں کی مسجد میں نماز کے بعد دعا مانگتا تھا کہ اس کی ساتوں بیٹیوں کی شادیاں ایک ہی گھر میں ہوں۔ اس زمانے میں کمی (کمین) رشتے ڈھونڈتے تھے۔ جس طرح کا گھر ہوتا، اُس کے لیے اسی طرح کے گھر کا رشتہ تلاش کرتے۔ ایک روز کچھ کمیں اکبر کے پاس آئے۔ اُنھوں نے بتایا کہ احمد کے سات بیٹے ہیں اور وہ ساتوں کو ایک ہی گھر میں بیاہنا چاہتا ہے۔ ادھر اکبر کی بھی یہی تمنا تھی۔ چنانچہ باہمی رضامندی سے وار (دن)، تاریخ متھنے (مقرر کرنے) کا مرحلہ طے ہوا۔ جب جنج (بارات) روانہ ہونے لگی تو فیصلہ ہوا کہ بڑا بھائی جس کا نام ''دَم'' تھا، گھر ہی میں رہے کیونکہ گھر کو خالی چھوڑنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ باپ احمد نے سوچا کہ واپسی پر دم کی دلھن کو ساتھ ہی لیتے آئیں گے اور ان کا نکاح یہیں پڑھوالیں گے۔ اس زمانے میں لوگ پیدل سفر کرتے تھے۔ راستے میں جہاں رات پڑ جاتی، تنبو لگا لیتے۔ بارات کو روانہ کرتے وقت دَم نے کہا کہ ایک بات کا دھیان رکھنا: ''جہاں، جاتے ہوئے رات رہو؛ وہاں، آتے ہوئے رات نہ رہنا۔''

خُوب دھوم دھڑکے، باجے گاجے کے ساتھ برات روانہ ہوئی۔ جاتے ہوئے انھیں ایک فقیر کی بوہڑ (بڑ کا درخت) کے نیچے رات پڑی۔ انھوں نے وہیں رات گزاری۔ صبح سویرے اُٹھ کر پھر سفر کا آغاز کیا۔ آخر اکبر کے گاؤں پہنچے۔ چھ بیٹیوں کے وہیں نکاح پڑھوا دیے گئے۔ وہ چھ کی چھ اپنی ساتویں اور بڑی بہن سے، جس کا سائیں (شوہر) نہیں آیا تھا، کہنے لگیں: ''یقیناً تیرے والا لولا

لنگڑا یا کانا ہوگا، اسی لیے نہیں آیا۔" یہ سُن کر وہ بولی: "جیسا بھی ہوگا، مجھے قبول ہے۔"

واپسی پر، اتفاق ایسا ہوا کہ برات کو دوبارہ اسی بوہڑ کے نیچے رات پڑی۔ انھوں نے دَم کی نصیحت کو بھلا دیا اور وہیں رہ پڑے۔ صبح سویرے ایک کمّیں اُٹھا اور رفع حاجت کے لیے جانے کا ارادہ کیا۔ بوہڑ کے گرد لوہے کا کوٹ (چار دیواری) بنا ہوا تھا۔ ہم راہی بولے: "کِتے[1] منے جا کے پیشاب کرلا۔" (اردو ترجمہ: کہیں جا کے پیشاب کرلو)۔ وہ شخص بولا: "لامھا توں[2] تے لوہے دا کوٹ ہویا اے۔" (اردو ترجمہ: ہر طرف تو لوہے کی چار دیواری بنی ہوئی ہے) آخر ایک جانب سے فقیر کی آواز آئی کہ جس نے بھی رفع حاجت کرنی ہے، وہ ہاتھ کھڑا کردے۔ رہ ڈیہہ جاسی (راستہ مل جائے گا)۔ یہ سُن کر کمّیں نے دونوں بانہیں کھڑی کردیں۔ اسے واقعی لوہے کی چار دیواری میں سے راستہ مل گیا۔ وہ باہر نکلا تو لوہے کا کوٹ پھر اپنی جگہ پر تھا۔ فقیر نے پیچھے سے کمّیں کو آواز دی: "جب تک دَم (ساتواں بھائی) یہاں نہ آیا، لوہے کا کوٹ نہیں ہٹ سکتا اور ساری جنج (برات) یہیں قید رہے گی۔"

کمّیں رفع حاجت کے بعد بھاگم بھاگ دَم کے پاس پہنچا اور سارا قصہ سنایا۔ دم اُس سے کہنے لگا: "میرے ساتھ چلو"۔ کمّیں چوں کہ ڈرا ہوا تھا، بولا: "خود ہی جاؤ، میں نہیں جاسکتا۔" دَم شیر جوان تھا۔ بہادر سُورما۔ وہ اکیلا ہی روانہ ہوگیا۔ جب بوہڑ کے پاس پہنچا تو لوہے کا کوٹ نظر آیا۔ اُس نے بسم اللہ پڑھ کے لوہے کے کوٹ کو ٹھوکر ماری۔ وہ اسی لمحے غائب ہوگیا۔ سارے براتی آزاد ہوگئے۔ فقیر بولا: "سب لوگ جاسکتے ہیں لیکن دَم میری بات سُننے کے بعد جائے گا۔" پوری بارات گھر چلی گئی۔ فقیر دَم سے کہنے لگا: "یہاں سے دُور، بہت دُور سونے کے بالوں والی ایک عورت رہتی ہے۔ اسے ڈھونڈ کر میرے پاس لاؤ۔ ورنہ تمھیں آزادی نہیں ملے گی۔" دَم نے جواب دیا: "مجھے تو اس عورت کا کچھ پتا نہیں کہ وہ کس طرف رہتی ہے؟" فقیر بولا: "سمت میں بتا دیتا ہوں۔ ڈھونڈنا تمھارا کام ہے۔ چڑھدے والے پاسے (مشرق کی طرف، جدھر سے سورج نکلتا ہے) جاؤ۔ وہ سونے کے بالوں والی عورت تمھیں اسی طرف ملے گی۔" یہ سُن کر دَم مشرق کی سمت روانہ ہوگیا۔

جب کئی روز کے انتظار کے بعد بھی دَم واپس نہ آیا تو اُس کے سسرال والے کہنے

[1] کِتے: کہیں، کسی جگہ

[2] لامھا: طرف، سمت، رخ

لگے: ''ہمارے ساتھ داؤں کھیلا گیا ہے۔ ان کے بیٹے چھ ہی تھے۔'' آخر سارے گاؤں والوں نے گواہی دی اور اُنھیں یقین دلایا کہ دَم جلد ہی لوٹ آئے گا۔

دَم چلا جا رہا تھا کہ اسے راستے میں ایک آدمی ملا جو کنوئیں سے بوکے [1] بھر بھر کے بھینس نہلا رہا تھا۔ دَم نے اس سے کہا: ''السلام علیکم'' وہ شخص بولا: ''وعلیکم السلام'' اور لاپروائی سے اپنے کام میں لگا رہا۔ یہ دیکھ کر دَم نے کہا: ''سیدھی طرح سلام تو لے لو۔ میں نے تم سے ایک بات پوچھنی ہے۔'' اس آدمی نے جواب دیا: ''بھینس نہلا لوں، پھر پوچھنا''۔ فارغ ہونے کے بعد وہ بولا: ''اب بتاؤ، کیا بات ہے؟'' دَم نے اُسے ساری کہانی سُنائی اور پھر پُوچھا: ''کیا تم میری کوئی مدد کر سکتے ہو؟'' اس شخص نے کہا: ''مدد میں یہی کر سکتا ہوں کہ اُس عورت کو ڈھونڈنے کے لیے تیرے ساتھ ہی چل پڑتا ہوں، اگا تیرا تے پچھا میرا (آگے تم اور پیچھے میں)۔

دونوں چلے جا رہے تھے، آگے ایک ایالی (چرواہا) بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا۔ ایالی عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔ کبھی پیٹ کے بل لیٹ جاتا تھا اور کبھی کھڑا ہو جاتا تھا۔ دَم نے اسے ''السلام علیکم'' کہا۔ وہ جواب میں ''وعلیکم السلام'' بولا، لیکن اپنا کام کرتا رہا۔ یہ دیکھ کر دَم نے حیرت سے کہا: ''یہ تم نے کیا تماشا بنا رکھا ہے، کبھی پیٹ کے بل لیٹ جاتے ہو، کبھی اُٹھ کے کھڑے ہو جاتے ہو؟'' ایالی بولا: ''یہاں سے سو کوہ (کوس) کی دوری پر میری بہن کی شادی ہو رہی ہے۔ کنجریاں مجرا کر رہی ہیں۔ لوگوں کی ایک بھیڑ ان کے اردگرد جمع ہے۔ جب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں تو میں زمین پر پیٹ کے بل لیٹ کے، لوگوں کی ٹانگوں کے بیچ سے مجرا دیکھتا ہوں۔ جب لوگ بیٹھ جاتے ہیں تو میں کھڑے ہو کر ناچ دیکھتا ہوں۔'' دَم کو اندازہ ہو گیا کہ اس شخص کی نظر غیر معمولی طور پر تیز ہے۔ بعد میں ایالی نے اُن سے اُن کا حال پُوچھا۔ دَم نے ساری بپتا [2] کہہ سنائی۔ ایالی نے اس سے پُوچھا: ''کہاں سے آئے ہو؟ کس کے بیٹے ہو؟'' دَم نے اپنے گاؤں اور اپنے باپ کا نام بتایا۔ سُنتے ہی وہ بولا: ''ارے! تیرا باپ تو میرے باپ کا گہرا دوست تھا۔ اس ناطے تیری مدد کرنا میرا فرض ہے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لیتے جاؤ۔''

دَم، بھینس نہلانے والا اور ایالی تینوں چلے جا رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ آگے ایک شکاری کبوتر پکڑنے کے لیے جال لگائے بیٹھا ہے۔ سلام دعا کے بعد دَم نے اسے ساری کہانی

---

[1] بوکا: ا۔ (مذکر) چمڑے یا ربڑ کا ڈول، چرسا

[2] بپتی: (مونث) مشکل کام، اڑا ہوا کام، مہم

سنائی کہ کیسے فقیر نے ''بُتی ۓ گتی اے'' (اردو ترجمہ: مشکل کام یا مہم میں ڈال رکھا ہے) شکاری نے دَم سے اپنا تعارف کروانے کو کہا۔ جب دَم نے اپنے، اپنے باپ اور اپنے گاؤں کا نام بتایا تو وہ کہنے لگا: ''ارے! تیرا باپ تو میرے باپ کا جگری دوست تھا۔ بس دو کبوتر جال میں آ لینے دو۔ میں بھی تیرے ساتھ ہی چلتا ہوں۔'' غرض دو کبوتر پکڑنے کے بعد شکاری بھی دَم کے ہم راہ چل پڑا۔

دَم، بھینس نہلانے والا، ایالی اور شکاری چاروں چلے جا رہے تھے۔ راستے میں انھیں پیاس لگی۔ دَم ایالی سے کہنے لگا: ''تیری نظر بہت تیز ہے۔ ذرا دیکھ کے بتا، آس پاس کوئی کنواں ہے یا نہیں؟'' ایالی نے تھوڑی دیر سر اونچا کر کے ارد گرد دیکھا، پھر بولا: ''یہاں سے اسی کوہ دور ایک کنواں ہے۔ ٹنڈوں [1] سے پانی نکل کر بہہ رہا ہے۔ رہٹ کی رفتار بہت تیز ہے۔ یہ پتا نہیں چل رہا کہ رہٹ کو بیل چلا رہے ہیں یا کوئی اور؟'' جب وہ چاروں کنوئیں پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ جانور شینہ [2] (سُوَر) ہیں۔ وہ کہنے لگے: ''ہمارے مذہب میں تو سُوَر حرام ہیں۔ اس لیے ہم ان کا نکالا ہوا پانی نہیں پئیں گے۔'' یہ سُن کر دَم آگے بڑھا۔ اس نے سوروں کے آگے آ کر انھیں روک دیا۔ کیوں کہ دَم بے حد طاقت ور اور جسیم تھا۔ اس نے سور آزاد کر دیے اور خود ٹنڈیں چلا کر کنوئیں سے پانی نکالنے لگا۔ پھر چاروں نے پانی پیا اور اپنی پیاس بجھائی۔

چوں کہ سُوَر آزاد ہو گئے تھے۔ رہٹ رک گیا تھا۔ اس لیے نگال [3] کم ہو گیا۔ کنوئیں سے پیلی (کھیت، فصل) تک جانے والے پانی کی مقدار جب کم ہوئی تو پانی وارا (پانی لگانے والا) فکر مند ہوا۔ وہ فوراً کنوئیں پر آیا اور ان چاروں سے کہنے لگا: ''تم لوگوں نے میرے شینہ کیوں چھوڑے؟ تمھیں ایسا کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟'' دَم بولا: ''میرے ساتھیوں نے کبھی شینہ کا نکالا ہوا پانی نہیں پیا۔ اس لیے میں نے انھیں آزاد کر کے خود پانی نکالا۔ ہم تجھ سے معافی مانگتے ہیں''۔ یہ سُن کر پانی وارے نے غصہ تھوک دیا اور کہنے لگا: ''کہاں سے آئے ہو؟ کدھر کا رُخ ہے؟'' دَم نے اپنی رام کہانی سنائی، اپنا تعارف کروایا۔ جب اسے پتا چلا کہ دَم احمد کا پُتر (پوت، بیٹا) ہے، تو پانی وارا بولا: ''ارے! تیرا باپ تو میرے باپ کا لنگوٹیا تھا۔ میں بھی تیرے ساتھ چلتا ہوں۔''

دَم، بھینس نہلانے والا، ایالی، شکاری اور پانی وارا پانچوں چلے جا رہے تھے۔ راستے میں انھیں بھوک لگی۔ وہ کبوتروں کے شکاری سے کہنے لگے: ''تیرے پاس تو دو کبوتر موجود ہیں،

---

[1] ٹنڈ: بڑھنا، مٹی کا برتن جو رہٹ میں کام دیتا ہے۔

[2] شینہ: شینہ کا اصل مطلب تو ''شیر'' ہے لیکن یہاں راوی نے اس سے مراد ''سُوَر'' لی ہے۔

[3] نگال: نالے یا کنوئیں میں سے نکلنے والے پانی کی مقدار، پانی کا بہاؤ، سوکھے ہوئے نالہ میں پانی کا از سرِ نو بہاؤ، جاری پانی کی برابر چلنے والی مقدار۔

کیوں نہ انھیں ذبح کر کے آگ پر سینکیں۔ سب مل کر بوٹی بوٹی کھالیں گے۔ چلو بھوک کی کچھ نہ کچھ تو سہار ہوگی۔" یہ سُن کر شکاری نے فوراً دونوں کبوتر پیش کر دیے۔ انھیں ذبح کیا گیا۔ اب آگ کی ڈھنڈیا پڑی۔ سب ایالی سے کہنے لگے: "تیری نظر بہت تیز ہے۔ تو آگ ڈھونڈ۔" یہ سُن کر ایالی نے سر اونچا کر کے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر بولا: "دُور آگ تو لگی ہوئی ہے۔ دھواں بھی نکل رہا ہے لیکن آگ کے پاس جانے کیا چیز ہے؟ یہ نہیں پتا چلتا۔ کوئی بہت بڑی چیز ہے۔ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔" دَم بھینس نہلانے والے دوست سے کہنے لگا: "تو اکیلا جا اور آگ لے کر آ۔ ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔ جب تُو آگ لائے گا تو ہم آگ مچا کے (جلا کے) کبوتر بھون کر کھائیں گے۔"

بھینس نہلانے والا چلتا چلتا آگ کے پاس پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہ بہت بڑی سی عجیب وغریب چیز دراصل ایک دیو ہے، جو آگ کے قریب بیٹھا ہے۔ جونہی بھینس نہلانے والا، چپکے سے، ایک جلتی ہوئی لکڑی اُٹھانے لگا، دیو نے اسے پکڑ کے اپنے ایک پَٹ (ران) کے نیچے رکھ لیا۔ ادھر چاروں ساتھی انتظار کر رہے تھے۔ جب راہ تکتے تکتے تھک ہار گئے اور وہ نہ پہنچا تو سب سمجھے کہ شاید بھینس نہلانے والا بھاگ گیا، ہمارا ساتھ چھوڑ گیا۔ اب انھوں نے پانی وارے کو آگ لانے کے لیے بھیجا۔ اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ دیو نے اسے بھی پکڑ کے اپنے پَٹ تلے رکھ لیا۔ اُس کے بعد ایالی کو بھیجا گیا۔ اُس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پھر کبوتروں کے شکاری کی باری آئی۔ وہ بھی جا کے واپس نہ آیا۔ آخر دَم خود آگ لینے کے لیے روانہ ہوا۔ آگ کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑا، پہاڑ جیسا دیو لکڑیوں کے جلتے ہوئے ڈھیر کے قریب بیٹھا ہے۔ جونہی دَم ایک جلتی ہوئی لکڑی اُٹھانے لگا، دیو نے اسے پکڑ لیا۔ اُدھر دَم بھی سورما تھا، طاقت میں دیو سے کم نہ تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑا کے دیو کا ہاتھ ایسی مضبوطی سے پکڑا کہ وہ اپنے آپ کو دَم کی گرفت سے نہ چھڑا سکا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ دَم ایک ہاتھ سے ذبح کیے ہوئے کبوتر پکڑے آگ پر بُھون رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے دیو کو پکڑے ہوئے تھا۔ کبوتر بھوننے کے بعد دَم نے دیو کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اُوپر اُٹھایا اور ایسا دُور پھینکا کہ دیو کا جھاڑا (پاخانہ) نکل گیا۔ سیر کو سوا سیر۔ دیو کے نیچے سے دَم کے سارے ساتھی باہر نکلے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ دیکھ کر دَم کہنے لگا:

"ارے! میں آ گیا ہوں۔ کہاں بھاگ رہے ہو؟"

ادھر دیو منّت سماجت پہ اتر آیا، بولا: "مجھے معاف کر دو۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں آج سے تمھارا دوست ہوں۔" یہ سُن کر دَم کہنے لگا: "سلیمان پیغمبر کی قسم کھاؤ کہ تم ہمیں نقصان

نہیں پہنچاؤ گے۔" دیو نے بلا تامّل، اسی لمحے قسم کھائی اور وہ سب اُسے بھی اپنے ساتھ لے کر آگے روانہ ہو گئے۔

چلتے چلتے راستے میں ایک شہر آیا، انھیں بھوک لگ رہی تھی۔ دَم کے پاس ایک مندرنا (مندرا، بڑی، انگوٹھی) تھا۔ جس کی قیمت سوا لاکھ اشرفیاں تھیں۔ دَم اپنے ایک ساتھی سے کہنے لگا: "ہم یہیں جنگل میں ٹھہرتے ہیں۔ تم یہ مندرنا لے کر شہر جاؤ۔ اسے بیچ کے روٹی لے آؤ۔" یہ دیکھ کر دیو نے کہا: "میں شہر جاتا ہوں اور مندرنا بیچ کر روٹی لاتا ہوں۔" دَم بولا: "نہ بابا نہ، تو ضرور کوئی شرارت کرے گا۔ تو تور ہنے ہی دے۔" لیکن جب دیو نے بہت اصرار کیا تو دَم نے اس کی بات مان لی۔

دیو شہر میں پہنچا تو سارا شہر اسے دیکھنے کے لیے امنڈ پڑا۔ لوگ دیدے پھاڑے، بِٹر بِٹر (ٹکر ٹکر) دیکھ رہے تھے۔ دیو چلتے چلتے شہر کی سب سے بڑی دکان پہ پہنچا۔ شاہوکار (ساہوکار) سے کہنے لگا: "یہ مندرنا لے لو اور اُس کے بدلے میں مجھے کچا راشن[ے] دے دو۔" دکان دار بولا: "تیرا مندرنا تو بے حد قیمتی ہے۔ اٹھایوں کر دکان سے جتنا سامان اُٹھا سکتا ہے، اُٹھا لے۔" یہ سُن کر دیو نے کہا: "لو اگر یہ بات ہے تو تُو دکان سے باہر نکل آ"۔ دکان دار حیرت سے بولا: "کیوں؟" دیو نے جواب دیا: "تا کہ جتنا سودا میں اُٹھا سکتا ہوں، اُٹھا لوں۔" یہ سُن کر شاہوکار دکان سے باہر نکل آیا۔ دیو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، آن کی آن میں پوری دکان زمین سے اُکھاڑ کے ہتھیلی پر رکھ لی۔ یہ دیکھ کر شاہوکار شور مچانے لگا: "ارے! بچاؤ، بچاؤ، میں لُٹ گیا، میں برباد ہو گیا۔ یہ بلا میری پوری دکان اٹھائے لیے جا رہی ہے۔" لوگ بھاگے بھاگے مدد کو آئے۔ شہر والوں نے زمین سے پتھر اُٹھا اُٹھا کے دیو کو مارنے شروع کر دیے۔ مگر دیو پر ان کا کیا اثر؟ اس کے لیے تو یہ پتھر ریت کے ذرّوں کی مانند تھے۔ وہ چپ چاپ شاہوکار کی دُکان اُٹھائے چلتا رہا۔ جب شہر والوں نے اپنی کوششیں بے اثر دیکھیں تو بھاگم بھاگ اپنے بادشاہ کو بُلا لائے۔ بادشاہ نے دیو کے آگے کھڑے ہو کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ دیو نے زمین میں اپنا پاؤں گھسیڑ کر ایک گڑھا کھودا۔ اس کے بعد بادشاہ کو اُٹھایا اور اس گڑھے میں کھڑا کر کے سینے تک مٹی میں دبا دیا۔ بادشاہ آہ و زاری کرنے لگا، منّت سماجت کرنے لگا۔ بولا: "میری چار بیٹیاں ہیں۔ تم ان سے شادی کر لو۔ مگر خُدا کے لیے مجھے یہاں سے باہر نکالو۔" دیو کہنے لگا: "دیکھو، تم نے مجھے زبان دے دی ہے۔ اب اپنی بات پر پکا رہنا۔" یہ کہہ کر اس نے بادشاہ کو زمین میں سے نکالا اور کہا: "فوراً نائی بھیج۔ دیگیں بھیج۔

ے کچا راشن: آٹا، دال، چاول جو پکا ہوا نہ ہو۔

اپنی چاروں بیٹیوں کو لے کر جنگل میں پہنچ ۔ وہاں میرے دوست انتظار کر رہے ہیں۔'' نائی پہنچ گئے۔ دیگیں آ گئیں۔ دیگیں پکنے لگیں۔ دَم اور اُس کے چاروں ساتھی تو ایک دیگ ہی سے سیر ہو گئے۔ باقی کی تمام دیگیں دیو نے کھائیں۔ پھر بھی پیٹ نہ بھرا تو چھ سات گائیں کچی پکی پکا کے ہڑپ کر گیا۔ اتنے میں بادشاہ بھی اپنی چاروں حسین و جمیل بیٹیوں کو لے کر پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر دَم نے دیو سے کہا: ''تُو نے تو کہا تھا کہ میں کوئی شرارت نہیں کروں گا۔ اب بتا، یہ شرارت نہیں تو اور کیا ہے۔'' دیو بولا: ''اس میں میرا کوئی قصور نہیں''۔ پھر اس نے الف سے ی تک ساری کہانی دَم کو سنا ڈالی۔ آخر میں دم کہنے لگا: ''اب ان شہزادیوں کا کیا کریں؟'' دیو بولا: ''کرنا کیا ہے، اپنے چاروں دوستوں سے ان چاروں کی شادی کر دو۔'' دَم کو یہ تجویز پسند آئی۔ فوراً نکاح خواں کو بلا کے بھینس نہلانے والے، ایالی، کبوتروں کے شکاری اور پانی وارے سے چاروں شہزادیوں کا نکاح پڑھوایا گیا۔ جب یہ رسم انجام کو پہنچی تو دیو دَم سے کہنے لگا: ''اب یہ چاروں شادی شدہ ہو گئے ہیں، ہم انھیں کہاں ساتھ ساتھ لیے پھریں گے۔ انھیں خوشی خوشی اپنی زندگی گزارنے دو اور واپس بھیج دو۔ ہم دونوں ہی سونے کے بالوں والی عورت کو ڈھونڈ نکالیں گے۔''

دَم نے اپنے چاروں دوستوں کو اپنی اپنی پری جمال بیویوں کی معیت میں واپس بھیج دیا۔ اُس کے بعد دیو نے دَم سے کہا: ''اب تم یہاں بیٹھو۔ میرا انتظار کرو۔ میں خود ہی اُڑ کے جاتا ہوں اور اس عورت کو تلاش کر کے لاتا ہوں۔'' پھر دیو ہوا میں اڑنے لگا۔ گھنے جنگل، اونچے پہاڑ، سبز کھیت اُس کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ آخر ایک دریا آیا۔ دریا سے کچھ دُور، جنگل میں ایک کوٹھا تھا۔ اسی کوٹھے میں سونے کے بالوں والی عورت اکیلی رہتی تھی۔ دیو نے اُڑتے اُڑتے اس جگہ کے کئی چکر لگائے اور سارا جائزہ لے کر اسی طرح اڑتا ہوا واپس آ گیا۔ دَم سے کہنے لگا: ''میں سب پتا کر آیا ہوں۔ اپنی آنکھیں میچ لو۔ میرے ساتھ لپٹ جاؤ۔ میں تمھیں، اُڑا کے، وہاں لے جاتا ہوں۔'' دم نے ایسا ہی کیا اور دیو اُڑا کے اُسے سونے کے بالوں والی عورت کے پاس لے آیا۔ عورت دَم کو دیکھ کر پہلے تو کِھل کھلا کے ہنسی اور پھر ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ دَم نے وجہ پُوچھی تو بولی: ''ہنسی میں اس لیے ہوں کہ ایک عرصے بعد اپنے جیسے آدم زاد کو دیکھا ہے اور روئی اس لیے ہوں کہ میں ایک دیو کی قید میں ہوں۔ وہ مجھ پر عاشق ہے۔ روز میرے پاس آتا ہے۔ مجھے دیکھتا ہے۔ پھر کھانے پینے کی مزے مزے کی چیزیں دے کر چلا جاتا ہے۔ اگر آس پاس کوئی آدم زاد ملے تو اسے پکڑ کے کچا چبا جاتا ہے۔'' یہ سُن کر دَم نے کہا: ''دیو اس وقت کہاں ہے؟'' عورت

بولی: ''اُدھر پرے باغ میں سویا ہوا ہے۔''

دم نے تلوار میان سے نکالی اور باغ میں جا پہنچا۔ سامنے ایک پہاڑ جیسا دیو زمین پر لیٹا سو رہا تھا۔ اُس کے خراٹے ایسے تھے جیسے بادل گرج رہے ہوں۔ دم نے اپنی تلوار کی نوک سے اسے چھُوا اور للکار کے کہنے لگا: ''اوئے مُرلی دیا گالھڑا[1] اُٹھ، دیکھ آج پہلی بار تیرے مقابلے میں کوئی مرد آیا ہے۔ اُٹھ، اُٹھ کے میرے ساتھ لڑائی لڑ۔'' دیو اسی طرح لیٹے لیٹے، ذرا سی آنکھ کھول کے بولا: ''مجھے سونے دے، تُو تو میرا ناشتہ ہے۔'' دَم ویسے ہی للکار کے بولا: ''ناشتہ بعد میں کرنا۔ پہلے مجھ سے کشتی لڑ۔'' یہ سُن کر دیو کو بھی غصہ آ گیا۔ وہ پھنکارتا، آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ دیو نے سو من کا ایک پتھر اُٹھایا اور دَم کو دے مارا۔ دَم فوراً ایک طرف ہو گیا اور پتھر تلے کچلے جانے سے بچ گیا۔ اب وار کرنے کی باری دَم کی تھی۔ اس نے دیو کے سر پہ وار کیا اور تلوار کی دھار اس کا سر، چہرہ، گردن، سینہ اور پیٹ چیرتی ہوئی گزر گئی۔ دیو بیچ میں سے آدھا آدھا ہو گیا؛ دو برابر حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ دیو دَم سے مخاطب ہوا: ''مجھ پر وار کر۔'' دَم نے جواب دیا: ''تو ذرا قدم تو اُٹھا۔'' یونہی دیو نے قدم اُٹھایا، آدھا ایک طرف کو گر گیا اور آدھا دوسری طرف کو۔ واقعی: ''لوہے نوں لوہا کٹدا اے۔''[2] دَم کا دوست دیو اُس وقت انسانی شکل میں تھا۔ اُس نے دیکھا کہ مُردہ دیو کے ہاتھ کی ایک اُنگلی میں بے حد حسین مُندری ہے۔ مُندری میں ایک بیش بہا ہیرا چمک رہا ہے۔ دیو نے اس کا ہاتھ اُٹھایا، اُنگلی اپنے مُنہ میں ڈالی، پھر اپنے دانتوں کی مدد سے مُندری اُنگلی سے اُتاری اور اُتار کر اپنے ہاتھ کی اُنگلی میں پہن لی۔

اس مہم کو سر کرنے کے بعد وہ دونوں سونے کے بالوں والی عورت کے پاس پہنچے۔ اسے دیو کی مُندری دکھائی اور کہا کہ ہم دیو کو مار آئے ہیں۔ سونے کے بالوں والی عورت یہ سُن کر بہت خوش ہوئی۔ دَم نے اس سے کہا: ''اب ہمارے ساتھ چل۔'' عورت بولی: ''اس سال مجھے یہیں رہنے دو۔ تم دونوں بھی میرے ساتھ رہو۔ اگلے سال ہم تینوں جائیں گے۔'' یہ سُن کر دیو بھی کہنے لگا: ''ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔ میں بھی پچھلے سال کا جاگا ہوا ہوں۔ اس سال میں نے سونا ہے۔ میری بھی نیندر (نیند) پوری ہو جائے گی۔'' غرض دیو نے تو وہیں لمبی تان لی اور خوابِ خرگوش کے مزے لُوٹنے لگا۔ دَم ہر روز بَن سے شکار کر کے لاتا۔ کبھی ہرن تو کبھی بٹیرے (بٹیر)۔ عورت پکاتی۔ خود

---

[1] ''مرلی'' ہندی میں ''بانسری'' کو کہتے ہیں۔ گالھڑ پنجابی میں ''نر گلہری یا گلہڑا''۔

[2] اُردو ترجمہ: لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ یعنی طاقت ہی طاقت کو بس میں کرتی ہے۔ طاقت والا ہی طاقت والے پر فتح پاتا ہے۔

کھاتی، دُم کو کھلاتی۔ نہ فکر، نہ فاقہ۔ زندگی مزے سے گزر رہی تھی۔

سونے کے بالوں والی عورت ہر صبح، پَو پھٹتے سے نہانے کے لیے دریا پر جاتی۔ کنارے پر اُگے درختوں کے ایک جُھنڈ کی اوٹ میں جا کر غسل کرتی۔ جب ٹخنوں تک لٹکے ہوئے اپنے لمبے، گھنے، سنہری بالوں کو دھوتی تو سونے کے چند بال ٹوٹ کے وہیں گر جاتے۔ ایک روز، ایک مچھلی نے سونے کے بال کھا لیے۔ چند دن بعد، حُسنِ اتفاق سے وہ مچھلی ایک غریب ماہی گیر کے جال میں پھنس گئی۔ مچھلی اتنی بڑی تھی کہ ماہی گیر کو ایک گھوڑے پر لادنی پڑی۔ پھر بھی آدھی مچھلی گھوڑے پر تھی اور آدھی نیچے زمین پر۔ جب ماہی گیر گھوڑا لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا، تو مچھلی زمین پر گھسٹتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ گھر آ کر جونہی مچھیرے نے مچھلی کا پیٹ چاک کیا، اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پیٹ کے اندر سونے کے بال چمک رہے تھے۔ اس نے جھٹ پٹ بال باہر نکالے۔ بیوی کو دکھائے تو اس کی بھی آنکھیں کُھل گئیں۔ مچھیرے نے مچھیرن سے مشورہ کیا کہ اب ان بالوں کا کیا کیا جائے۔ وہ بولی: ”فوراً راجے کے دربار میں لے جاؤ۔ وہ تمھیں بہت بھاری انعام دے گا۔“

ماہی گیر ہنستا گاتا راجے کے دربار میں پہنچا۔ آداب بجا لایا۔ جونہی رُوبرُو سونے کے بال پیش کیے، راجا بھی دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے فوراً شاہی جوتشی کو طلب کیا اور حکم دیا: ”پتا چلاؤ، یہ سونے کے بال کس کے ہیں؟“ نجومی نے کچھ دیر اپنے علم کی مدد سے حساب کتاب لگایا، پھر بولا: ”حضور! یہ ایک نہایت حسین عورت کے بال ہیں۔ سچ پوچھیے تو وہ عورت فقط آپ ہی کے لائق ہے۔ اُس کے آنے سے آپ کا محل جگ مگ جگ مگ کرنے لگے گا۔“ راجے کے دل میں حسیں آرزوئیں انگڑائیاں لینے لگیں، پیاری پیاری اُمیدیں چٹکیاں بھرنے لگیں۔ اس نے گرج کر مچھیرے سے پُوچھا: ”اگر اپنی خیر چاہتے ہو، تو سچ سچ بتاؤ تم یہ سونے کے بال کہاں سے لائے؟ یاد رکھو اگر جھوٹ بولا تو سر تن سے جُدا کر دوں گا۔“ نیکی برباد، گناہ لازم۔ بچارہ مچھیرا انعام کی آس میں آیا تھا اور یہاں مصیبت گلے پڑ گئی۔ اس نے خُدا رسول کی قسم کھا کر کہا کہ یہ سونے کے بال اسے ایک مچھلی کے پیٹ سے ملے ہیں، لیکن راجے کو یقین نہ آیا۔ وہ غُصّے میں لال ہو گیا۔ تخت سے اُٹھا، تلوار میان سے نکالی اور آن کی آن میں مچھیرے کا سر قلم کر دیا۔

اب راجے نے اپنے امیروں، وزیروں سے مشورہ کیا۔ سب کی رائے یہی تھی کہ ماہی گیر کی بیوی کو طلب کیا جائے، اس سے پُوچھا جائے۔ مچھیرن بچاری ہانپتی کانپتی دربار میں

پہنچی۔ اُس نے بھی اپنے شوہر، جواب مرحوم ہو چکا تھا، کے بیان کی تصدیق کی کہ واقعی یہ سونے کے بال ایک مچھلی کے پیٹ سے نکلے ہیں۔ جہاں دیدہ درباریوں نے راجے سے کہا: ''حضور! یقیناً سونے کے بالوں والی عورت وہیں دریا کے آس پاس ہی رہتی ہوگی۔'' راجے نے اسی لمحے تین مومو ٹھگنیوں (کٹنیوں) کو طلب کیا۔ جونہی تینوں چاتر عورتیں دربار میں پہنچیں، اس نے انھیں اپنی اپنی خصوصیت بتانے کا حکم دیا۔ پہلی مومو ٹھگنی بولی: ''میں اسمان دی ٹا کی پھاڑ سکدی آں، پر سی نہیں سکدی۔'' (اردو ترجمہ: میں آسمان میں تھگلی لگا سکتی ہوں، مگر سی نہیں سکتی۔ مراد ہے: میں کمالِ عیاری سے کام تو نکال سکتی ہوں لیکن بعد میں پردہ نہیں ڈھانک سکتی)

اب دوسری مومو ٹھگنی آگے بڑھی اور بولی: ''میں اسمان دی ٹاکی سی سکدی آں، پھاڑ نہیں سکدی۔'' (اردو ترجمہ: میں آسمان میں چھید سی سکتی ہوں، مگر آسمان میں چھید کر نہیں سکتی۔ مراد ہے: میں مکاری سے کام نکالنے میں تو صفر ہوں لیکن بعد میں پردہ ڈھانکنا خوب آتا ہے۔)

اب تیسری اور آخری مومو ٹھگنی کی باری تھی۔ وہ سب میں بوڑھی تھی۔ بڑے دھڑلے سے آگے آئی اور بولی: ''میں اسمان دی ٹاکی پھاڑ وی سکدی آں، تے سی وی سکدی آں'' (اردو ترجمہ: میں آسمان میں تھگلی لگا بھی سکتی ہوں اور سی بھی سکتی ہوں۔ مراد ہے میں مکر سے کام نکالنے میں بھی یدِ طُولیٰ رکھتی ہوں اور بعد ازاں پردہ ڈھانکنے میں بھی مہارتِ تامہ حاصل ہے۔ گویا ہر طرح سے کامل کٹنی ہوں۔)

راجے نے سُنا تو تالیاں بجانے لگا۔ خوشی سے کِھلے جا رہا تھا۔ بولا: ''اے زنِ پیر زال! تیرے ہی ہاتھوں میرے سپنے سچ ہوں گے۔ جو تو میرے سپنوں کی رانی، سونے کے بالوں والی عورت کو مجھ سے ملا دے تو تجھے سونے میں پیلی، موتیوں میں سفید کر دوں گا۔'' بوڑھی کٹنی کے مشورے سے راجے نے اپنے نوکر چاکر، بڑی تعداد میں، دریا کے کنارے کنارے پھیلا دیے کہ جہاں کہیں سونے کے بال گرے پائیں، فی الفور اسے خبر کریں۔ آخر ایک دن ایک نوکر خوش خوش دربار میں پہنچا اُس کے ہاتھ میں سونے کے چند بال تھے۔ اس نے اس جگہ کی نشاندہی بھی کر دی، جہاں سے یہ بال ہاتھ آئے تھے۔ بادشاہ نے اسے گراں بہا انعام و اکرام سے نوازا۔

اب مومو ٹھگنی کی باری تھی کہ وہ اپنے فن کا کمال دکھائے۔ اس نے راجے سے عرض کی: ''حضور! مجھے ایک ایسا جہاز بنوا کے دیجیے کہ کھڑے ہوئے کا بھی پتا نہ چلے اور چلتے ہوئے کا بھی پتا نہ چلے۔'' مطلب یہ تھا کہ جہاز اس قدر وزنی ہو کہ دریا کی لہروں سے نہ ہلے۔ راجے نے اسی

وقت جہاز بنانے کا حکم دیا۔ تھوڑی سی مدت میں ملک کے بہترین ترکھانوں (بڑھیوں) نے دن رات ایک کر کے بالکل ویسا ہی جہاز بنا ڈالا، جیسا کٹنی کی خواہش تھی۔

موموٹھگنی شاہی خادموں اور ملاحوں کو ساتھ لے کر جہاز میں سوار ہوئی۔ ملاحوں نے بادبان کھینچے لنگر اُٹھائے اور جہاز اپنے پہلے سمندری سفر پر روانہ ہو گیا۔ دھیرے دھیرے جہاز دریا کے کنارے واقع اس مقام پہ پہنچ گیا، جہاں سونے کے بالوں والی عورت اپنا سر دھوتی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی، جس کی نشاندہی شاہی نوکرنے کی تھی۔ ملاحوں نے دیکھا کہ واقعی وہاں سونے کے بال گرے ہوئے ہیں۔ سب کو یقین ہو گیا کہ یہیں وہ حسینہ آتی ہے۔ ملاحوں نے دریا کے کنارے، کِلّے (کھونٹا، بڑی کیل) ٹھوک دیے۔ موٹے موٹے رسوں کی مدد سے جہاز کلّوں سے باندھ دیا۔ ریتلی زمین پر جگہ جگہ سونے کے بالوں والی عورت کے کُھرے (پاؤں کے نشان) لگے ہوئے تھے۔ موموٹھگنی نے گلے میں تسبیحیں ڈالیں، ہاتھ میں زمزمیاں، مدینے کی کھجوریں، خاکِ شفا اور خانہ کعبہ کے غلاف کا ٹکڑا لیا۔ جوگن کا بھیس بدلا، کھُروں پر چلتی ہوئی اس مکان تک آ پہنچی، جہاں سونے کے بالوں والی عورت رہتی تھی اور جو اس جنگل ویرانے میں تنِ تنہا کھڑا تھا۔ دروازے پہ دستک دی۔ اسی حسینہ نے دروازہ کھولا۔ موموٹھگنی نے پوچھا: ”بچہ! تو اس جنگل بیاباں میں کہاں سے آئی؟“ سونے کے بالوں والی عورت نے جواب دیا: ”لتاں! مجھے کچھ پتا نہیں میں کون ہوں؟ میرے ماں باپ کون تھے؟ میں کس دیس سے آئی؟ ہاں، بس اتنا پتا ہے کہ بچپن میں مجھے ایک دیو اُٹھا کے یہاں لایا تھا۔“ اتنا سننے کی دیر تھی کہ موموٹھگنی یہ کہتے ہوئے اس سے لپٹ گئی: ”ہائے ہائے! میری بیٹی۔ ذرا سی تھی، جب چھوڑ کے گئی تھی۔ اب دیکھو تو کتنی جوان ہو گئی ہے۔ بیس برس پہلے حج پر گئی تھی، تجھے خُدا کو سونپ کر۔ کیا خبر تھی، پیچھے سے تجھے دیو اُٹھا کے لے جائے گا۔ خیر، قربان جایئے پیدا کرنے والے کے۔ اُس کے رنگ نیارے۔ اُس کے بھید وہی جانے۔ دیکھو تو آج کیسے ماں بیٹی کا ملن کروایا ہے۔ ہائے میری پھول سی بچی، کیسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے۔ مجھے نہیں پہچانتی کیا؟ ہے ہے! میں تیری ماں ہوں۔“ اتنا کہہ کے موموٹھگنی اس کی بلائیں لینے لگی۔ سونے کے بالوں والی عورت تو ہکا بکا رہ گئی۔ حیرت کے مارے اُس کے مُنہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا کہ یوں اچانک، بیٹھے بٹھائے اس کی ماں کہاں سے پیدا ہو گئی۔ پہلے تو اس نے اسے اپنی ماں ماننے سے انکار کیا لیکن اس والہانہ محبت اور وارفتگی کو دیکھ کر آخر اسے یقین کرنا ہی پڑا۔ بولی: ”چلو ٹھیک ہے۔ اگر تو میری ماں ہے تو یہاں ہمارے پاس ہی رہو۔“ یہی تو کٹنی کے دل کی بات

تھی۔اس نے جھوٹ موٹ کی ماں بن کر بیٹی کے ہاں رہنا شروع کر دیا۔

موموٹھگنی کو وہاں رہتے ایک ماہ گزر گیا۔ایک دن باتوں باتوں میں ہنستے ہنستے وہ دَم سے پُوچھنے لگی: ''بیٹا! میں صدقے، میں واری، ایک بات تو بتاؤ، میرے مُنہ میں خاک، تم نے مرنا بھی ہے یا نہیں مرنا؟'' دَم بولا: ''میری موت کا تو رب کو پتا ہے۔ میں نے کیسے مرنا ہے؟ اور کب مرنا ہے؟ یہ تو سچّا رب ہی جانے۔ ہاں، جب میری تلوار کو زنگ لگے گا، تب میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔'' یہ راز جاننے کے بعد کٹنی آنکھ بچا کے جنگل میں گئی اور جنگلی جانوروں کا کیا ہوا گوہا (گوبر) چادر میں چھپا کے لے آئی۔ گھر آ کے اس نے اس سوکھے ہوئے گوہے کو جلایا، اس کی سواہ (راکھ، خاکستر) بنائی۔ پھر دَم کی تیز دھار والی چمکتی ہوئی تلوار چرائی اور سواہ میں ڈال دی۔لوہے کو سواہ کے اندر جلدی زنگ لگ جاتا ہے۔ چناں چہ سواہ میں رکھنے کی دیر تھی، ادھر تلوار کو زنگ لگنا شروع ہو گیا اور ادھر دم پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔

ایک روز کٹنی اور سونے کے بالوں والی عورت دریا پر کپڑے دھونے کے لیے گئیں۔ دریا میں بہت شان دار جہاز کھڑا نظر آیا۔سونے کے بالوں والی عورت نے زندگی میں پہلی بار جہاز دیکھا تھا۔وہ بہت حیرت اور اشتیاق سے اسے دیکھنے لگی۔کٹنی مکر سے مسکراتے ہوئے بولی: ''آجا، ہم دونوں ماں بیٹی اندر جا کر جہاز کو دیکھتی ہیں۔ باہر سے تو شان دار ہے ہی، دیکھیں تو سہی اندر سے کیسا ہے۔ یقیناً زیادہ خُوب صُورت ہوگا۔'' سونے کے بالوں والی عورت ایک عالمِ محویّت میں تھی۔اُس کے قدم خود بخود جہاز کی طرف اٹھنے لگے۔ کٹنی دِل ہی دِل میں ہنستی ہوئی، دھیمے دھیمے چلتی ہوئی اسے ساتھ لے کر جہاز میں پہنچ گئی۔اُدھر سونے کے بالوں والی عورت دنیا و مافیہا سے بے خبر جہاز کی اندرونی آرائش و زیبائش دیکھنے میں منہمک تھی۔کٹنی نے اسے اب ایک کھاٹ پر بٹھا دیا تھا۔ادھر اس نے ملاّحوں کو پہلے سے سمجھایا ہوا تھا کہ جونہی ہم دونوں جہاز کے اندر آ کے بیٹھیں، تم لنگر اُٹھا لینا۔سوانھوں نے ایسا ہی کیا۔جہاز دریا کی لہروں پر چلنے لگا۔چونکہ کاریگر نے جہاز ایسا بنایا تھا کہ نہ کھڑے ہوئے کا پتا چلتا تھا اور نہ چلتے ہوئے کا، اس لیے سونے کے بالوں والی عورت کو قطعاً احساس نہ ہوا کہ وہ سطحِ آب پر رواں دواں ہے۔اس پر طرّہ یہ کہ موموٹھگنی نے اسے باتوں میں لگا لیا: ''بیٹی! جہاز اندر سے کیسا ٹھنڈا ٹھنڈا ہے۔ ہم یہاں چند لمحے بیٹھ کے آرام کرتی ہیں۔ دو چار تو کپڑے ہیں، جو ہم نے دھونے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد جب وہ جہاز سے باہر نکلیں تو سونے کے بالوں والی عورت کی آنکھیں

کھلیں۔ پکار کے کہنے لگی: ''اماں! اماں! یہ جگہ تو کوئی اور ہے، یہ تو وہ نہیں ہے۔'' کٹنی بولی: ''نہیں نہیں، بیٹی! تم بھول رہی ہو۔ یہ تو وہی جگہ ہے۔'' سونے کے بالوں والی عورت پھر پکاری: ''میں پاگل تو نہیں ہوں۔ تم ضرور مجھے کسی اور جگہ لے آئی ہو''۔ وہ اڑی وڑی (ضد) کرنے لگی کہ تم مجھے وہیں واپس چھوڑ کر آؤں۔ اس پر مومو ٹھگنی غُصّے میں آ گئی اور اس نے جہاز پر موجود شاہی نوکروں کو کڑک کے حکم دیا: ''اُٹھاؤ اس رنڈی کو اور لے چلو راجے کے پاس۔ میں بھی دیکھتی ہوں، اب یہ کیسے بچتی ہے۔'' بس حکم کی دیر تھی، ایک ہٹے کٹے نوکر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ پٹ سونے کے بالوں والی عورت کو اُٹھا کے کاندھے پہ رکھا اور یہ جا، وہ جا۔ بے چاری نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، چیخی چلاّئی مگر کچھ پیش نہ گئی۔ گرانڈیل ملازم نے ناک کی سیدھ، دربار میں لے جا کے راجے کے تخت کے سامنے جا اُتارا۔ راجے نے اس عورت کا حُسن دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ بے اختیار سوچنے لگا کہ کہیں یہ جنّت کی کوئی حور تو نہیں۔ میں نے تو اپنی ساری زندگی میں اس جیسی حسین کوئی اور زنانی نہیں دیکھی۔ راجا فوراً دل کی بات زبان پر لے آیا اور بولا: ''اے اپسرا! میں تم سے شادی کا خواہش مند ہوں۔ میں تمھیں اپنی رانی بنانا چاہتا ہوں۔'' سونے کے بالوں والی عورت نے جب اپنے آپ کو یوں بے بس پایا، مومو ٹھگنی کی حقیقت کو پہچانا، تو اسے اپنی بے وقوفی پر بے حد افسوس ہوا مگر اب پچھتائے کیا ہووت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ تاہم اس نے خود کو سنبھالا۔ ادھر راجے نے اپنا سوال دوہرایا۔ سونے کے بالوں والی عورت کچھ سوچ کر بولی: ''میرا ایک عہد ہے۔ جب وہ پورا ہو جائے گا، میں بلا تاخیر تم سے شادی کر لوں گی۔'' راجے نے پُوچھا: ''کیا عہد ہے؟'' عورت نے جواب دیا: ''جب تک میرے تن کے کپڑے نہیں پھٹیں گے، میں تم سے بیاہ نہیں کروں گی۔'' راجا خوش ہو کر بولا: ''مجھے منظور ہے۔'' اس نے من میں سوچا: ''آج نہیں تو کل، کپڑے تو آخر ایک دن پھٹنے ہیں۔ کپڑوں کا ایک جوڑا بھلا کتنے دن نکالے گا۔ ایک نہیں تو دو مہینے، اور چھٹی۔ جیسے یہ راضی، ویسے ہم راضی۔ اب ہاتھ آ گئی ہے تو جائے گی کہاں۔ جب کپڑے پھٹیں گے، تب شادی کر لیں گے۔'' یوں سونے کے بالوں والی عورت اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔ اس نے اچھی گھڑی کے انتظار میں وقت حاصل کر لیا۔

دوسری طرف دیو کے جاگنے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ اُٹھ کے بیٹھ گیا اور آنکھیں ملتا ہوا چل پڑا۔ چلتے چلتے دیو کو اس جگہ ٹھڈا (ٹھوکر) لگا، جہاں مومو ٹھگنی نے دَم کی تلوار سواہ میں چھپا رکھی تھی۔ اس نے تلوار سواہ سے نکالی، دیکھا کہ اسے تو زنگال (زنگ) لگا ہوا ہے۔ دیو جانتا تھا کہ اس

تلوار سے دم کی لگن ہے۔ اس نے تلوار کو ہاتھ سے ملنا شروع کر دیا، تاکہ زنگ اُتر جائے۔ سب سے پہلے دَم کا انگوٹھا ہلا۔ غرض جُوں جُوں زنگ اترتا گیا، تُوں تُوں اُس کے جسم کے اعضا حرکت کرنے لگے۔ اور جب تلوار چمکنے لگے، دَم مکمل طور پر ہوش میں آ کر بیٹھ چکا تھا۔ دیو نے اِدھر اُدھر دیکھا، جب سونے کے بالوں والی عورت کہیں نظر نہ آئی تو دم سے پُوچھنے لگا: ''تو نے وہ عورت کہاں بھیج دی؟'' دَم بولا: ''یار! مجھے تو کچھ پتا نہیں۔ ایک مائی آئی تھی۔ اس سے کہتی تھی: میں تیری ماں ہوں۔ یقیناً وہی کہیں لے گئی ہوگی۔'' دیو کہنے لگا: ''کوئی بات نہیں میں ابھی اس کا پتا کرتا ہوں۔'' اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دیو ہوا میں اُڑنے لگا۔

دیو اُڑتا اُڑتا اسی بادشاہی میں جا پہنچا، جہاں سونے کے بالوں والی عورت کو اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ اب دیو راج دھانی پر اڑ رہا تھا۔ نیچے وہ محل دکھائی دے رہا تھا، جہاں عورت قید تھی۔ دیو کاں (کوّا) بن کر اس محل کی دیوار پر جا بیٹھا اور کائیں کائیں کرنے لگا۔ عورت کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ دیو، میری مدد کے لیے آ گیا ہے۔ وہ صحن میں آ گئی اور کوّے کو اشارے سے سمجھانے لگی کہ نیچے میرے پاس آ۔ کاں دیوار سے اُڑا اور عورت کے پاس آ بیٹھا۔ سونے کے بالوں والی عورت اس سے پُوچھنے لگی: ''کیا تجھے بھوک لگی ہے؟'' کاں بولا: ''ہاں لگی ہے۔'' وہ تین چار پراتوں میں گھی شکر اور مکئی کی روٹی سے ''چوری'' کوٹ کے لائی۔ کاں، جو اصل میں دیو تھا، دو تین لقموں میں چٹ کر گیا اور بولا: ''اس سے تو میرا کُچھ نہیں بنا، مجھے تو ابھی تک بھوک لگی ہے۔'' سونے کے بالوں والی عورت مسکرائی، سمجھ گئی اور بولی: ''یہاں محل میں راجے کا ایک کمرہ ہے، اس میں کھل ؎ پڑی ہوئی ہے۔ جا اور پیٹ بھر کے کھا۔'' کاں اس کمرے میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے اصل روپ میں باہر نکلا اور پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولا: ''اب کچھ آسرا ہوا ہے۔'' اُس کے بعد دیو نے چند ڈکار لیے اور سونے کے بالوں والی عورت سے یوں مخاطب ہوا: ''تو راجے سے کہہ، چاہے کپڑے پھٹیں یا نہ پھٹیں، میں تیرے ساتھ بیاہ کے لیے تیار ہوں۔ جب راجا راضی ہو جائے تو کہنا: ہم نے شادی کے موقع پر خوشی کے گون (گیت) کڈھنے (نکالنے یہاں مراد ہے: گانے) ہیں۔ پھر تُو راجے کی بیٹیوں اور مکار مائی کو لے کر ایک کمرے میں گھس جانا۔ دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کر لینا اور گون گانے شروع کر دینا۔ اُس کے بعد میں جانوں اور میرا کام۔''

سونے کے بالوں والی عورت نے اسی طرح کیا۔ جب راجے کو پتا چلا کہ وہ جھٹ

؎ کھل: (ہندی۔ مونث) تیل نکالی ہوئی سرسوں، تل وغیرہ کا پھوک، کھلی

منگنی، پٹ بیاہ کے لیے تیار ہے تو پھولا نہ سمایا۔ فوراً شادی کی تیاریوں کا حکم صادر فرمایا۔ جس طرح دیو نے سمجھایا تھا، عین اُس کے مطابق سونے کے بالوں والی عورت شادی کے گیت گانے کے بہانے راجہ کی بیٹیوں اور موموٹھگنی سمیت شادی میں شریک ساری کی ساری عورتوں کو کمرے میں لے گئی۔ اندر سے دروازے کی چٹخنی چڑھادی۔ ڈھولکی بجنے لگی، گیت گائے جانے لگے۔ جب رات بھیگ گئی، دیو آیا اور جھٹ پٹ پُورا کمرہ اُٹھا کے ہوا میں اُڑنا شروع کردیا۔ جب کمرہ ہلنے لگا تو اندر بند عورتیں ڈر کے مارے چیخنے لگیں۔ دیو، روتی پیٹتی، چیختی چلاتی عورتوں کو کمرے سمیت اُٹھائے، اُڑتا ہوا جنگل میں اس جگہ اُترا، جہاں وہ، اس کا دوست دَم اور سونے کے بالوں والی عورت رہتے تھے۔ اُس نے آہستہ سے کمرہ دَم کے سامنے زمین پر رکھ دیا۔ جونہی دروازہ کھلا، اندر سے کٹنی، راج کماریاں، نوکرانیاں، ہمسائیاں اور دوسری عورتیں روتی پیٹتی نکلیں، جدھر جس کا مُنھ تھا، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگیں، کوئی جنگل میں کسی طرف تو کوئی کسی طرف۔ دیو نے دَم سے پُوچھا: ''اس بڈھڑی[1] کا کیا کرنا ہے؟'' دَم نے جواب دیا: ''کرنا کیا ہے، یہی تو فساد کی جڑ ہے۔ اسے تو تُو سب سے پہلے اُٹھا اور اپنے اندر دھک[2] لا۔'' یہ سُن کر دیو نے فوراً موموٹھگنی کو اُٹھایا اور اپنا غار سا مُنھ کھول کر اسے جیبھ پہ رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے کھا گیا۔ دیو نے پھر سوال کیا: ''باقی عورتوں کا کیا کروں؟'' دَم کہنے لگا'': ان شوہدیوں (بچاریوں) کا کیا قصور۔ جنگل کے شیر، چیتے کہیں کھا نہ جائیں۔ انھیں پکڑ کے لے آ، اسی کمرے میں دوبارہ بند کردے اور پھر کمرے کو اُٹھا کے وہیں چھوڑ آ، جہاں سے اُٹھا کے لایا تھا۔'' عورتیں جنگل میں چیختی چلّاتی، بھاگتی پھر رہی تھیں۔ دیو نے انھیں اُوپر سے ہاتھ بڑھا کے ایک ایک کر کے پکڑا، بالکل اسی طرح جیسے کوئی پرندہ اپنی چونچ سے گھاس میں بھاگتے کیڑے مکوڑوں کو چُن چُن کے پکڑتا ہے۔ اس نے اپنی مٹھی میں بند، خوف سے چیختی ہوئی عورتوں کو ایک ایک کر کے، کھڑکی کے رستے اندر دھکیلا اور پھر دَم کے حکم کے مطابق کمرہ وہیں چھوڑ آیا، جہاں سے لایا تھا۔

اُدھر دَم سونے کے بالوں والی عورت کو زندہ سلامت دیکھ کر باغ باغ ہوا۔ اِدھر وہ بھی دَم کو دوبارہ اپنے سامنے پا کر پھولا نہ سمائی۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کے خوش ہو رہے تھے کہ دیو کمرہ چھوڑ کے لوٹ آیا اور دَم سے کہنے لگا: ''لو بھئی! جنگل میں رہنے کا شوق تو پورا ہو گیا ہے۔

---

[1] بڈھڑی: بڈھڑا (بوڑھا) کی تانیث، بوڑھی عورت۔ یہاں مراد ہے: کٹنی

[2] دھکنا: دھکیلنا، دھکا دینا، یہاں مراد ہے: منھ میں دھکیلنا، کھا جانا

اب ہم واپس چلے جائیں، کیا خیال ہے؟'' دَم بولا: ''نیک صلاح کا پوچھنا کیا۔ بس ٹھیک ہے۔ ہم چلتے ہیں واپس۔''

بوہڑ (بڑ) کے نیچے اسی طرح بوڑھا فقیر بیٹھا ہوا تھا۔ دَم اور دیو سونے کے بالوں والی عورت کو لے کر وہاں پہنچے۔ دَم نے فقیر سے کہا: ''تُو نے جو بُجھی گتی تھی، میں خُدا کے فضل سے وہ حل کر کے لے آیا ہوں۔ یہ تیرے سامنے سونے کے بالوں والی عورت کھڑی ہے۔'' فقیر مسکرا کے بولا: ''پُت (بیٹے)! یہ عورت تو میں نے تیرے ہی لیے منگوائی تھی اور اب تجھی کو اس سے بیاہ کرنا پڑے گا۔'' دَم حیران ہو کر کہنے لگا: ''ہیں! یہ کیا۔ میری تو آگے بھی شادی ہو چکی ہے۔ خُدا معلوم، میری پہلی عورت، میری نئی شادی پر راضی ہو گی بھی کہ نہیں؟'' فقیر نے اڑی (ضد) کرنی شروع کر دی کہ تجھے ہر صورت میں اس عورت سے بیاہ کرنا پڑے گا۔

دَم سونے کے بالوں والی عورت کو گھر لے آیا۔ دَم کے ماں باپ، اُس کے ساتوں بھائی، ان کی بیویاں سب اسے زندہ سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس کی بیوی کو ساتوں بہنوں نے بہت تنگ کیا ہوا تھا۔ کوئی کہتی: تیرا سائیں (شوہر) لولا لنگڑا ہے، تبھی شادی کے دن اِدھر اُدھر ہو گیا۔ کوئی کہتی: کانا ہے، اسی لیے رفو چکر ہو گیا۔ اب تجھے شوہر کے بنا ہی زندگی کے دن پورے کرنے ہوں گے۔ غرض جتنے منہ، اتنی باتیں۔ بے چاری آئے دن کے اس ٹھٹھا مذاق اور طعنوں مہنوں سے اس قدر تنگ آئی کہ سسرال چھوڑ کے پیکے (میکے) چلی گئی تھی۔ یہ سوچ کر کہ پیا جسے چاہے وہی سہاگن۔ جب مجھے پی اور پی کا پیار ہی حاصل نہیں تو میں نے یہاں رہ کے کیا کرنا ہے۔ جب اس سارے معاملے کا دَم کو پتا چلا تو وہ اسی وقت سسرال گیا۔ بیوی نے جب اپنے شوہر کو اچھا بھلا بلکہ ساتوں بھائیوں کی نسبت زیادہ خُوب صورت اور توانا دیکھا تو بے حد خوش ہوئی۔ واقعی صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ فوراً اُس کے ساتھ چلنے کے لیے رضامند ہو گئی۔ دَم بیوی کو لے کے گھر لوٹ آیا۔ گھر میں سونے کے بالوں والی عورت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دَم نے پہلی بیوی سے دوسری شادی کی اجازت مانگی۔ وہ اتنی اچھی عورت تھی اور شوہر کے ملنے پر اس قدر خوش تھی کہ فوراً بولی: ''میں راضی خوش ہوں۔ تو اس سے بھی بیاہ کر لے۔ ہم مل کر ہنسی خوشی زندگی گزار لیں گے۔'' میاں بیوی راضی کیا کرے گا قاضی۔ دَم نے فوراً گاؤں کی مسجد کے مولوی صاحب کو بلوایا اور دونوں عورتوں سے اسی وقت اپنا نکاح پڑھوایا۔ پھر اس نے اپنے دوست دیو کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ واقعی اس کی مدد کے بغیر یہ مہم پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ دیو نے دَم کو خُوب

صورت زندگی کی دعادی اور خوش خوش لوٹ گیا۔ میں وی اوہناں نوں چھڈ کے گھر آ گیا۔ دَم تے اوہدیاں دنویں زنانیاں اوتھے وسدے نیں، کھٹ دے نیں تے کھاندے ہیں۔ (اردو ترجمہ: میں بھی انھیں چھوڑ کے گھر آ گیا۔ دَم اور اس کی دونوں عورتیں وہاں بستے ہیں، کماتے ہیں اور کھاتے ہیں۔)

بدھ ۲۹۔اپریل ۲۰۰۹ء

لوہار کا لڑکا

یہ کہانی شاگردوں اور ان کے استادوں کے درمیان لڑائی جھگڑے کی طویل روایت کو بیان کرتی ہے۔ کہانی میں قلب ماہیت یا کایا پلٹ (Transformation) کو پیش کیا گیا ہے۔ کہانی کا یہ انداز برصغیر پاک و ہند اور یورپ میں کافی مشہور ہے۔ Grimm کی "The Thief and His Master"، Andrew Lang کی "Master and Pupil"، Giovanni Francesco Straparola کی "Maestro Lattantio and His Apprentice Dionigi"، Ewald Tang Kristensen کی "The Magic Book" اور Peter Chr.Asbjørnsen اور Jørgen Moe کی "Farmer Weathersky" اسی انداز کی کہانیاں ہیں۔

پچھلے زمانے کا ذکر ہے، کسی گاؤں میں ایک لوہار اور اس کا لڑکا رہتے تھے۔ ایک دِن لڑکا باپ سے کہنے لگا: "ابا! ابا! میرے لیے ایک چھری بناؤ، جس کی دھار بہت تیز ہو۔" باپ نے کہا: "بیٹے! چھری بھلی نہ کٹاری۔ یہ تو بتاؤ تم نے چھری کا کرنا کیا ہے؟" بیٹے نے گول مول سا جواب دیا کہ بس مجھے چاہیے۔ آخر بیٹے کے بے حد اصرار پر باپ نے لوہے کی چھری بنا دی۔ جب لڑکے کے ہاتھ میں ہتھیار آ گیا تو وہ شیر ہو گیا۔ لگا باپ کو دھمکانے کہ "ابا! فوراً راجے کے دربار میں جا اور میرے واسطے راج کماری کا رشتہ مانگ۔ اگر نہ مانگا تو میں چھری مار کر تیرا سر تن سے جدا کر دوں گا۔" لوہار خوف سے تھر تھرانے لگا۔ لڑکے کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ لوہار اس گھڑی کو کوسنے لگا، جب اس نے بیٹے کو چھری بنا کے دی تھی۔ آپے پھسیئے، تینوں کون چھڈاوے[ے]۔

اب سوچنے لگا کہ کروں تو کیا کروں۔ اُدھر کنواں، اِدھر کھائی۔ اگر راجے سے رشتہ مانگنے گیا تو راجا مار ڈالے گا اور اگر نہ گیا تو بیٹا۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ یُوں مرنے سے ووں مرنا بہتر ہے۔ چلو راجے کے پاس چلا جاتا ہوں۔ چاہے قتل ہی ہو جاؤں، بات تو رہ جائے گی کہ لوہار راجے سے ساک (رشتہ) مانگنے آیا تھا۔ اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں بے عزت ہو کر، گم نام مرنے سے کہیں بہتر ہے کہ راجے کے ہاتھوں عزت سے، مشہور ہو کر مروں۔

[ے] (اردو ترجمہ) جو اپنے آپ پھنس جائے، اسے بھلا کون چھڑا سکتا ہے۔
یہ اکھان (کہاوت) یوں بھی لکھا ہوا دیکھا ہے: "آپ پھاتڑیئے، تینوں کون چھڈائے۔" لیکن میں نے اسی طرح سنا ہے۔

ایک دن لوہار جی کڑا کر کے راجے کے پاس گیا اور اس سے اپنے بیٹے کے لیے اس کی لڑکی کا ساک مانگا۔ یہ سُن کر راجے کے تن بدن میں آگ لگ گئی کہ کمین ہو کر مجھ سے لڑکی کا ساک مانگتا ہے۔ دل تو چاہا کہ ابھی، اسی وقت جلاد کو حکم دے کر اس کا سر قلم کروا دوں۔ لیکن وزیر سیانا اور جہاں دیدہ تھا۔ راجے کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگا: "مہاراج! اسے مروا دیا تو خواہ مخواہ جگ ہنسائی ہو گی۔ لوگ بات کا بتنگڑ بنائیں گے۔ ہم کس کس کی زبان پکڑیں گے۔ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے طریقے سے ٹال دیا جائے۔ سانپ مرے، نہ لاٹھی ٹوٹے۔ ہم اسے ایسا سوال ڈالتے (کرتے) ہیں کہ یہ اس کا جواب ساری زندگی نہ ڈھونڈ سکے۔ گُو دیے مَرے تو زہر کیوں دیجیے۔" اُس کے بعد وزیر با تدبیر نے لوہار سے مخاطب ہو کر کہا: "میاں لوہار! ہم تیرے بیٹے کی شادی راج کماری سے کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اُس کے لیے ہماری ایک شرط ہے۔ تیرا بیٹا کوئی ایسا کام کرے، جو دنیا میں اس سے پہلے نہ کسی نے دیکھا ہو اور نہ سنا ہو۔"

لوہار شرط سُن کے واپس چل پڑا۔ اپنے زندہ لوٹنے پر اُس نے خُدا کا شکر ادا کیا۔ گھر آ کر اس نے اپنے بیٹے کو یہ بات بتائی۔ دونوں باپ بیٹے نے نگر کو الوداع کہا اور اس شرط کو پورا کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے ایک گھنے جنگل میں پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ شریہنھ (سرس) کے پیڑ کی چھاؤں میں ایک آدمی بیٹھا ہے۔ زمین پر چاروں طرف شریہنھ کے پیلے پیلے پھول بکھرے ہیں۔ آدمی نے چولھے میں اپنی ٹانگ ڈال رکھی ہے۔ پیر میں سے تڑاتڑ آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ چولھے پر کھولتے ہوئے تیل کی کڑاہی رکھی ہے اور وہ پکوڑے تل تل کے کھا رہا ہے۔ لوہار اور اُس کے بیٹے نے جب یہ عجیب منظر دیکھا تو من ہی من میں کہنے لگے: "یہ کام تو راجے نے نہ کہیں دیکھا ہو گا اور نہ سنا ہو گا۔ چلو یہی سیکھتے ہیں۔" لوہار اس آدمی سے مخاطب ہو کر بولا: "اللہ کے بندے! میرے بیٹے کو بھی اپنا شاگرد بنا لو اور اسے بھی اس طرح پکوڑے تلنا سکھا دو۔" وہ بولا: "میاں! آگے چلا جا۔ آگے میرا استاد بیٹھا ہوا ہے۔ وہ تیرے بیٹے کو رکھ لے تو رکھ لے۔ مجھے اجازت نہیں ہے شاگرد بنانے کی۔"

یہ سُن کر باپ بیٹے دونوں آگے روانہ ہو گئے۔ چلتے چلے جا رہے ہیں، چلتے چلے جا رہے ہیں۔ آگے کیا دیکھتے ہیں کہ بوہڑ (بڑ) کی چھاؤں میں ایک آدمی بیٹھا ہے۔ زمین پر چاروں طرف گوہلاں[1] بکھری ہوئی ہیں۔ اُس نے چولھے میں اپنی ایک ٹانگ ڈال رکھی ہے۔ ایڑی

---

[1] گوہل: بڑ کا پھل

میں تڑاتڑ آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ چولھے پر کھولتے ہوئے تیل کی کڑاہی رکھی ہے اور وہ جلیبیاں نکال نکال کے (تل تل کے) کھار ہا ہے۔ لوہار اور اُس کے بیٹے نے جب یہ منظر دیکھا تو من ہی من میں کہنے لگے: "ارے یہ کام تو پچھلے کام سے بھی مشکل ہے۔ یہ تو راجے نے نہ کہیں دیکھا ہوگا اور نہ سنا ہوگا۔ چلو یہی سیکھتے ہیں۔" لوہار اس آدمی سے مخاطب ہو کر بولا: "اللہ کے بندے! میرے بیٹے کو بھی اپنا شاگرد بنالو، اسے بھی اس طرح جلیبیاں تلنا سیکھا دو۔" وہ بولا: "میاں! آگے چلا جا۔ آگے میرا استاد بیٹھا ہوا ہے۔ وہ تیرے بیٹے کو رکھ لے تو رکھ لے۔ مجھے اجازت نہیں ہے شاگرد بنانے کی۔"

یہ سُن کر کر باپ بیٹے دونوں آگے روانہ ہو گئے۔ چلتے چلے جارہے ہیں، چلتے چلے جا رہے ہیں۔ آگے کیا دیکھتے ہیں کہ بیری کے گھنے پیڑ کے نیچے ایک آدمی بیٹھا ہے۔ زمین پر چاروں طرف میٹھے میٹھے، لال سرخ بیر بکھرے ہوئے ہیں۔ اس نے چولھے میں اپنی ایک ٹانگ ڈال رکھی ہے۔ پاؤں کے انگوٹھے میں سے تڑاتڑ آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ چولھے پر وہ (گنے کا رس) سے بھری کڑاہی رکھی ہے اور وہ گڑ بنا بنا کے کھا رہا ہے۔ لوہار اور اُس کے بیٹے نے جب یہ عجیب منظر دیکھا تو من ہی من میں کہنے لگے: "ارے یہ کام تو پچھلے کام سے بھی مشکل ہے۔ یہ تو راجے نے نہ کہیں دیکھا ہوگا اور نہ سنا ہوگا۔ چلو یہی سیکھتے ہیں"۔ لوہار اس آدمی سے مخاطب ہو کر بولا: "اللہ کے بندے! میرے بیٹے کو بھی اپنا شاگرد بنالو، اسے بھی اس طرح گڑ بنانا سیکھا دو۔" وہ بولا: "ٹھیک ہے، میں تیرے بیٹے کو اپنا شاگرد بنالیتا ہوں۔ اسے اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔ یہ لو چابیاں، وہ سامنے کمرہ ہے۔ دروازے کا تالا کھولو۔ اپنے بیٹے کو اندر بٹھا کے باہر سے تالا لگا دو۔" لوہار نے اس آدمی کی ہدایات پر حرف بحرف عمل کیا۔ جب بیٹے کو کمرے میں بند کر کے جانے لگا تو آدمی نے اس سے چابیاں واپس لے لیں اور کہا کہ اب ایک سال کے بعد آنا۔ لوہار اپنے گھر لوٹ گیا۔

لڑکا کمرے میں بھوکا پیاسا بیٹھا تھا۔ انتظار کر رہا تھا کہ کوئی آئے اور اسے باہر نکالے۔ لیکن پورا دن گزر گیا اور کوئی نہ آیا۔ اب جو لڑکے نے ذرا غور سے کمرے میں چاروں طرف دیکھنا شروع کیا تو اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خُون خشک ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک خوف ناک نظارہ تھا: کمرے کے فرش پر ہر طرف انسانی ہڈیاں بکھریں ہوئی تھیں۔ لڑکے نے سوچا: "جانے مجھ سے پہلے کتنے لوگ اس موت کے کمرے میں جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ میرا انجام بھی اس سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ میں اور میرا باپ، باہر بیٹھے اس آدمی کے دھوکے میں آ گئے۔

اب مجھے بھی یہاں بھوکے پیاسے، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا پڑے گا۔ ایک روز میری ہڈیاں بھی یہیں فرش پر بکھری ہوں گی۔" یہ سوچ کر لوہار کے لڑکے کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے اور اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ جب رونے سے دل کا غبار نکل گیا تو ایک کونے میں جا کے زمین پر بیٹھ گیا۔ دل نے کہا: جب تک سانس، تب تک آس۔ لڑکے نے زمین پر سے ایک بڑی سی ہڈی اُٹھائی، جس کا سرا چھری سے زیادہ تیز اور تیکھا تھا اور دیوار کھودنی شروع کر دی۔ پھول پھول کر کے چنگیر بھرتی ہے۔ دیوار سے مٹی گرتی رہی، گرتی رہی۔ آخر رات دن کی لگا تار محنت رنگ لائی۔ دیوار میں اتنا بڑا سوراخ ہو گیا کہ ایک آدمی اس میں سے گزر سکتا تھا۔ جب سوراخ میں سے گزر کر لڑکا دوسری طرف گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک اور کمرہ اس کا منتظر ہے۔ کمرہ خُوب سجا ہوا ہے۔ سبز ریشمی پردے لٹک رہے ہیں۔ قیمتی سرخ قالین بچھا ہوا ہے۔ کمرے میں ایک مَسہری رکھی ہے۔ جالی کے پردے کے پیچھے سانس لیتے ہوئے کسی بہت حسین جسم کا احساس ہوتا تھا۔ جونہی لوہار کے لڑکے نے پردہ سرکایا، اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ گدرائے ہوئے گورے بدن کی مالک ایک بہت خُوب صورت لڑکی بستر پر لیٹی سو رہی ہے۔ جوانی کی نیند۔ ریشمی، نرم پپوٹے گلابی گالوں پر ہیں۔ سانس لینے سے اس کی چھاتی مسلسل اُوپر نیچے ہو رہی ہے۔ کروٹوں کے باعث لمبے، لمبے، کالے بال جسم سے لپٹے ہوئے ہیں۔ لڑکا کُچھ دیر دیدے پھاڑے اسے دیکھتا رہا۔ اس دوران میں دفعتہً لڑکی کی آنکھ کُھل گئی۔ اپنے کمرے میں ایک اجنبی نوجوان کو دیکھ کر پہلے تو وہ گھبرائی۔ اُدھر لڑکا بھی ڈر گیا کہ خُدا خیر کرے، جانے کیا بلا ہے؟ تھوڑی دیر بعد دونوں کُچھ مطمئن ہوئے تو لڑکی بولی: "ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ آ جا، میرے پاس آ جا۔ یہاں بستر پر بیٹھ جا اور بتا کہ تو کون ہے؟ اور کیسے یہاں تک پہنچا؟" یہ سُن کر لوہار کے لڑکے کی ہمت بندھی۔ اس نے اپنی ساری کتھا کہی۔ پہلے تو لڑکی نے اسے کھانے پینے کو کچھ دیا پھر بولی: "جو شخص باہر بیٹھا گڑ نکال کر کھا رہا ہے اور جس نے تجھے کمرے میں قید کیا، وہ میرا باپ ہے۔ میں بھی جادوگرنی ہوں۔ غم نہ کر، میں تجھے جادو سکھاؤں گی۔" لڑکی جادو میں اپنے باپ سے بھی دو درجے آگے تھی۔ اگر باپ چودہ درجے پر تھا تو بیٹی سولہ درجے پر تھی۔

لڑکی نے لوہار کے لڑکے کو علم سکھانا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ وہ اسے قسم قسم کے لذیذ پھل، طرح طرح کے مزے دار کھانے کھلاتی۔ اچھی سے اچھی پوشاک پہننے کو دیتی۔ ایک برس گزر گیا مگر لوہار بیٹے کا پتا کرنے کے لیے نہ آیا۔ اس نے سوچا لڑکا خُوب اچھی طرح سحر، ٹو نے

کی تربیت لے لے، کامل جادوگر بن جائے، تو ہی اسے لینے کے لیے جاؤں گا۔ اس دوران میں لڑکا اس حسین ساحرہ سے جادو سیکھتا رہا اور پھر ایک دن اپنے فن میں مشتاق ہو گیا۔ دو برس کے بعد لوہار آیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہ آدمی اسی طرح بیری کے گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھا ہے۔ زمین پر چاروں طرف اسی طرح میٹھے میٹھے، لال سرخ بیر بکھرے ہوئے ہیں۔ اس شخص نے پہلے کی مانند چولھے میں اپنی ایک ٹانگ ڈال رکھی ہے۔ پاؤں کے انگوٹھے میں سے آگ نکل رہی ہے۔ چولھے پر وہ سے بھری کڑاہی رکھی ہے اور وہ اسی طرح گڑ بنا بنا کے کھا رہا ہے۔ لوہار نے اس سے پُوچھا: ''اللہ کے بندے! میرا بیٹا کہاں ہے؟ دو سال پہلے میں اسے تیری شاگردی میں، تیرے پاس چھوڑ گیا تھا۔'' وہ شخص کہنے لگا: ''میں تو دو سال سے یہیں بیٹھا گڑ بنا بنا کے کھا رہا ہوں۔ نہ مجھے فرصت ملی اور نہ میں نے جا کے دیکھا۔ تو اپنے ہاتھ سے اپنے بیٹے کو سامنے والے کمرے میں بند کر کے، باہر سے تالا لگا گیا تھا۔ یہ لے کنجیاں اور اپنے ہاتھ سے تالا کھول لے اور اپنے بیٹے سے مل لے۔'' باپ نے سنا تو چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ایک رنگ آتا، ایک رنگ جاتا تھا؛ یہ سوچ کر کہ دو سال بعد اب تو بیٹے کی ہڈیاں ہی ملیں تو ملیں، زندہ ملنا تو ناممکن ہے۔ گڑ کھانے کے اس شوقین کو دل میں گالیاں دیتا ہوا، لوہار بھاگا بھاگا کمرے کی طرف گیا۔ تالے میں چابی گھمائی۔ اندر بیٹھی لڑکی کے کان میں جب تالا کھلنے کی آواز پڑی، تو لڑکے سے کہنے لگی: ''اگر میرا باپ ہوا تو ہم دونوں کو مار ڈالے گا اور اگر تیرا باپ ہوا تو ہم بچ جائیں گے۔''

لوہار دروازہ کھول کے اندر گیا۔ کمرہ خالی تھا۔ دیوار کے سوراخ میں سے گزر کے دوسرے کمرے میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے، سامنے مسہری پر ایک خُوب صُورت لڑکی اور اس کا بیٹا بیٹھے ہوئے ہیں۔ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ اپنے بیٹے کو زندہ سلامت دیکھ کر باپ کی جان میں جان آئی۔ دوڑ کے بے اختیار بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور خُدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ اس کے بعد بیٹے نے باپ سے لڑکی کا تعارف کروایا۔ جب اصل صورتِ حال کا لوہار کو اندازہ ہوا تو وہ کانپ کے رہ گیا۔ اس نے بیٹے کو بچانے پر لڑکی کا شکریہ ادا کیا۔ وہ حسین ساحرہ کہنے لگی: ''تم دونوں کے بچنے کی اب فقط ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ اے لوہار! تو دوہائی دیتا ہوا، روتا پیٹتا باہر جا، اور میرے باپ سے کہہ کہ ہائے ہائے! میرا بیٹا بھوکا پیاسا، سسک سسک کر مر گیا۔ تم نے اسے کمرے سے نکالا ہی نہیں۔ اب مجھے اتنی اجازت تو دے کہ اس کی ہڈیاں کسی کپڑے میں باندھ کے لے جاؤں اور قبر میں دفن کر دوں۔''

لوہار ہال ہال کرتا (دوہائی دیتا، ہائے ہائے کرتا) کمرے سے باہر نکلا۔ جس طرح سے لڑکی نے سمجھایا تھا، اسی طرح کیا۔ گڑبناتا اور کھاتا جادوگر بولا: ''ہاں، ہاں، ہڈیاں لے جا۔ میں نے ان کا کیا کرنا ہے۔'' بوڑھے ساحر نے ہڈیاں لے جانے کے لیے ایک بڑی سی سفید چادر بھی فراہم کردی۔ لوہار دوبارہ کمرے میں آیا۔ لڑکی کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق بیٹے کو چادر میں چھپالیا۔ جب بیٹے کو چادر میں لپیٹے، کاندھے پہ اُٹھا کے کمرے سے باہر جانے لگا تو لڑکی بولی: ''میری ایک بات پلّے باندھ لو۔ میں نے تیرے بیٹے کو جو جادو سکھایا ہے، اس کی مدد سے کہیں راستے ہی میں نہ کمائی کرنا شروع کردینا۔ گھر پہنچ کے جو مرضی ہو، کرنا۔ اگر تُو نے راستے ہی میں امیر ہونا شروع کردیا تو میرے باپ کو پتا چل جائے گا اور پھر وہ تجھے اور تیرے بیٹے کو نہیں چھوڑے گا۔''

خُوب صُورت ساحرہ اندر کمرے ہی میں رہی۔ لوہار نے اس سے کہا بھی کہ ''بیٹی! تو بھی کسی طرح چُھپ چُھپا کے ہمارے ساتھ چل، اپنے سنگ دل باپ کی قید سے رہائی حاصل کر۔'' لیکن وہ نہ مانی اور بولی: ''اس طرح ہم تینوں پکڑے جائیں گے۔ تجھے اور تیرے بیٹے کو بھی آزادی نہ مل سکے گی۔ یوں بھی میرا مرن جیِن (مرنا جینا) اب یہی ہے۔ یہاں سے بھاگ کر کہاں جاؤں گی۔'' لوہار بیٹے کو کپڑے میں لپیٹے، کاندھوں پہ اُٹھائے کمرے سے نکلا۔ اس نے چابیوں کا گچھا دور ہی سے جادوگر کی طرف پھینکا جو ابھی تک بیٹھا گڑبناتا جاتا تھا اور کھاتا جاتا تھا۔ جادوگر نے اس کی جانب کُچھ دھیان نہیں دیا۔ چابیاں اُٹھائیں اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

جب لوہار اپنے بیٹے کو اُٹھائے جنگل میں کافی دور نکل آیا، تو ایک جگہ اس نے بیٹے کو کاندھے سے نیچے اُتارا۔ اُسے چادر سے باہر نکالا۔ پھر دونوں نے مل کر رب کا شکر ادا کیا کہ ان کی جان بچ گئی۔ اب باپ بیٹے نے دوبارہ سفر کا آغاز کیا۔ چلے جارہے ہیں، چلے جارہے ہیں۔ آخر جنگل سے باہر نکل آئے۔ اب ان کے سامنے سرسبز وشاداب کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ایک جگہ کیا دیکھتے ہیں کہ رہٹ چل رہا ہے۔ بیل گھوم رہا ہے اور کنوئیں سے پانی نکل رہا ہے۔ پاس ہی ایک زمین دار کھڑا ہے۔ لوہار کا لڑکا باپ سے کہنے لگا: ''ابا! میں تجھے اپنا جادو دکھاتا ہوں۔ میں ایک کلام پڑھوں گا اور ڈنگا (بیل) بن جاؤں گا۔ تو مجھے اس زمین دار کے ہاتھ فروخت کردینا لیکن یاد رکھنا میرا رسّا اُتار لینا، وہ نہ بیچنا۔'' اتنا کہہ کر لڑکے نے کلمہ کلام پڑھا اور اسی وقت بیل بن گیا۔ دونوں چلتے چلتے زمین دار کے پاس پہنچے۔ زمین دار نے جب اس قدر جوان اور پلا ہوا بیل دیکھا تو لوہار سے کہنے لگا: ''بابا جی! بیل بیچنا ہے؟'' لوہار بولا: ''ہاں'' زمین دار نے پوچھا: ''کیا لوگے؟'' لوہار بولا: ''سوا پانچ روپے۔'' زمین دار کو سوچ میں ڈوبے دیکھ کر لوہار کہنے لگا: ''میرا بیل بہت اچھا

ہے۔ تو اسے اپنے رہٹ کے ساتھ جوڑ کے دیکھ لے۔ اگر دل مطمئن ہو جائے تب خریدنا۔'' زمین دار نے بیل رہٹ سے جوڑا۔ بیل خُوب پانی نکالنے لگا، اُس کے پہلے والے بیل سے بھی زیادہ۔ زمین دار خوش ہو کر بیل خریدنے پر راضی ہو گیا۔ لوہار کہنے لگا: ''لیکن میں نے بیل کے ساتھ رسّا نہیں دینا۔'' زمین دار بولا: ''کوئی بات نہیں۔ تم اپنا رسّا اُتار لو۔ میں خود ہی نیا رسّا ڈال لوں گا۔'' زمین دار نے سوا پانچ روپے قیمت ادا کر دی اور بیل خرید لیا۔ جب لوہار کافی دُور چلا گیا تو بیل نے یکا یک رُخ موڑا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ سیدھا لوہار کے پاس پہنچا اور وہاں جا کے پھر لڑکا بن گیا۔ زمین دار ڈنڈا پکڑے، ہانپتا، کانپتا، دوڑا دوڑا پیچھے آیا اور لوہار سے پُوچھنے لگا: ''بابا! تم نے میرا بیل تو نہیں دیکھا؟'' لوہار بولا: ''بیل تو ابھی میں تیرے حوالے کر کے آیا ہوں۔ اب وہ کدھر گیا، مجھے کیا پتا؟'' بے چارے زمین دار کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ لوہار کے ساتھ جو لڑکا جا رہا ہے، وہی اصل میں اس کا بھاگا ہوا بیل ہے۔ زمین دار حیران پریشان لوٹ گیا۔

لوہار اور اُس کے بیٹے نے جادوگر کی بیٹی کی نصیحت پر عمل نہیں کیا تھا اور راستے ہی میں جادو کی مدد سے کمائی کرنا شروع کر دی۔ اب انھیں اس کا خمیازہ بھگتنا تھا۔ بوڑھے ظالم جادوگر کو پتا چل گیا کہ لوہار کا لڑکا زندہ سلامت ہے، میری قید سے فرار ہو چکا ہے۔ میری اپنی بیٹی نے اسے علم سکھا دیا ہے اور ایک کامل ساحر بنا دیا ہے۔ واقعی گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ ظالم جادوگر نے جادو کے زور سے ایک بوڑھے فقیر کا روپ دھارا اور ان سے پہلے ہی آگے راستے پر آ کے بیٹھ گیا۔

لوہار کے لڑکے کو چوں کہ بڑی کامیابی ملی تھی اس لیے اس نے پھر دوبارہ سوانگ بھرنے کے بارے میں سوچا۔ اب کے اس نے اونٹ بننے کا فیصلہ کیا۔ باپ سے بولا: ''ابا! اس دفعہ تو میرے پورے نو روپے مانگنا۔ ایک روپیہ بھی کم نہ کرنا۔ لیکن یاد رہے میرے ساتھ نکیل ہرگز ہرگز نہ دینا۔'' اتنا کہہ کے لوہار کے لڑکے نے کلمہ کلام پڑھا اور فوراً اونٹ بن گیا۔ لوہار اونٹ کی نکیل پکڑے چلتا چلتا جادوگر کے پاس آ پہنچا جو بوڑھے فقیر کی شکل بنائے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ فقیر نے لوہار سے پُوچھا: ''بابا جی! اونٹ بیچنا ہے؟'' فقیر نے لوہار کے دل کی کہی تھی۔ لوہار خوش ہو کر بولا: ''ہاں، بیچنا ہے۔'' فقیر نے پُوچھا: ''کیا لو گے؟'' لوہار نے کہا: ''نو روپے۔'' فقیر نے اسی وقت کھیسے (کیسہ، جیب) سے نو روپے نکالے اور لوہار کے ہاتھ میں تھما دیے اور اونٹ خرید لیا۔ اب لوہار کو یاد آیا، بولا: ''میں نے اونٹ کے ساتھ نکیل نہیں دینی۔'' فقیر بھی جادوگر تھا۔ راز دار تھا۔ نکیل کے بھید اور اہمیت سے واقف تھا، بولا: ''میں نے تمھیں مُنہ مانگی قیمت ادا کی ہے۔ میں نے اونٹ نکیل کے ساتھ خریدا ہے۔ اس لیے نکیل تو تمھیں دینی ہی پڑے گی۔'' غرض ان کے بیچ

اتنی تُو تُو میں میں ہوئی کہ راہ چلتے مسافر رک گئے۔ ارد گرد کے کھیتوں میں کام کرتے کسان بھاگے بھاگے آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ جمع ہو گئی۔ فقیر نے ہجوم سے مخاطب ہو کر کہا: ''لوگو! خدا لگتی کہو۔ کیا تم نے آج تک کبھی یہ سنا ہے کہ کوئی جانور بکے اور بیچنے والا، خریدنے والے کے حوالے جانور کرنے سے پہلے اُس کے گلے سے رسّا اُتار لے؟ دیکھو، دیکھو، یہ شخص جانور کی پوری قیمت وصول کرنے کے بعد اک ذرا سی نکیل کے لیے مجھ سے جھگڑ رہا ہے۔'' فقیر کی بات میں دلیل تھی۔ جب لوگوں کو پتا چلا کہ یہ تو تکار محض نکیل کے لیے ہو رہی ہے تو سب نے لوہار کو جھوٹا کیا۔ اتنے لوگوں کے آگے لوہار کی پیش نہ گئی۔ اسے بادلِ نخواستہ اونٹ کے ساتھ نکیل بھی فقیر کے حوالے کرنی پڑی۔

فقیر، جو فی الحقیقت جادوگر تھا، اونٹ کی نکیل پکڑے، خوشی خوشی چل پڑا۔ لڑکا جو اونٹ کی شکل میں تھا، اب جادوگر کے قبضے میں تھا۔ چوں کہ اس کی نکیل جادوگر کے ہاتھ میں تھی، اس لیے اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ پہلے کی طرح، خریدار کی لاعلمی میں، پیچھے سے بھاگ آئے اور دوبارہ انسان بن جائے لیکن لڑکا بھی اب محض لڑکا نہیں تھا۔ دو برس تک جادوگر کی بیٹی کی شاگردی میں رہنے کے بعد وہ کامل جادوگر بن چکا تھا۔ اس نے کلمہ کلام پڑھا، اور کبوتر بن کے اُڑ گیا۔ جادوگر کے ہاتھ میں پکڑی نکیل کا پچھلا سرا پھٹ سے نیچے گرا۔ اس نے مڑ کے دیکھا تو اونٹ کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا اور نکیل زمین پر سرک رہی تھی۔ جادوگر نے فوراً کلام پڑھا اور باز بن کے کبوتر کے تعاقب میں اڑنے لگا۔ لیکن لڑکا بھی اس سے کچھ کم علم پڑھا ہوا نہیں تھا۔ سیر کو سوا سیر۔ کبوتر نے آسمان سے جو نیچے نظر کی تو دیکھا کہ گاؤں کی کچھ عورتیں جھکی ہوئی، گھٹنوں گھٹنوں ایک چھپڑ [1] میں کھڑی، ہاتھ بھر بھر کے کالی سیاہ چکنی مٹی نکال رہی ہیں تاکہ اپنے کچے گھروں کی دیواروں اور فرش پر پوچا [2] لگا سکیں۔ اس سے پہلے کہ باز اپنے پنجوں سے کبوتر کو پکڑتا، لڑکے نے علم پڑھ کے فوراً روپ بدلا اور ڈڈی [3] بن کے چھپڑ میں گر گیا۔ یہ دیکھ کر بوڑھا جادوگر بگلا بن گیا، اڑتا اڑتا چھپڑ میں اُترا اور چونچیں مار مار کر پانی میں اُسے تلاش کرنے لگا۔ ایک نوجوان لڑکی بھی چھپڑ میں کھڑی اپنے گورے، گورے ہاتھوں کی لمبی لمبی انگلیوں سے مٹی نکال رہی تھی۔ لڑکے نے پھر کلام پڑھا اور ڈڈی سے چھلا بن کر مٹی کے ساتھ ہی لڑکی کی چیچی [4] میں چلا گیا۔ بگلا بھگت یعنی

---

[1] چھپڑ: جوہڑ، برساتی پانی کا تالاب [2] پوچا: پوتا، پلستر،
[3] ڈڈی: مینڈک، مادہ مینڈک [4] چیچی: چھنگلی، چھنگلیا (ہاتھ پاؤں کی سب سے چھوٹی انگلی)
[5] تسلا: طشت، تھال، پرات، پلیٹ، چلمچی

جادوگر اب اس کی چھچی سے تو چھلاّ نکالنے سے رہا۔ تھوڑی دیر بعد زنانیاں مٹی تسلوں[۵] میں ڈالے، اپنے سروں پر رکھے گھروں کی اور چل پڑیں۔ بگلا اُن کے ساتھ ساتھ، اُن کے سروں پر اُڑنے لگا۔ جیسے ہی وہ لڑکی اپنے گھر پہنچی، جادوگر بگلے سے فقیر بن گیا اور اس کی چوکھٹ پہ صدا کی۔ لڑکی آٹا چھنتے[۱] میں ڈالے دروازے پر آئی۔ فقیر بولا: ''میں نے آٹا نہیں لینا؛ میں نے تو وہ چھلاّ لینا ہے جو تیرے دائیں ہاتھ کی چھچی میں ہے۔'' یہ سُن کر لڑکی کو بہت غصہ آیا۔ وہ فقیر کو بُرا بھلا کہنے لگی کہ تُو کون ہوتا ہے مجھ سے چھلاّ مانگنے والا۔ جب لڑکی کی ماں کے کان میں یہ تو تکار پڑی تو وہ بھی دروازے پر آ گئی۔ اب جو اسے اصل بات کا پتا چلا تو وہ بیٹی پر بہت خفا ہوئی۔ ماں شکی مزاج عورت تھی۔ بیٹی کو خُوب گالیاں دیں اور کہا: ''نی[۲]! تو تو چھپڑ سے مٹی لینے گئی تھی، چھچی میں چھلاّ کہاں سے پوا[۳] کے آئی ہے۔ بتا کس یار نے تجھے دیا؟ اسے اُتار اور فوراً پھینک۔ آ لینے دے تیرے باپ کو، کرتی ہوں اس سے بات۔ اس سے پہلے کہ تو کوئی چن چڑھائے[۴]، کرتی ہوں تیرے ہاتھ پیلے۔'' لڑکی بے چاری عجیب مصیبت میں پھنس گئی۔ اُس نے گھبرا کے چھلاّ چھچی سے اُتار کے پھینکا۔ فقیر اسی انتظار میں آنکھ رکھے کھڑا تھا۔ اس نے چھلاّ پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ لڑکا فوراً چھلے سے پھر کبوتر بن گیا او اڑ گیا۔ جادوگر فقیر سے دوبارہ باز بن کے اُس کے پیچھے اُڑنے لگا۔ آخر راجے کا محل آ گیا۔ دونوں اُس کے اُوپر اُڑنے لگے۔ اس وقت راجا کچہری لگائے بیٹھا تھا۔ اس سے پہلے کہ باز پکڑتا، لڑکا اُڑتے اُڑتے کبوتر سے سونے کا تار بن گیا اور راجے کے تاج کے اندر گر گیا کہ یہاں سے تو باز مجھے نہیں نکال سکے گا۔ جادوگر باز سے دوبارہ فقیر بن گیا۔ وہ راجے کے سامنے آیا اور صدا کی۔ راجا بولا: ''مانگ کیا مانگتا ہے؟'' فقیر نے کہا: ''مہاراج! تیرے تاج کے اندر جو سونے کا تار ہے، وہ مجھے دے دے۔'' یہ سُن کر راجے کو بہت حیرت ہوئی۔ وہ سوچنے لگا کہ میرے تاج میں سونے کا تار کہاں سے آ گیا؟ اس نے ایک ہاتھ اُوپر اُٹھایا کہ تاج میں ڈال کے ذرا دیکھے تو سہی۔ لڑکا سونے کے تار سے تسبیح بن کر راجے کے ہاتھ میں آ گیا۔ راجے نے تاج میں سے جونہی تسبیح نکالی، تسبیح کے سارے منکے ٹوٹ کر نیچے فرش پر گر گئے اور بکھر گئے۔ فقیر فوراً ککڑ بن کر انھیں چگنے کے لیے آگے بڑھا۔ لڑکے نے فی الفور علم پڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے منکوں سے بلاّ بن کر ککڑ کو مار ڈالا۔

۱۔ چھنتا/چھنتاں: دھات (کانسی وغیرہ) کا ایک برتن

۲۔ نی: (عورت کے لیے حرفِ ندا) اَری، اے

۳۔ پوان/پوانا: ڈلوانا، گسڑوانا، داخل کروانا

۴۔ چن چڑھانا: گُل کھلانا

راجا حیران پریشان، دَم بخود یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں پھٹی جاتی تھیں۔ ایسا اچنبھا اسے زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اُدھر لڑکا جادوگر کو مارنے کے بعد دوبارہ اپنے اصل روپ میں آ گیا اور آگے بڑھ کے راجے کے رُوبرُو آداب بجالایا۔ راجا جو ابھی تک حیرت میں ڈوبا ہوا تھا، بمشکل بولا: ''یہ سب کیا ماجرا ہے؟'' اس کی آواز کہیں بہت دُور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ لڑکے نے کہا: ''مہاراج! بتایئے، یہ کام آپ نے آج تک کبھی دیکھا اور سنا؟'' راجا انگشت بدنداں ہو کر بولا: ''نہیں، کبھی نہیں۔'' اس پر لڑکے نے کہا: ''مہاراج! اب اپنا معاہدہ یاد کیجیے، جو آپ نے میرے باپ سے کیا تھا۔ میں اسی لوہار کا لڑکا ہوں۔ میں نے بھری کچہری میں، اتنے لوگوں کے سامنے آپ کی شرط پوری کر دی ہے۔ اب اپنا وعدہ پورا کیجیے۔ مجھے راج کماری کا رشتہ دیجیے۔''

راجے کے لیے اب کوئی رستہ نہیں رہا تھا۔ اُسے مجبوراً ہاں کرنا پڑی۔ چند دن بعد لوہار اپنے لڑکے کے سہرے لگائے، گھوڑی پر بٹھائے، برات لے کر راجے کے محل میں آ گیا۔ دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ لوہار کا لڑکا راجے کا داماد بن گیا۔ چُوں کہ راجے کے کوئی بیٹا نہیں تھا، اس لیے اُس نے اسے ہی اپنا ولی عہد بنا لیا۔ چند سالوں بعد جب راجے نے وفات پائی تو لوہار کا لڑکا تخت پہ بیٹھا اور نہایت آن بان سے عنانِ حکومت سنبھالی۔

جمعہ ۶۔ مارچ ۲۰۰۹ء

ٹیلو بادشاہ

دنیا کے کئی علاقوں خصوصاً مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں ایسی لوک کہانیاں اکثر ملتی ہیں، جن میں ایک معمولی آدمی، بیٹھے بٹھائے محض اتفاقیہ طور پر ہیرو بن جاتا ہے اور ایک خود ساختہ سورما، بنا ہاتھ پاؤں ہلائے، صرف حسنِ اتفاق سے کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسے ہی خوش نصیب انسان کی کہانی ہے۔

مدتیں گزریں، ایک گاؤں دریا کے کنارے آباد تھا۔ یہاں ایک لڑکا رہتا تھا۔ سارا سارا دن دریا کے کنارے سیر سپاٹے کرتا۔ ''دریا دا ہمسایہ، نہ بھکھا تر ہایا۔''[1] گاؤں والے اسے آوارہ کہتے۔ ماں باپ بچپن میں فوت ہو چکے تھے۔ نہ کوئی بہن، نہ بھائی، اکیلا تھا۔ ہر روز، بلا ناغہ دریا کے کنارے کنارے چار میل دائیں طرف چلتا، چار میل بائیں طرف چلتا اور اپنے آپ کو ''ٹیلو بادشاہ'' کہہ کے پکارتا۔

ایک دن دریا کنارے کھڑا سوٹی (لاٹھی) پکڑ کے اپنے جوتوں سے خشک مٹی جھاڑ رہا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے دریا چڑھا ہوا تھا۔ آج ہی پانی اُترا تھا۔ جوتوں سے مٹی جھاڑتے جھاڑتے اچانک ریت پہ پڑی عطر کی ایک شیشی نظر آئی۔ اس نے اُٹھائی، اپنے کرتے سے صاف کی، دیکھا کہ مُہر لگی ہوئی ہے، اور جانے کہاں سے بہہ کے آئی ہے۔ ٹیلو بادشاہ نے دریا کا تحفہ سمجھ کے جیب میں ڈال لی۔

چند دن بعد کا ذکر ہے، ٹیلو بادشاہ حسبِ معمول دریا کنارے مٹرگشت میں مصروف تھا۔ وہاں سے ایک سوداگر کا گزر ہوا۔ ٹیلو نے اسے روکا اور پُوچھا: ''تو کہاں جا رہا ہے؟'' سوداگر بولا: ''میں دریا باد بادشاہ زادی کے شہر جا رہا ہوں، تجارت کرنے کے لیے۔'' یہ سُن کر ٹیلو نے اسے عطر کی شیشی دی اور کہا: ''یہ عطر شہزادی کے حضور بطور نذرانہ پیش کرنا اور کہنا کہ تجھے یہ تحفہ ٹیلو بادشاہ نے بھیجا ہے۔'' سوداگر نے شیشی جیب میں ڈالی اور روانہ ہو گیا۔ چلتے چلتے وہ دریا باد بادشاہ زادی کے شہر پہنچ گیا۔ تجارت کے کام دھندوں سے فارغ ہونے کے بعد ایک روز دریا باد کے محل میں پہنچا۔ دربان کے ذریعے شہزادی سے ملنے کی اجازت مانگی۔ شہزادی نے اسی وقت اپنے حضور بلوا لیا۔ سوداگر شہزادی کے روبرو پہنچا، آداب بجا لایا۔ پھر اپنے چوغے میں سے عطر کی شیشی نکالی، شہزادی کی خدمت میں پیش کی اور کہا: ''شہزادی حضور! یہ آپ کے لیے ٹیلو بادشاہ نے

---

[1] اُردو ترجمہ: دریا کا ہمسایہ، بھوکا نہ پیاسا۔ یعنی دریا کے کنارے پر رہنے والے خوشحال رہتے ہیں۔

تحفہ بھیجا ہے''۔ شہزادی نے عطر کی شیشی پکڑی، اپنی سُتواں ناک کے پاس لائی، سونگھی اور خوش ہو کر بولی: ''اے سوداگر! جب واپس جانا تو مجھ سے مل کے جانا۔'' سوداگر چند دن اپنے کام دھندوں میں لگا رہا۔ خوب تجارت کی، خُوب منافع کمایا۔ جب کوچ کی گھڑی آئی تو شہزادی کے پاس آیا اور کہا: ''شہزادی حضور! میں کل صبح واپس جا رہا ہوں۔'' دریاباد نے اسے سات پنّیاں[5] دیں۔ ساتوں کے اندر بیش بہا لعل ڈالے ہوئے تھے۔ چار یا پانچ پنّیاں بنا لعل کے بھی دیں کہ کھانا تو انھیں کھانا۔ باقی کی سات پنّیوں کو ہاتھ مت لگانا۔ یہ میری طرف سے ٹیلو بادشاہ کو تحفہ دینا۔ اگلی صبح سوداگر نے واپسی کا قصد کیا۔

آخر چلتے چلتے ایک روز اس کا گزر اسی دریا کنارے ہوا۔ ٹیلو پہلے کی طرح مارا مارا پھر رہا تھا۔ سوداگر کی ملاقات ہوئی تو اس نے ساتوں کی ساتوں پنّیاں ٹیلو کے حوالے کر دیں کہ یہ تمھارے لیے دریاباد کا تحفہ ہے۔ ٹیلو کو پتا نہیں تھا کہ ان کے اندر ہیرے ہیں اور نہ ہی یہ بات سوداگر کے علم میں تھی۔ ٹیلو نے اُس سے پُوچھا: ''اب کہاں کا اِرادہ ہے؟'' سوداگر نے جواب دیا: ''اب میں تجارت کی غرض سے چھیدی بادشاہ کے ملک جا رہا ہوں۔'' یہ سُن کر ٹیلو نے کہا: ''اچھا، پھر یہ سات پنّیاں بھی اپنے ساتھ ہی لیتے جاؤ۔ انھیں چھیدی بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنا اور کہنا کہ یہ آپ کے لیے ٹیلو بادشاہ نے تحفہ بھیجا ہے۔'' سوداگر نے اسی طرح پنّیاں اپنے تھیلے میں واپس ڈال لیں اور آگے روانہ ہو گیا۔

سوداگر چھیدی بادشاہ کی بادشاہی میں پہنچا۔ چند دن خرید و فروخت میں مصروف رہا۔ فارغ ہوا تو چھیدی کے دربار میں آیا۔ کورنش بجا لایا۔ تھیلے سے پنّیاں نکال کے اس کی خدمت میں پیش کیں اور کہا: ''حضور! یہ آپ کے لیے ٹیلو بادشاہ نے تحفہ بھیجا ہے۔'' چھیدی نے جلدی سے ایک پنّی اٹھا لی۔ باقی کی چھ اپنے چھ وزیروں میں ایک ایک تقسیم کر دیں۔ جونہی چھیدی نے پنّی توڑی اس میں سے لعل نکل آیا۔ اُس نے اسی طرح پنّی بند کر دی اور اپنے وزیروں کو حکم دیا کہ کوئی اپنی پنّی نہ توڑے۔ اس نے سب سے پنّیاں واپس لے لیں۔ محل میں جا کر توڑیں تو سب میں سے لعل برآمد ہوئے۔ چھیدی بادشاہ نے سوچا: ''ضرور ٹیلو بادشاہ کوئی بہت بڑا بادشاہ ہے، تبھی تو اس نے لعلوں سے بھری پنّیاں تحفے میں بھیجی ہیں۔'' چھیدی نے سوداگر سے پُوچھا: ''ٹیلو کیسا بادشاہ ہے؟ اُس کے پاس کتنی فوج ہے؟'' سوداگر نے جواب دیا: ''ٹیلو بادشاہ کلم کلّا (اکیلا) ہے۔

---

[5] پنّی: ایک قسم کی دیسی مٹھائی

بس سوئی ہاتھ میں ہوتی ہے اور دور تک پھیلا ہوا دریا کا کنارا۔ ہمیشہ وہیں پھرتا رہتا ہے۔'' یہ سُن کر چھیدی نے سوداگر سے کہا: ''اے سوداگر! جب واپس جانا تو میرے پاس سے ہو کے جانا۔''
سوداگر اپنے کام دھندوں میں لگ گیا۔ جب کوچ کی گھڑی آئی تو چھیدی بادشاہ کے پاس آیا اور کہا: ''حضور! میں کل صبح واپس جا رہا ہوں۔'' چھیدی نے اسی وقت سپہ سالار کو حکم دیا کہ سوداگر کے حوالے پانچ ہزار سپاہی کر دیے جائیں۔ پھر وہ سوداگر سے مخاطب ہوا۔ ''یہ پانچ ہزار سینا ہماری طرف سے ٹیلو بادشاہ کو تحفہ دینا اور کہنا کہ ان کی تنخواہ اور کھانے پینے کی فکر مت کرنا۔ یہ سب ہمارے ذِمّے ہے۔ یہ پانچ ہزار سپاہی تمھاری حفاظت کریں گے۔''

اُدھر دریاباد بادشاہ زادی کا باپ مر گیا۔ اُس کے چاچا کا لڑکا اس سے زبردستی شادی کرنا چاہتا تھا تاکہ شہزادی کے ساتھ ساتھ تختِ سلطنت پر بھی قبضہ کیا جا سکے۔ دریاباد اُس کے ناپاک منصوبے سے واقف تھی۔ اس نے بیاہ سے صاف انکار کر دیا۔ تب وہ لڑکا لال پیلا ہو گیا اور بولا: ''اے دریاباد! یا تو مجھ سے شادی کر یا پھر جنگ کر۔ دونوں میں سے ایک بات کا انتخاب کر۔'' اس کا خیال تھا کہ اگر دریاباد نے مجھ سے شادی کر لی تو تب بھی بادشاہی میری اور اگر جنگ کی تو عورت ذات ہے، مجھ سے ہار جائے گی، تب بھی بادشاہی میری۔ دریاباد حیران پریشان اپنے پلنگ پر بیٹھی تھی کہ اچانک اُسے ٹیلو بادشاہ کا خیال آیا۔ مایوسی کے اندھیرے چھَٹ گئے، چہرہ امید کی روشنی سے تمتمانے لگا۔ اس نے سوچا: ''میں ابھی اپنے قاصد کو ٹیلو بادشاہ کے پاس بھیجتی ہوں، یہ پیغام دے کر کہ وہ مصیبت کی اس گھڑی میں میری مدد کرے۔''

حُسنِ اتفاق دیکھیے، اُدھر سے دریاباد کا قاصد ٹیلو بادشاہ کے پاس پہنچا تو اِدھر سے سوداگر چھیدی بادشاہ کا بھجوایا ہوا تحفہ پانچ ہزار سپاہ لے کر دریا کنارے چلا آ رہا تھا۔ ٹیلو بادشاہ نے قاصد اور سوداگر، دونوں کی بات سُنی۔ پھر سوداگر سے پُوچھا: ''اب کہاں کا قصد ہے؟'' سوداگر نے جواب دیا: ''اب میں تجارت کی غرض سے دریاباد بادشاہ زادی کے شہر جا رہا ہوں۔'' یہ سُن کر ٹیلو بولا: ''اچھا تو پھر یہ سینا یونہی اپنے ساتھ لیتا جا۔ دریاباد کے شہر جا کے اس سے کہنا کہ یہ تیرے لیے ٹیلو بادشاہ کا تحفہ ہے۔ یہ پانچ ہزار سپاہی تیرے ہر حکم کی تعمیل کریں گے اور تیری طرف سے تیرے چاچا کے بدمعاش لڑکے سے لڑیں گے۔''

سوداگر اسی طرح پانچ ہزار کا لشکر لیے، دریا کنارے چلتا چلتا دریاباد بادشاہ زادی کی خدمت میں پہنچا۔ اسے ساری بات بتائی۔ شہزادی بے حد خوش ہوئی۔ اس دوران میں جنگ کا طبل

بجا۔ دریاباد نے ٹیلو بادشاہ کی بھیجی ہوئی سینا کی مدد سے، بڑی بہادری سے جنگ لڑی۔ اس نے اپنے چاچا کے بیٹے کو ناک چنے چبوائے اور یُدھ سے کامیاب لوٹی۔ راستے میں اس نے سوچا: ''ٹیلو بادشاہ یقیناً کوئی ولی ہے۔ ابھی میں نے سوچا ہی تھا کہ اسے میرے دل کا حال معلوم ہو گیا اور اس نے پانچ ہزار سپاہیوں کی صورت میں مجھے کمک دی۔'' شہزادی نے اپنے چاچا کے بیٹے کا سر قلم کروا دیا۔ خس کم جہاں پاک۔ اور یوں اپنے راستے کے پتھر کو ہمیشہ کے لیے ہٹا دیا۔ باپ کے تخت پر دریاباد بیٹھی۔ پورے ملک میں اُس کے نام کا سکّہ جاری ہوا اور اس کی حکومت بہت مستحکم ہو گئی۔

ایک دن دریاباد فوج لے کر، سوداگر کے ساتھ، ٹیلو بادشاہ سے ملنے کے لیے روانہ ہوئی تا کہ خود اس کا شکریہ ادا کر سکے۔ چوں کہ دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا، فقط سوداگر ہی کو ٹیلو کی پہچان تھی، ایک وہی اُس کا اتا پتا جانتا تھا اس لیے اسے بھی ہم راہ لیتی گئی۔ جب دریاباد سینا کے ساتھ، دریا کنارے چلتی چلتی وہاں پہنچی تو ٹیلو سمجھا کہ کوئی سلطانہ مجھ پر حملہ کرنے اور مجھے پکڑنے کے لیے آ گئی ہے۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ٹیلو وہاں سے بگ ٹٹ بھاگا، چھیدی بادشاہ کے شہر جا چھپا۔

دریاباد بھی پیچھے پیچھے آ گئی۔ اس کی فوج نے چھیدی کی راج دھانی کا محاصرہ کر لیا۔ دریاباد نے مطالبہ کیا کہ ہمارا ایک مجرم فرار ہو کر تیرے شہر میں آ چھپا ہے۔ اگر اپنی اور اپنے شہر کی خیریت چاہتا ہے تو اسے فی الفور ہمارے حوالے کر دے۔ بصورتِ دیگر ہم تیرے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ چھیدی بادشاہ نے سوال کیا کہ اس نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے؟ دریاباد بادشاہ زادی کی طرف سے جواب آیا کہ اس نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ اسے ہم نے ہر صورت میں ڈھونڈنا ہے۔

اسی دن چھیدی بادشاہ نے سارے شہر میں ڈونڈی پٹوا دی کہ صبح تڑکے شہر کے تمام مرد میرے دربار میں حاضر ہوں۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ اگلی صبح پورے شہر کے مرد جوق در جوق دربار میں آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک لمبی قطار لگ گئی۔ دریاباد اور سوداگر بھی دربار میں موجود تھے۔ چھیدی بادشاہ نے سوداگر سے کہا: ''لو، آگے بڑھو اور اپنے مجرم کو پہچانو۔'' لوگ قطار میں کھڑے تھے۔ سوداگر چلتا چلتا آگے بڑھتا رہا اور ایک ایک کر کے سب کو غور سے دیکھتا رہا، انھیں پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر سب لوگ گزر گئے، قطار ختم ہو گئی۔ سوداگر مڑا اور دریاباد سے کہنے لگا:

''حضور! ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔'' چھیدی بادشاہ حیران ہو کر بولا: ''سارے شہر کے مرد تو آ گئے ہیں، اب کون رہ گیا؟'' یہ سُن کر ایک دو آدمی بولے: ''ارے! ارے! ٹیلو کو پکڑ کے لاؤ۔ ایک وہی رہ گیا ہے، کیا خبر وہی ہو۔'' بعضے کہنے لگے: ''ارے! چھوڑو، دفع کرو، وہ بھلا کس گِنتھ (شمار) میں ہے۔ اسے یہاں لانے کا کیا فائدہ؟'' بعض بولے: ''ارے بابا! لاؤ تو سہی۔'' کُچھ لوگ بھاگے بھاگے گئے اور ٹیلو کو پکڑ لائے۔ جب ٹیلو ڈرتا، کانپتا دربار میں آیا تو سوداگر نے فوراً پہچان لیا اور پکار کے کہا: ''یہی تو ٹیلو بادشاہ ہے، یہی تو ٹیلو بادشاہ ہے۔'' دریاباد اسی وقت آگے بڑھی، اس نے اپنے سر سے تاج اُتارا اور ٹیلو کے سر پہ رکھ دیا اور کہا: ''اگر تو میری مدد نہ کرتا، تو نہ میں ہوتی اور نہ میری بادشاہت۔ تیری ہی وجہ سے آج میں یہاں موجود ہُوں اور روئے زمین پر میرا ایک ملک ہے۔ اس لیے فی الحقیقت تُو ہی میرا بھی مالک ہے اور میرے ملک کا بھی۔'' دریاباد بادشاہ زادی نے صرف اپنا تاج ہی ٹیلو کے سر پر نہیں رکھا بلکہ اسے اپنا سر تاج بھی بنا لیا۔ ٹیلو اور دریاباد کی شادی نہایت شان و شوکت سے انجام پائی۔ شادی کا سارا بندوبست چھیدی بادشاہ نے کیا۔ اسی کے محل سے دریاباد کا ڈولا اُٹھا۔ یوں خُدا کی قدرت سے دریا کنارے آوارہ پھرنے والا واقعی دریاباد کا مالک ہو گیا، خود کو ٹیلو بادشاہ کہنے والا واقعی بادشاہ بن گیا۔

جمعرات ۴/جون ۲۰۰۹ء

مرچو

"مرچو" پنجاب کی ایک خاص اور منفرد لوک کہانی ہے۔ اس انداز کی ایک اور کہانی پنجاب کے دیہاتوں میں "مونگی" کے نام سے سنائی جاتی ہے۔

بہت دن ہوئے، پنجاب کے کسی گاؤں میں ایک آدمی رہتا تھا۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ گاؤں کے سب لوگ اسے "مرچو، مرچو" کہہ کر پکارتے تھے۔ مرچو کا باپ انتہائی غریب آدمی تھا۔ گھر میں چوہے قلابازیاں کھاتے تھے۔ نہ کھانے کو چپاتی، نہ پہننے کو کپڑا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ مرچو گھر بار کی ہوتی لیکن باپ کا یہ مقدور کہاں۔ ننگی کیا نہائے گی، کیا نچوڑے گی۔ آخر غربت سے تنگ آ کے ایک دن اس نے لڑکی کو آگے کسی کے ہاتھ بیچ دیا۔ وہ شخص خریدنے کے بعد مرچو کو اپنے گاؤں لے گیا۔ اب اور آفت آئی۔ گاؤں کے لوگ مرچو پر آوازے کسنے لگے، عورتیں طعنے مہنے دینے لگیں کہ "ہائیں! ہائیں! قیامت کے آثار ہیں۔ باپ نے پیسے کے لیے بیٹی کو بیچ دیا۔" اور تو اور جس آدمی نے خریدا تھا، وہ بھی رات دن، آٹھوں پہر بوٹیاں توڑتا تھا۔ آخر کار اخیر ہوگئی۔ مرچو کو صبر کا یارا نہ رہا۔

ایک روز کا ذکر ہے، مرچو کا آدمی حسبِ معمول جلی کٹی سنانے کے بعد اپنے کام پر چلا گیا۔ پیچھے گھر میں مرچو اکیلی تھی۔ اس نے جی کڑا کیا۔ روپیہ پیسا، زیور گہنا، کپڑا لتا غرض گھر کا گھر سمیٹا اور فرار ہو کر کسی دوسرے گاؤں پہنچ گئی۔ وہاں جا کے اس نے زمین جائیداد خریدی، رہنے کے لیے عالی شان مکان بنوایا۔ مرچو کو یقین تھا کہ میرا نام نہاد خاوند خاموش نہیں بیٹھے گا۔ میرا کھوج لگا رہا ہوگا۔ ایک دن ضرور میرے پیچھے آئے گا۔ چناں چہ اس نے گاؤں کے دو چار ہٹے کٹے نوجوانوں کو ملازم رکھ لیا۔ انھیں اپنے گھر کے باہر پہرا دینے پر مامور کر دیا اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ اس شکل صورت، رنگ روپ کا آدمی اگر گھر کے آس پاس بھی نظر آئے تو جانے نہ پائے۔ خوب خبر لیجو۔ جی بھر کے ٹھکائی کیجو۔ اور یہ لو چادر، پٹائی کے بعد اس میں باندھ دینا۔

آخر وہی ہوا، جس کا انتظار تھا۔ ایک رات مرچو کا شوہر، مرچو کی سن گن لیتا ہوا گھر تک آ پہنچا۔ بس پھر کیا تھا، چوکیداری پر مامور جوانوں نے اسے جا پکڑا اور اس کے بعد اس کے ساتھ جو ہوئی تو بہ ہی بھلی۔ پیٹ پیٹ کے بچارے کا کچومر نکال دیا۔ جب وہ بے ہوش ہو کے گر گیا تو مرچو کی ہدایت کے مطابق بڑے سے سفید کپڑے میں باندھ دیا۔ مرچو نے خوش ہو کر، دل کھول

کے لڑکوں کو انعام دیا اور پھر کہنے لگی: ''اب ذرا اس پنڈ (گٹھر) کو اُٹھا کے میرے سر پر رکھ دو۔''
سب نے مل کر پنڈ اُٹھائی اور مرچو کے سر پہ رکھ دی۔ رات ماں کا پیٹ ہے۔ سب گاؤں والے لمبی تان کے سوئے ہوئے تھے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ مرچو پنڈ اُٹھائے، خاموشی اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی گلیوں میں چلتی، خراماں خراماں گاؤں سے باہر نکل آئی۔

آگے گھنا جنگل تھا۔ عین اس وقت سات چور راجے کا خزانہ لُوٹ کے اُدھر سے گزر رہے تھے۔ اتفاق سے اُن کا مرچو سے آمنا سامنا ہو گیا۔ انھوں نے جب کسی کو بڑی سی پنڈ سر پہ رکھے آتے دیکھا تو رُک گئے اور پُوچھا: ''تُو کون؟'' مرچو بڑے دھڑلے سے بولی: ''میں کالا چور[1]'' ''اب مرچو نے پُوچھا: تم کون؟'' وہ یک زبان ہو کر بولے: ''ہم بھی کالے چور''۔ چور بہت خوش تھے کہ اپنی ہی برادری کے ایک شخص سے ملاقات ہوگئی ہے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ مرچو نے پُوچھا: ''تمھارے پاس کیا؟'' چوروں نے خوش ہو کر جواب دیا: ''ہم راجے کا خزانہ لُوٹ کے لائے ہیں'' پھر چوروں نے مرچو کے سر پر رکھی پنڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''اور تمھارے پاس کیا؟'' مرچو بولی: ''سونے کا پچُّو۔[2]'' مثل مشہور ہے: چور کے اور سانپ کے پیر کہاں۔ چوروں نے آپس میں مشورہ کیا: ''ہم راجے کے خزانے سے لُوٹی ہوئی اتنی ساری سونے کی اشرفیاں کہاں رکھیں گے؟ کیسے ٹھکانے لگائیں گے؟ کچھ دیر بعد صبح ہونے والی ہے۔ کہیں اشرفیوں سمیت پکڑے ہی نہ جائیں۔ ثبوت کے ساتھ گرفتار ہوئے تو کیا ہوگا؟ راجے کا خزانہ لُوٹنے کی سزا موت سے کیا کم ہوگی۔ کیوں نہ یوں کریں کہ لوٹا ہوا خزانہ اسے دے دیں اور بدلے میں سونے کا پچُّو لے لیں۔ جب تک شاہی خزانہ پاس رہے گا، گویا موت کا فرشتہ بھی تعاقب میں رہے گا۔ جتنی جلدی ممکن ہو، اس خزانے سے نجات حاصل کرو۔'' سچ ہے: ''چوراں دے کپڑے تے ڈانگاں دے گز[3]'' انھوں نے مرچو کے آگے یہ تجویز رکھی۔ مرچو کو بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ اس نے فوراً اس رائے سے اتفاق کر لیا۔ چناں چہ شاہی خزانہ مرچو کے حوالے کر دیا گیا اور بدلے میں سونے کا پچُّو یعنی چادر میں بندھا ہوا بے ہوش آدمی سر پر اُٹھائے ساتوں چوروں

---

[1] کالا چور: بڑا بھاری اور نامی چور۔ فرضی آدمی۔ ایسی جگہ بولتے ہیں جہاں نام بتانا مقصود نہ ہو۔

[2] پچُّو: ہاون، لکڑی یا لوہے کی اوکھلی۔

[3] لفظی ترجمہ: چوروں کے کپڑے اور لاٹھیوں کے گز۔ یعنی چور چوری کے مال کو بڑا سستا بیچ دیتے ہیں، اسے مالِ مفت دلِ بے رحم کی طرح بے دردی سے ضائع کر دیتے ہیں۔

نے اپنا راستہ لیا۔ اُدھر مرچو چوروں کی بے وقوفی پر مسکراتی ہوئی، بے شُمار دولت سمیٹے، ابھی فجر کا تارا ڈوبا نہیں تھا کہ گاؤں لوٹ آئی۔

صبح سویرے کا وقت تھا۔ چڑیاں درختوں پہ بیٹھی چُوں چُوں کر رہی تھیں، جب چور سر پر سونے کا پِنڈ اُٹھائے اپنے گھر پہنچے۔ انھوں نے دہلیز پار کرتے ہی پنڈ صحن میں پھینکا تا کہ اُسے توڑ کر سات حصے کیے جا سکیں اور سونا ساتوں چوروں میں برابر برابر تقسیم ہو سکے۔ جب پنڈ میں بندھا آدمی دھم سے صحن کے فرش پہ گرا تو اس نے ہال ہال (ہائے ہائے) کرنا شروع کی۔ پہلے تو چوروں کے پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی کہ جانے پنڈ میں کیا بلا ہے؟ آخر انھوں نے دل کڑا کیا۔ ڈرتے ڈرتے پنڈ کھولی۔ ارے! یہ کیا۔ چادر کے اندر سے ایک آدمی نکل آیا، جس کے جسم پر جگہ جگہ نیل پڑے ہوئے تھے۔ بدن کُپا سا ہو گیا تھا اور وہ بے اختیار ہائے ہائے کر رہا تھا۔ چوروں نے بھاگم بھاگ مُنھ سے پانی کا پیالہ لگایا۔ کچھ دیر بعد جب اوسان میں آیا، وہ کچھ کہنے سُننے کے قابل ہوا تو اس نے اپنی ساری رام کہانی چوروں کو سنائی۔ اب سب کو اندازہ ہوا کہ مرچو کیا داؤ کر گئی۔ یہ تو وہی بات ہوئی چور پر مور پڑنا۔ چوروں نے اسے دلاسا دیا کہ ہم مرچو سے دو دو ہاتھ کریں گے۔ تمھارا بدلہ بھی لیں گے اور اپنا حساب بھی بے باق کریں گے۔

اُدھر مرچو بھی اس بات سے آگاہ تھی کہ پہلے تو ایک تھا، اب آٹھ آئیں گے۔ کہیں لاعلمی ہی میں حملہ آور نہ ہو جائیں۔ مرچو نے ایک تدبیر کی: وہ دن کو تو لمبی تان لیتی تھی، گھوڑے بیچ کر سوتی تھی؛ کیوں کہ دن کی روشنی میں چوروں کے آنے کا امکان کم تھا۔ لیکن جونہی رات پڑتی، مکئی کے دانے بھنا کر بیٹھ جاتی اور چرخہ کاتنے لگتی۔ ساری رات دانے چباتی جاتی اور چرخہ کاتتی رہتی۔ اس بہانے وہ رات بھر جاگتی۔ پاس ہی ایک بڑی سی، خُوب تیز چُھری بھی پڑی رہتی، تا کہ ضرورت کے وقت کام میں لائی جا سکے۔ آخر ایک رات وہی ہوا، جس کا ڈر تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ جب آٹھ لوگوں نے مرچو کے گھر پہ ہلّا بولا۔ سات تو چور تھے اور آٹھواں مرچو کا خریدار شوہر۔ وہ چُپ چپاتے آئے اور کمرے کی دیوار میں سنھ (نقب) لگانی شروع کر دی۔ مرچو کے کان بھی سیہے (خرگوش) کے کان تھے۔ ہولے ہولے آتی دھمکنے کی آواز پر اُس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے چُھری اُٹھائی اور اس کی تیز دھار پہ انگلی پھیرتی ہوئی دیوار کے ساتھ لگ کے، اس مقام کے پاس کھڑی ہو گئی، جہاں سنھ لگ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ دیوار میں اتنا بڑا سوراخ ہو گیا کہ ایک آدمی

---

۵ کھگی: (مونث) کھجور کا پتا

گھٹنوں کے بل گزر کے اندر آ سکے۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ ایک چور نے سوراخ میں مُنہ ڈالا کہ دیکھ سکے اندر کوئی ہے تو نہیں۔ مرچو نے آن کی آن میں چھری مار کر اس کی ناک کاٹ دی۔ وہ سُوں سُوں کرتا پیچھے ہٹ گیا اور اپنے ساتھیوں سے بولا: ''یار گھگی چبھ گئی۔'' رات کی تاریکی میں کسی کو بھی اصل بات کا پتا نہ چل سکا۔ ایک چور سوراخ میں مُنہ ڈالتا، جونہی ناک کٹتی، کہتا: ''یارو! گھگی چبھ گئی۔'' دوسرا کہتا: ''تم ایک طرف ہو جاؤ، میں مُنہ ڈال کے دیکھتا ہوں۔'' غرض باری باری ساتوں چوروں نے دیوار کے سوراخ میں مُنہ ڈالا۔ مرچو نے چھری سے وار کر کے ساتوں کی ناک کاٹ دی۔ گوبر سے لیپے ہوئے کمرے کے کچے فرش پر خُون میں لت پت سات کٹی ہوئی ناکیں پڑی تھیں۔ جب آٹھویں یعنی مرچو کے سابقہ شوہر نے سوراخ میں مُنہ ڈالا اور مرچو نے اس کی ناک کاٹی تو اس نے واویلا کیا، دوہائی دی اور کہا: ''احمقو! یہ ہمارے چہروں پر گھگی نہیں چبھ رہی بلکہ مرچو ہماری ناک کاٹ رہی ہے۔'' یہ سُنتے ہی وہ سب یہ کہتے ہوئے دم دبا کے بھاگے: ''آج ہمارا داؤ نہیں لگا۔ کوئی بات نہیں، پھر آئیں گے۔'' غرض اپنی وہ ناک جس پر وہ مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے، مرچو کے پاس ہی چھوڑ آئے۔

مرچو انھیں ایسے ہی چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اس نے رات کی تاریکی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے چوروں کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ تعاقب کرتے کرتے وہ اس گاؤں تک جا پہنچی، جہاں چور رہتے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ مرچو اُن کا پیچھا کرتے کرتے اُن کے گاؤں تک آ پہنچی ہے۔ اُس کے بعد مرچو واپس آ گئی۔ چند دن بعد وہ دوبارہ وہاں پہنچی۔ چوں کہ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی، گاؤں کی گلیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس لیے مرچو گاؤں کے باہر ہی ایک کھیت کے پاس، کریر کی جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کے بیٹھ گئی اور پو پھٹنے کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد گاؤں کے مرغوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر بانگیں دینی شروع کر دیں۔ گاؤں کی کچی مسجد میں فجر کی اذان ہوئی۔ صبح کے دھندلکے میں مرچو گاؤں میں داخل ہو گئی اور آتے جاتے لوگوں سے پُوچھنے لگی: ''بھائیو! میں پیدل چلتی، گرتی پڑتی بہت دور سے آئی ہوں۔ اس گاؤں میں میرے آٹھ نک وڈھے (ناک کٹے) بھائی رہتے ہیں۔ میں ان کی ایک ہی بہن ہوں۔ ایک مدت کے بعد ادھر آنا ہوا ہے۔ ذرا بتانا ان کا گھر کہاں ہے؟'' لوگوں نے بتایا کہ گاؤں کی دوسری نکڑ پر ایک بابا جی اور ایک مائی کا گھر ہے، وہ آٹھوں انھی کے ساتھ رہتے ہیں۔ پھر کیا تھا، مرچو پُوچھتی پچھاتی اس گھر تک جا پہنچی اور ایک دیوار کے سائے میں کھڑی ہو کر انتظار کرنے لگی کہ وہ آٹھوں کب گھر سے باہر

نکلتے ہیں۔تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور آٹھوں نک وڈّھے اپنے کام پر روانہ ہو گئے۔اب مرچو کی
باری تھی، وہ دیوار کے پیچھے سے نکلی اور دروازہ جا کھٹکھٹایا۔

اسّی نوّے سال کی ایک بوڑھی امّاں نے دروازہ کھولا۔نہ مُنہ میں دانت، نہ پیٹ میں
آنت۔مرچو نے مائی سے کہا: ''میرا نام مرچو ہے۔میں آٹھ نک وڈّھے بھائیوں کی اکیلی بہن
ہوں۔مجھے میرے بھائیوں سے مِلا۔'' یہ سُن کر مائی بہت خوش ہوئی۔وہ اسے گھر کے اندر لے
گئی۔صحن میں کیکر کا درخت اگا ہوا تھا۔اس کے نیچے ایک چارپائی بچھی تھی، جس پر ایک بڑے
میاں لیٹے ہوئے تھے۔مائی نے ایک پیالے میں بکری کا دودھ ڈال کے مرچو کو پیش کیا۔اس کے
بعد کہنے لگی: ''تمھارے آٹھوں نک وڈّھے بھائی واڈھی (کنک کی کٹائی) کرنے کے
لیے کھیتوں میں گئے ہوئے ہیں۔میں ابھی جاتی ہوں اور انھیں بلا کر لاتی ہوں۔اُنھیں بتاتی ہوں
کہ تمھاری بہن مرچو تم سے ملنے آئی ہے۔وہ بہت خوش ہوں گے۔'' پھر اس نے بڑے میاں کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''اور ہاں، تھوڑی دیر کے بعد میرے شوہر کی آنکھوں میں دوائی
ڈال دینا۔ان کی آنکھ آئی ہوئی ہے۔'' اتنا کہہ کے مائی نے آنکھوں کی دوا مرچو کے ہاتھ میں تھمائی
اور نک وڈّھے بھائیوں کے لیے گُڑ کا شربت تیار کرنے لگی۔شربت ایک گڑوے میں لے کر وہ گھر
سے نکلی اور کھیتوں کی طرف روانہ ہو گئی۔

نک وڈّھے درانتیاں پکڑے، گندم کی کٹائی میں مصروف تھے۔جب مائی کھیتوں میں
پہنچی تو آٹھوں نے درانتیاں پھینکیں اور بھاگے بھاگے آئے۔جب وہ مزے سے گڑ کا شربت پی
رہے تھے تو مائی کہنے لگی: ''پُترو! تمھاری بہن مرچو تم سے ملنے آئی ہوئی ہے۔میں اسے گھر میں بٹھا
کے تمھیں بلانے آئی ہوں۔'' جب چوروں نے یہ سُنا تو انھوں نے شربت کے پیالے پھینکے اور یہ
کہتے ہوئے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے: ''امّاں! ہم لُٹ گئے، ہم برباد ہو گئے۔کنک کی کٹائی
کر کے، بڑی محنت سے جو پیسے جمع کیے تھے، مرچو ضرور اُنھیں اُڑا کے اب تک رفو چکر ہو چکی ہو
گی۔بلکہ اس نے تو پورے گھر کا صفایا کر دیا ہو گا۔'' وہ بھاگم بھاگ، گرتے پڑتے، ہانپتے کانپتے
گھر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی ساری توقعات پُوری ہو چکی ہیں۔گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا
ہے۔بابا جی چارپائی پہ بیٹھے دوہائی دے رہے ہیں اور سُوں سُوں کرتے ہوئے پُکار رہے ہیں:
''ہائے! میری آنکھیں، ہائے لال مرچیں۔'' نک وڈّھے چوروں نے آگے بڑھ کر گھڑے سے
پانی لیا۔بابا جی کی آنکھوں پر چھینٹے مارے، آنکھیں دھوئیں۔بمشکل بابا جی اتنا بتانے کے قابل

ہوئے کہ مرچو واقعی مرچو نکلی۔ اِسمِ بامسمّٰی اپنے نام کے عین مطابق اس نے بڑے میاں کی آنکھوں میں دوائی کی جگہ پسی ہوئی لال مرچیں ڈال دیں۔ پھر دو تین ڈنڈے پیٹھ پہ مارے اور کہا: "بتا پیسے کہاں رکھے ہیں، ورنہ میں ڈنڈے مار مار کے تیری چمڑی ادھیڑ دوں گی۔" بابا جی نے اپنی زندگی بچانے کے لیے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ جان بچی، لاکھوں پائے۔ مرچو نے چوروں کے آنے سے پہلے پہلے سارے روپے پیسے نکالے، گھر کا صفایا کیا اور نو دو گیارہ ہوگئی۔ چور کے گھر گٹھ کٹا۔

آٹھوں نک وڈّھے چوروں نے مرچو کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ مرچو بھاگ بھاگ کر تھک گئی۔ پسینے میں شرابور ہوگئی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ایک پیپل کا درخت نظر آیا۔ مرچو ہانپتی کانپتی اس پر چڑھ گئی اور ایک ٹہنے پر شاخوں اور پتوں میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ آٹھوں نک وڈّھے بھی بھاگتے دوڑتے، پسینے پسینے، مرچو کا پیچھا کرتے ہوئے اتفاق سے اُسی درخت کے نیچے آ پہنچے۔ اُن کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ بھاگ بھاگ کے اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ اب ان میں نہ مزید آگے جانے کی طاقت تھی اور نہ پیچھے پلٹنے کی ہمت۔ اتنے میں شام ہوگئی۔ اُنھوں نے اس درخت سے ذرا ہٹ کے رات گزارنے کا ارادہ کر لیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ باری باری ایک پہرا دے گا اور باقی سوئیں گے۔ وہ مرچو سے اتنے خوف زدہ تھے کہ انھوں نے سوچا: ایسا نہ ہو کہ ہم سب سو جائیں اور مرچو کہیں سے اچانک نمودار ہو کے، ہماری غفلت سے فائدہ اُٹھا کے، ہمیں موت کی نیند سُلا دے۔ چناں چہ رات بھر وہ باری باری پہرا دیتے رہے۔ ایک چوکیداری کرتا اور باقی سات بے فکر ہو کر خوابِ خرگوش کے مزے لُوٹتے۔ یوں رات گزرتی رہی اور ایک ایک کر کے ساتوں چوروں نے چوکیداری کا فریضہ انجام دے دیا۔ جب پہرہ دینے کی باری آٹھویں چور کی آئی، تو مرچو ہولے ہولے پیپل سے نیچے اُتر آئی۔ اس سے پہلے کہ آٹھواں چور شور مچا کے سوئے ہوئے سات چوروں کو جگاتا، مرچو نے اُس کے مُنھ میں اپنا دوپٹا ٹھونس دیا۔ پھر وہ اسے کھینچتے ہوئے کچھ دُور لے گئی اور کہنے لگی: "ان ساتوں کو یہیں چھوڑ کر آ جا میرے ساتھ۔ میں تجھ سے بیاہ کر لوں گی۔" چور کو پہلے تو اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔ مرچو بے حد حسین تھی۔ چور خوش خوش اس کے ہم راہ چل پڑا۔ تھوڑی دُور جا کے مرچو اس سے کہنے لگی: "آ جا، ہم نکاح کریں"۔ چور نے پوچھا: "اس جنگل ویرانے میں ہم دو۔ اُوپر سے رات۔ نہ نکاح خواں۔ نہ گواہ۔ بھلا نکاح کیسے ہوگا؟" مرچو بولی: "مجھے پتا ہے نکاح کیسے ہوگا۔ تم مُنھ سے اپنی جیبھ نکالو، میں اپنی جیبھ نکالتی ہوں۔ جب جیبھ سے جیبھ لگائیں گے تو ہمارا نکاح ہو جائے

گا۔'' یہ سُن کر بے اختیار چور کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ پھولا نہ سماتے ہوئے اس نے بہت زیادہ زبان باہر نکالی کہ ہمارا نکاح ہونے لگا ہے، خُوب اچھی طرح ہو جائے۔ مرچو نے بھی زبان نکالی۔ اور پھر وہ ہوا جس کی چور کو ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی۔ مرچو نے اچانک تیز دھار کی چُھری سے وار کیا، جو اس نے پتا نہیں کہاں سے نکال لی تھی اور چور کی باہر کو لٹکی زبان آناً فاناً کاٹ ڈالی۔ یہ حملہ اس قدر اچانک تھا کہ چور کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ چیخیں مارتا ہوا پیچھے کو مڑا اور بگٹٹ بھاگا۔ اس کی کٹی ہوئی زبان وہیں گھاس پہ پڑی رہ گئی۔

نک کٹا جو، اَب جیبھ کٹا بھی ہو چکا تھا، گرتا پڑتا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا۔ وہ گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے تھے۔ چور ''دَڈ، دَڈ'' کرتے ہوئے اُنھیں جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگانے لگا۔ زبان کٹ جانے کے باعث الفاظ اُس کے مُنہ سے صحیح طرح نہیں نکل رہے تھے۔ چور انگڑائیاں لیتے، آنکھیں ملتے اُٹھے۔ ایک تو جنگل، اُوپر سے اماوس کی رات۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سُوجھتا تھا۔ سونے پر سُہاگہ کسی کا ''دَڈ، دَڈ'' کرتے ہوئے جھنجوڑنا۔ سب سمجھے تو بس اتنا سمجھے کہ جنگل کی کوئی بلا آ پڑی ہے، کوئی چڑیل آ چمٹی ہے۔ پھر کیا تھا، وہ سب ڈر گئے اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ جیبھ کٹا چور بھی اُن کے پیچھے پیچھے دوڑا۔ یہ سوچ کر کہ بلا ہمارا تعاقب کر رہی ہے، وہ اور خوف زدہ ہو گئے، اور زیادہ تیز بھاگنے لگے۔ آخر ایک چور کو کچھ محسوس ہوا، اس نے اپنے ساتھیوں کو روکا اور کہا: ''ارے! ارے! یہ تو ہمارا ہی ساتھی ہے۔ ہم خواہ مخواہ اس سے ڈر کے بھاگ رہے ہیں۔'' سب حیران ہو ہو کے اسے دیکھنے لگے اور پُوچھنے لگے کہ تیرے ساتھ کیا بنا؟ اس نے اِشاروں اِشاروں میں بتایا کہ مرچو نے میری زبان کاٹ دی ہے۔ نک کٹوں کے پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی۔ اب تک تو وہ گاؤں میں صرف ''نک کٹے'' کہلاتے تھے اور اب ''جیبھ کٹے'' کے نام سے بھی پکارے جائیں گے۔ یہ سوچ کر ہی انھیں جُھرجُھری آئی۔ ''نک کٹے'' کے ساتھ ساتھ ''جیبھ کٹے'' کہلانے کا اُن میں سے کسی کو بھی [illegible] نہیں تھا۔ اُنھوں نے دل میں سوچا کہ ''ہم چور ہیں لیکن مرچو تو ہماری بھی اُستاد ہے۔ ہم نے راجوں مہاراجوں کو لوٹا اور یہ ہمیں ہی لوٹ کے چلتی بنی۔ یہ ہمیں چین سے نہیں رہنے دے گی۔ یہ ہمیں نہیں چھوڑے گی۔'' وہ مرچو سے اتنے خوف زدہ ہوئے کہ اپنا علاقہ ہی چھوڑ کے چلے گئے اور کہیں دور جا کے بس گئے۔ مرچو کا سابقہ شوہر بھی ان کے ساتھ ہی چلا گیا اور مرچو سکون سے زندگی بسر کرنے لگی۔

منگل ۱۷۔ مارچ ۲۰۰۹ء

قاضی کی بیوی

لوک کہانیاں کسی معاشرے میں ہونے والے ''مخصوص جرائم'' کی داستانیں بھی سناتی ہیں۔ مثال کے طور پہ ''ٹھگی'' برصغیر پاک و ہند کا ایک قدیم پیشہ تھا۔ چودھویں صدی سے سترہویں صدی عیسوی تک کے سیاحتی سفرناموں میں جگہ جگہ ٹھگوں کے تذکرے ملتے ہیں۔ خصوصاً بھارت کے صوبے یو۔ پی کا مشہور شہر اور ہندوؤں کا بڑا تیرتھ بنارس ''ٹھگوں کا شہر'' مشہور تھا۔ آج بھی ''بنارسی ٹھگ'' کی ترکیب زبانِ زدِ خاص و عام ہے۔ اس خوب صورت کہانی کی موموٹھگیاں پرانے وقتوں کی کٹنیوں کی نفسیات اور ان کے دلچسپ ہتھ کنڈوں سے پردہ اٹھاتی ہیں۔ یہ کہانی پڑھ کے ہمیں بے اختیار جہاں اردو کے اولین ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کے عظیم ناول ''مراۃ العروس'' کی کٹنی ''ججن'' یاد آجاتی ہے، وہیں شولا پور کے تاریخی ڈپٹی کمشنر ''کرنل میڈوز ٹیلر (Colonel Meadows Taylor)'' کا تہلکہ مچا دینے والا کردار ''ٹھگ امیر علی'' بھی ذہن کے دریچوں سے جھانکنے لگتا ہے۔

پُرانے وقتوں کی بات ہے۔ کسی گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا۔ اُس کے چار بیٹے تھے۔ سب سے چھوٹا بیٹا خُوب پڑھا لکھا اور قاضی کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ باقی کے تین لڑکے آبائی پیشے سے منسلک رہے اور باپ کے ساتھ مل کے کھیتی باڑی کرنے لگے۔ سب کی شادیاں ہوئیں۔ قاضی کی شادی جس عورت سے ہوئی وہ سچ مچ کی ''پدمنی'' تھی۔ خُوب صُورت، نازک اندام، متناسب الاعضاء، بال شبِ دیجور کی طرح کالے، آنکھیں آہوئے ختن کی طرح بڑی بڑی، چھاتی گول، ناک کے نتھنے دل فریب، دل کش طرزِ گفتگو، صبا رفتار، مہذّب، اِزار بند کی سچّی۔ مختصر یہ کہ شوہر کی طرح ہی پڑھی لکھی بھی تھی اور نیک بھی۔ صُورت بھی خُوب تھی اور سیرت بھی۔

کسان کے تو سبھی لڑکے نیک اور اچھے نکلے۔ دوسری طرف کسان کے بڑے بھائی کی اولاد نکمی تھی۔ ایک تولے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی۔ سب لڑکے ایک تھان کے ٹکڑے، ایک تھیلی چٹے بٹے۔ پانچوں عیب شرعی۔ جب تائے کے لڑکوں نے قاضی کی بیوی دیکھی تو وہ اس پر بے ایمان ہو گئے۔ اب وہ رات دن اس کی عزّت لُوٹنے کے منصوبے بنانے لگے۔ انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم مَے کشی کی ایک محفل برپا کریں۔ اس میں قاضی کو بھی مدعو کریں۔ ساغر چھلکائیں۔ شراب کے دور پر دور چلیں۔ اسے خُوب مئے ارغوانی کے جام پلائیں، جب قاضی نشے میں دھت ہو کر گر پڑے تو ہم سب مل کے اُس کے گھر پر دھاوا بولیں، اُس کی بیوی کی عزّت اُتاریں، کھل کھیلیں، لیکن ان کا یہ منصوبہ شیخ چلی کا منصوبہ تھا۔ محض خیالی پلاؤ۔ کیوں کہ قاضی اُن کے داؤ میں آنے والا نہیں تھا۔ ان کی صحبت میں بیٹھنا تو درکنار، وہ تو ان کے سائے سے بھاگتا تھا۔ وہ اسے

شراب نوشی کی دعوت دیتے تو قاضی نہایت حقارت سے ٹھکرا دیتا۔ جب قاضی کے تایا زاد بھائیوں کی پیش نہ گئی، تو وہ اپنے مکروہ منصوبے کی تکمیل کے لیے کچھ اور سوچنے لگے۔

ایک شام قاضی عدالت سے واپس گھر آ رہا تھا کہ اُس کے بدکار تایا زاد بھائیوں نے اس کا رستہ روک لیا۔ جھوٹ موٹ کہنے لگے: ''ہم سب نے تیری بیوی سے زنا کیا ہے۔'' یہ سُن کر قاضی بہت پریشان ہوا۔ وہ ان کی ذلیل اور مکار فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ کچھ سوچ کر بولا: ''اگر یہ سچ ہے تو میری بیوی کے جسم کی کوئی نشانی بتاؤ؟'' داؤ اُلٹا پڑا تھا۔ ان بدمعاشوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ قاضی آگے سے یہ کہے گا۔ وہ تو بیوی کو شوہر کی نظروں سے گرا کر، ان کے بیچ غلط فہمی پیدا کر کے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ بھی قاضی تھا۔ صبح شام ثبوت اور شہادتوں کی بنیاد پر فیصلے کرتا تھا۔ پھر بھلا اپنے معاملے میں وہ محض کسی کی بات پہ یقین کیسے کر لیتا اور کہنے والے بھی وہ، جو خود جھوٹوں کے بادشاہ تھے۔ دعویٰ بغیر دلیل کے کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ قاضی کے تایا زاد بھائیوں سے جب جواب نہ بن پڑا تو وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے یہ کہہ کر چل دیئے: ''ہاں، ہاں، ہم ضرور تمھیں اُس کے جسم کی کوئی نشانی بتائیں گے۔''

گھر آ کر اُنھوں نے سوچا کہ اب کریں تو کیا کریں؟ کیسے اپنے دعوے کا ثبوت بہم پہنچائیں؟ اُنھوں نے دل میں کہا کہ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرنا چاہیے۔ جیسے بھی بن پڑے، قاضی کی بیوی کے جسم کی کوئی نہ کوئی نشانی ضرور ڈھونڈ کے لانی چاہیے، ورنہ ہماری ناک کٹ جائے گی۔ اُنھوں نے ایک مومومھگنی (کٹنی) کو بلایا۔ اسے الف سے ی تک ساری بات بتا کے کہا کہ اب ہماری عزّت تمھارے ہاتھ میں ہے۔ کچھ بھی ہو، قاضی کی بیوی کے جسم کی کوئی نشانی لاؤ۔ ہم تمھیں بھاری انعام دیں گے۔'' وہ چاتر آنکھیں مٹکا کے بولی: ''ہائے ہائے! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ مجھے چند دن کی مہلت دو۔ پھر دیکھنا، میں کیسا ہاتھ دکھاتی ہوں۔''

اگلے روز، جب قاضی عدالت گیا ہوا تھا، مومومھگنی نے دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ قاضی کی بیوی گھر میں اکیلی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو کٹنی اس کی بلائیں لینے اور صدقے قربان ہونے کے بعد کہنے لگی: ''میں تیرے گاؤں کی ہوں۔ تجھ سے ملنے آئی ہوں۔'' قاضی کی بیوی نے اسے اپنے گاؤں میں کبھی دیکھا تو نہیں تھا، لیکن چوں کہ دل کی نیک تھی، اس لیے مہمان کو اللہ کی رحمت تصوّر کرتے ہوئے گھر کے ساتھ ساتھ دل کے دروازے بھی کھول دیئے۔ اس کی خُوب خاطر داری کی۔ کٹنی نے وہیں رات گزاری۔ جب صبح ہوئی، قاضی کی بیوی نہانے لگی، تو چاتر عورت بولی: ''ہے ہے!

بنو، میں کس لیے ہوں۔ میں تجھے نہلاتی ہوں۔" قاضی کی بیوی کہنے لگی: "خالہ! تم رہنے دو۔ میں خود ہی نہالوں گی۔" لیکن مومو ٹھگنی تو زبردستی غسل خانے میں داخل ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بھی قاضی کی بیوی تھی۔ قاضی جی کے گھر کے چوہے بھی سیانے۔ سمجھ گئی کہ دال میں کالا ہے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، چھری اُٹھائی اور کٹنی کا کان کاٹ کر اُسے گھر سے نکال دیا۔

اس ناکامی پر قاضی کے تائے کے لڑکے خُوب سیخ پا ہوئے۔ اب اُنھوں نے دوسری مومو ٹھگنی کو بلایا۔ وہ بھی اپنے فن میں کامل ہونے کی دعوے دار تھی۔ بدقماش بھائیوں نے اس سے بھی وہی کُچھ کہا، جو پہلی کٹنی سے کہا تھا۔ اس نے بھی پہلی کی طرح بڑا بول بولا اور چند دن کی مہلت مانگی۔

ایک روز وہ بھی قاضی کے گھر ذرا دن چڑھے پہنچی۔ قاضی کی بیوی گھر میں اکیلی تھی۔ مومو ٹھگنی اس سے کہنے لگی: "میں ایک غریب عورت ہوں۔ دکھیاری۔ نہ کھانے کو روٹی، نہ پہننے کو کپڑا۔ اللہ تمھارا بھلا کرے۔ مجھ جنم جلی کو اپنے گھر میں ملازمہ رکھ لو۔ میں تمھارے سب کام کروں گی۔ بدلے میں کوئی تنخواہ نہیں لوں گی۔ بس سونے کو چھت دے دینا، پہننے کو چیتھڑا اور کھانے کو روکھی سوکھی"۔ قاضی کی بیوی نے اس پہ ترس کھایا اور اپنے ہاں ملازمہ رکھ لیا۔

یہ دوسرے تیسرے دن کا ذکر ہے۔ قاضی کی بیوی نہانے لگی تو مومو ٹھگنی بولی: "بیگم صاحبہ! میں خصموں جلی کس مرض کی دوا ہوں۔ میں تمھاری خادمہ ہوں۔ میں تمھیں نہلاتی ہوں۔" یہ سُن کر قاضی کی بیوی نے کہا: "بُوا تمھیں ہم نے گھر کے کام کاج کے لیے ملازم رکھا ہے۔ نہلانے کے لیے نہیں۔ بس اب چلتی ہو رہو۔ اپنے کام سے کام رکھو۔" مگر کٹنی چُپ بیٹھنے والی کب تھی۔ وہ تو لگی ضد کرنے کہ نہیں، نہیں، آج تو چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے، میں ہی نہلاؤں گی۔ اب تو قاضی کی بیوی کا ماتھا ٹھنکا کہ یہ چڑ بانک کون ہے؟ جو گلے پڑ رہی ہے۔ بس پھر کیا تھا، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، چھری اُٹھائی، مومو ٹھگنی کی ناک کاٹ ڈالی اور دھکے دے کر گھر سے نکال باہر کیا۔

اس دوسری ناکامی پر تو تائے کے بدمعاش لڑکے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ سوچنے لگے کہ بات بنتی مشکل ہی دکھائی دیتی ہے۔ خیر جو ہو سو ہو۔ اب کی بار اُنھوں نے سب سے بڑی مومو ٹھگنی کو بلوایا۔ وہ بھی ایک ہی حرافہ تھی۔ بوڑھی۔ مُنھ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت۔ بلا کی چاتر۔ سب گنوں پُوری، کوئی نہ کھولنڈ وری۔ بدقماش تایازاد کہنے لگا: "ہم تجھے مُنھ مانگا انعام دیں گے۔ بس تو قاضی کی بیوی کے جسم کی کوئی نشانی لے کر آ۔" وہ چھنال بولی: "میں اسمان نوں ٹاکی لا وی لینی آں، تے لاہ وی لینی آں ؎۔ میرے لیے تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔"

؎ آسمان میں تھگلی لگانا، آسمان میں چھید کرنا: کمال عیاری اور فریب کرنا، کٹنا پا کرنا

چند دن بعد وہ پھاپھا کٹنی قاضی کے گھر جا پہنچی۔ گلے میں تسبیاں، ہاتھ میں آبِ زم زم، مدینہ منورہ کی کھجوریں، خاکِ شفا، غلافِ کعبہ کا ٹکڑا گویا پہلی نظر میں یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی بی حجن جہاز سے اُتری ہے اور بندرگاہ سے سیدھی ادھر ہی چلی آرہی ہے۔ قاضی کی بیوی نے سلام کیا۔ پھاپھا کٹنی نے ڈھیروں دعائیں دیں۔ پانی مانگا۔ قاضی کی بیوی بھاگی بھاگی پانی لے آئی۔ کٹنی نے پیا۔ بولی: ''میں تیری پھوپھی ہوں۔'' قاضی کی بیوی حیران ہو کر کہنے لگی: ''لیکن میں نے تو آج سے پہلے تجھے کبھی نہیں دیکھا۔'' وہ بولی: ''بیٹی! تو دیکھتی بھی کیسے؟ میں تو تیرے پیدا ہونے سے بھی پہلے حج کرنے کے لیے چلی گئی تھی۔ وہاں ملکِ عرب میں میرا ٹکٹ گم ہو گیا۔ کئی برس محنت مزدوری کی، پیٹ کی آگ بھی بجھائی اور واپسی کا ٹکٹ خریدنے کے لیے روپے بھی جمع کیے۔ خُدا خُدا کر کے اس قابل ہوئی کہ دوبارہ اپنا وطن دیکھوں۔ اب واپس آئی ہوں تو پتا چلا کہ تیرا تو بیاہ ہو گیا ہے۔ بس دل پہ ضبط کرنا مشکل ہو گیا، صبر کی سہار نہ رہی۔ سیدھی ڈاک میں بیٹھی، تمھیں دیکھنے کے لیے یہاں چلی آئی۔''

قاضی کی بیوی کو شک پڑا کہ کہیں یہ بھی کوئی مومو ٹھگنی نہ ہو۔ بولی: ''اچھا اگر تو واقعی میری پھوپھی ہے تو میرے ماں باپ اور دوسرے رشتے دار کے نام پتے مجھے بتا۔'' اس شاطر عورت نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ چونڈا دھوپ میں سفید نہیں کیا تھا۔ وہ پوری تیاری کے بعد آئی تھی۔ اس نے یہاں آنے سے پہلے قاضی کی بیوی کے ماں باپ، عزیز رشتہ دار، اڑوس پڑوس کے نام پتے، زمین جائیداد کی تفصیل غرض سب معلومات حاصل کر رکھی تھی۔ اس نے فرفر سب کے نام پتے بتا دیے۔ بلکہ ہر ایک کا پورا شجرۂ نسب سنا دیا۔ یہ بھی بتایا کہ فلاں کی کتنی زمین، دکان کہاں کہاں ہے۔ اب تو قاضی کی بیوی کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ وہ اسے اپنی پھوپھو تسلیم کر لے۔ وہ مطمئن ہو چکی تھی یہ سوچ کر کہ کسی باہر والے کو ہماری پوری نسل کا پتا نہیں ہو سکتا۔ ناموں کا پتا ہوگا تو ہوگا مگر زمین، جائیداد کا پتا تو نہیں ہوگا۔

کٹنی قاضی کے گھر رہنے لگی۔ تیسرے چوتھے دن اس نے بھی اسی خواہش کا اظہار کیا جو سابقہ دو کٹنیوں کی زباں پر آچکی تھی۔ کہنے لگی: ''میں صدقے، میں قربان۔ بیٹی! دُودھوں نہاؤ پُوتوں پھلو۔ میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ تجھے اپنے ہاتھوں سے نہلاؤں۔'' قاضی کی بیوی نے فوراً انکار کر دیا۔ مگر وہ بھی اپنے فن میں مہارتِ تامہ رکھتی تھی۔ ٹھگی میں کامل تھی۔ خُوب جانتی تھی کہ کیسے انکار کو اقرار میں بدلا جاتا ہے۔ بولی: ''ہے ہے! بیٹی! اگر میں یہاں رہتی، عرب نہ جاتی تو تیرے بچپن میں [illegible] نے ہی تجھے نہلانا تھا، اور کس نے نہلانا تھا؟ اب تجھے نہلا دوں گی تو کیا ہو جائے

گا۔ ہائے ہائے! بنّو! میں تو تیری پھوپھی ہوں۔ پھوپھی سے لجا کیسی؟'' سیانے سے سیانا آدمی بھی کبھی نہ کبھی دھوکا کھا ہی جاتا ہے۔ قاضی کی بیوی ''پھوپھی'' کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئی۔ ہنس کے کہنے لگی: ''اچھا، پھوپھی اماں! آپ ہی مجھے نہلا دیں۔''

غرض اس روز موموٹھگنی نے قاضی کی بیوی کو غسل دیا۔ رات رہی۔ صبح ہوئی تو بولی: ''اچھا بنّو! اللہ حافظ۔ راج سہاگ قائم رہے۔ میرے لیے تیرے گھر کا دانہ پانی بس اتنا ہی لکھا تھا۔ بہت دن رہ لیے، اب چلتی ہوں۔ بنّو! کہا سنا معاف کر دینا۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔'' قاضی کی بیوی نے بہت کہا کہ پھوپھی اتنے سالوں بعد تو ملی ہو۔ چند دن تو اور رہو۔ مگر وہ نہ مانی۔ لاٹھی ٹیکتی ہوئی ہولے ہولے چل پڑی۔ جونہی قاضی کا گھر اوجھل ہوا، یہ جا، وہ جا۔ نام و نشان باقی نہ تھا۔

موموٹھگنی ناک کی سیدھ قاضی کے تایا زاد بھائیوں کے پاس پہنچی۔ بولی: ''لاؤ میرا انعام۔ قاضی کی بیوی کی ایسی جسمانی نشانی لائی ہوں کہ کیا یاد کرو گے۔'' وہ بدمعاش خوش ہو کر کہنے لگے: ''تیرے میں مُنھ میں گھی شکر۔ نشانی تو بتاؤ۔ انعام جو کہو گی ملے گا، تجھے سونے میں پیلی کر دیں گے۔'' کٹنی نے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر بڑے فخر سے سرگوشی کے انداز میں بولی: ''قاضی کی بیوی کی کندھ (پیٹھ) کے پیچھے ایک بڑا سا کالا تِل ہے۔'' بدقماش لڑکے بولے: ''بوا! سچ کہتی ہو۔ دیکھنا کہیں فضیحت نہ ہو جائے۔'' موموٹھگنی جھوٹ موٹ ناراض ہو کر بولی: ''جھوٹے کے مُنھ میں گُوہ۔ اگر میری بات غلط نکلے تو جو کالے چور کی سزا، وہ میری۔'' پھر وہ ان کی ہوس کی آگ اور بھی بھڑکاتے ہوئے کہنے لگی: ''صاحب! کانوں سنی نہیں، آنکھوں دیکھی کہتی ہوں۔ میں نے تو قاضی کی بیوی کو اپنے ان ہاتھوں سے نہلایا ہے۔ خُدا کی قسم، وہ تو تم لوگوں کے تصور سے بھی زیادہ حسین ہے۔'' قاضی کے تایا زاد بھائیوں نے ٹھگنی کو اس کی توقع سے کہیں بڑھ کے انعام دیا۔

اگلی صبح، جب قاضی عربی گھوڑے پہ سوار ہو کے، عدالت جا رہا تھا؛ تایا زاد بھائیوں نے رستہ روک لیا۔ بڑے دھڑلے سے کہنے لگے: ''تُو تو کہتا ہے میری بیوی بہت نیک اور پارسا ہے۔ سُن غور سے سُن۔ جب تُو عدالت میں چلا جاتا ہے تو وہ ہمارے پاس آ جاتی ہے۔'' پھر وہ شیطان قہقہے مار کر ہنستے ہوئے بولے: ''تُو ہم سے اُس کے جسم کی کوئی نشانی مانگتا ہے تو سُن، اُس کی پیٹھ کے پیچھے ایک بڑا سا تل کا نشان ہے۔''

وہ تو یہ بکواس کر کے ہنستے ہوئے وہاں سے چلے گئے اور بے چارے قاضی کو روح فرسا سوچوں کے بھنور میں غوطے کھانے کے لیے تنہا چھوڑ گئے۔ بات سچ تھی۔ اب قاضی سچ کو جھٹلائے

تو کیسے جُھٹلائے۔ بڑی دیر تک وہ سرِ راہ گھوڑا روکے، گُم صُم بیٹھا رہا۔ بڑی دیر تک اُس کے باطن میں جنگ ہوتی رہی۔ بڑی دیر تک اس کا وجود میدانِ کارزار بنا رہا۔ آخر وہ مسٹنڈے، تائے کے لڑکے جیت گئے۔ قاضی کو یقین ہو گیا کہ اس کی بیوی بدچلن ہے اور اس نے ان بدمعاشوں سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ تبھی تو وہ آوارہ اُس کے جسمانی رازوں سے واقف ہیں۔ وہ آگ ببولا ہو گیا۔ اس نے گھوڑے کو موڑ لیا اور ایڑ لگا دی۔ عدالت جانے کے بجائے وہ گھوڑے کو تیز دوڑاتا ہوا گھر کو پلٹا۔ گھر آتے ہی اس نے نہ کچھ پُوچھا، نہ کچھ سُنا۔ بس آن کی آن میں بیوی پر لعنت بھیجی اور اسی طرح گھوڑا دوڑاتا ہوا واپس عدالت چلا گیا۔

وہ بے چاری نیک بخت کھڑی کی کھڑی ہی رہ گئی۔ ہکا بکا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اُس کے ساتھ کیا ہُوا؟ اور کیوں ہُوا؟ آخر بہت سوچ بچار کے بعد ڈور کا سرا ہاتھ آ گیا، لیکن اُلجھی ڈور کو سلجھانا ابھی باقی تھا۔

قاضی کی بیوی نے گھر کے ایک وفادار ملازم کو ساتھ لیا، گھوڑے پہ بیٹھی اور چل دی۔ آخر ایک گاؤں کے قریب پہنچ کے وہ رک گئی۔ سب سے پہلے تو رہنے کے لیے ایک شان دار خیمہ لگوایا۔ پھر ایک نقارچی کا انتظام کیا اور اردگرد کے سارے علاقے میں ڈونڈی پٹوا دی: ''اُدھر گاؤں سے باہر، ایک ذی مرتبہ بیگم صاحبہ نے قیام کیا ہے۔ جو کوئی ان کے خیمے میں جا کر انھیں کوئی ہڈ وَرتی (آپ بیتی) یا جگ ورتی (جگ بیتی) سنائے گا، اسے ایک کلو آٹا اور ایک ٹکا انعام میں دیا جائے گا۔'' منادی سننے کی دیر تھی کہ لوگ جُوق در جُوق وہاں آنے لگے اور کہانیاں سنانے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میلہ لگ گیا۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔ قاضی کی بیوی ہر کہانی کہنے والے کو کلو آٹا اور ٹکا دیتی گئی۔ غریب غربا دُعائیں دیتے۔ آخر ایک دن وہ تینوں چاتر عورتیں بھی وہاں پہنچیں، جن کے لیے یہ ساری رام لیلا سجائی گئی تھی۔ قاضی کی بیوی نے اُنھیں دیکھتے ہی پہچان لیا، خود ان کے سامنے نہ ہوئی بلکہ خیمے کی دوسری جانب جا کے بیٹھ گئی۔ اپنے وفادار ملازم کو بلایا اور کہا: ''ان تینوں عورتوں سے ہڈ وَرتی سننا۔ جب سُنا لیں تو انھیں یہاں سے جانے نہ دینا بلکہ خیمے کے ایک طرف بٹھا لینا، اور ان سے کہنا کہ ارے تم نے تو بہت اچھی کہانی سنائی ہے۔ اس لیے تمھیں آٹا بھی باقیوں کی نسبت زیادہ ملے گا اور ٹکے بھی۔'' ملازم ساری بات سمجھ گیا۔

اب سب سے پہلے وہ کنّی آگے بڑھی، قاضی کی بیوی نے جس کا کان کاٹا تھا۔ بولی: ''کون سی بات (کہانی) سنو گے؟ ہڈ وَرتی یا جگ وَرتی؟'' خادم کہنے لگا: ''ہڈ وَرتی سُنا۔'' مومو

ٹھگنی نے اپنی ساری آپ بیتی کہہ سنائی کہ کیسے قاضی کے تایازاد بھائیوں نے ایک بھاری رقم کے عوض اسے قاضی کی بیوی کی جسمانی نشانی لانے کے لیے اُس کے گھر بھیجا اور کیسے نہلوانے کی ضد پر قاضی کی بیوی نے اس کا کان کاٹا اور دھکے دے کر گھر سے نکال باہر کیا۔ ساری پتا سُننے کے بعد خادم نے اس سے وہی بات کہی، جو بیگم صاحبہ نے کہنے کے لیے بولا تھا اور ایک طرف بٹھالیا۔

اب وہ کٹنی آگے بڑھی، قاضی کی بیوی نے جس کی ناک کاٹی تھی۔ خادم کے کہنے پر اس نے بھی بَڈ وَرتی سُنائی کہ کیسے قاضی کے تایازاد بھائیوں کے کہنے پر وہ بھی قاضی کے گھر، قاضی کی بیوی کے جسم کی کوئی نشانی لینے گئی تھی، اور کیسے قاضی کی بیوی نے اُس کے نہلانے کے اصرار پر اس کی ناک کاٹ ڈالی۔ ملازم نے اس سے بھی وہی الفاظ کہے، جو بیگم صاحبہ نے سمجھائے تھے اور ہاتھ پکڑ کے ایک طرف بٹھالیا۔

لیجیے صاحب! اب تیسری کٹنی کی باری آئی۔ وہ بڑے غرور سے چلتی ہوئی آگے بڑھی۔ کامیابی کے نشے میں مست، سر اُونچا کر کے، اس نے بڑی شان سے اپنی آپ بیتی سنانی شروع کی کہ کیسے جو کام سابقہ دو پھاپھا کٹنیوں سے نہ ہوسکا، وہ اس نے کر دکھایا۔ کس طرح قاضی کی بیوی کی پھوپھی بن کے، اُس کے گھر گئی، اس کا اعتماد حاصل کیا اور پھر کس طرح نہلانے کے بہانے اُس کے جسم کی نشانی حاصل کی، قاضی کے تایازاد بھائیوں کو بتایا، قاضی کی بیوی پر بدچلنی کا الزام لگا اور آخر کو میاں بیوی میں پھوٹ پڑی۔ ملازم کہنے لگا: ''بڑی بی! تم نے سب سے اچھا واقعہ سنایا۔ تمھیں سب سے زیادہ انعام ملے گا۔ یہیں بیٹھ جا۔''

تینوں موموٹھگنیوں کی کہانیاں سننے کے بعد قاضی کی بیوی پر سارا معاملہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکا تھا۔ اس نے ان تینوں کو پکڑا اور قاضی القضاۃ کی عدالت میں لے گئی۔ سپاہی بھیج کر قاضی کے تایازاد بھائیوں کو بُلوایا گیا۔ اپنی پاک دامن بیوی پر لعنت بھیجنے والے قاضی کو بھی طلب کیا گیا۔ اب سب کے بیانات دوبارہ سُنے گئے۔ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہوا۔ قاضی القضاۃ نے جلاد کو قاضی کے تایازاد بھائیوں اور تینوں کٹنیوں کی، اُن کے موجودہ اور سابقہ جرائم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، گردن مارنے کا فرمان جاری کیا۔ عدالت نے قاضی کو کان کا کچا ہونے پر خُوب لعن طعن کیا۔ پھر عدالت کے حکم پر قاضی نے اپنی بیوی سے معافی مانگی۔ اس کی خُوب صورتی کا قائل تو پہلے ہی تھا، اب عقل مندی کا قائل بھی ہوگیا۔

جمعہ ۲۲ مئی ۲۰۰۹ء

کھچڑی

یہ پنجاب کی ایک خاص لوک کہانی ہے۔اس کا طنز ومزاح امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔اس انداز کی چند اور لوک کہانیاں بھی پنجاب کے شہروں اور دیہاتوں میں مقبول ہیں۔

پُرانے زمانے کا ذکر ہے، گاؤں کا ایک سیدھا سادا، بھولا بھالا آدمی پہلی دفعہ گھر سے نکلا، کسی دوسرے شہر گیا اور اپنے دُور کے رشتہ داروں کے ہاں مہمان بن کے ٹھہرا۔ میزبان نے خُوب آؤ بھگت کی۔ دستر خوان بچھا۔ جہاں اور کھانے پیش کیے، وہیں کھچڑی بھی کھلائی۔ کھچڑی اس نے زندگی میں پہلی بار کھائی تھی۔ اسے بہت پسند آئی۔ وہ انگلیاں چاٹنے لگا اور گھر والوں سے پُوچھنے لگا کہ اس کھانے کا کیا نام ہے؟ اور اسے کیسے پکاتے ہیں؟ گھر کی ایک عورت نے بتایا کہ اسے کھچڑی کہتے ہیں اور پکانے کی ترکیب یہ ہے کہ سب سے پہلے چاول لو۔ ٹوٹا (ٹوٹے ہوئے چاول) ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ اچھی طرح چھٹنے کے بعد چاول پانی میں بھگو دو۔ پھر مسُور کی دال لو۔ چھُٹنے کے بعد اسے بھی پانی میں بھگو دو۔ اب ہنڈیا یا دیگچی میں چاول کے حساب سے پانی ڈالو۔ اگر ایک پیالی چاول ہیں تو دوگنا یعنی دو پیالیاں پانی کی ہونی چاہئیں۔ پھر چولھے پر رکھ دو۔ جب پانی اُبلنے لگے تو علیحدہ سے بھگوئے ہوئے چاول ہاتھ سے نکال نکال کے اس میں ڈالو۔ ساتھ ہی مَسُور کی بھگوئی ہوئی دال بھی ڈال دو اور نمک بھی۔ جب چاول آدھے پک جائیں تو اس میں گھی شامل کرو۔ جب پانی سارا خشک ہو جائے تو چند دانے چاول اور مَسُور کے نکالو اور دیکھو کہ گھل گئے ہیں یا نہیں۔ اگر جی مطمئن ہو تو دم دے دو۔ پانچ دس منٹ کے دَم پخت کے بعد چُولھے سے اُتار لو۔ لیجیے، صاحب! کھچڑی تیار ہے۔ مزے سے خود کھائیے، دوسروں کو کھلائیے۔

اسی روز مہمان کو گھر واپس جانا تھا۔ وہ پیدل پنڈ (گاؤں) کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی خواہش تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے گھر پہنچے اور بیوی سے فرمائش کرے کہ وہ اسے کھچڑی پکا کر کھلائے۔ اس ڈر سے کہ کہیں نام بھول نہ جائے، وہ راستے میں اُونچی آواز سے کہتا جاتا تھا: ''کھچڑی، کھچڑی۔'' جیٹھ ہاڑ کے دن تھے، پنج پہاڑ دن[1] دوپہر کا وقت۔ چلتے چلتے تھک گیا۔ راہ میں کیکر کا ایک گھنا درخت کھڑا تھا۔ جس کے کالے، سیاہ تنے سے گوند نکلا پڑتا تھا۔ وہ تھوڑا دم لینے کے لیے اُس کے سائے میں بیٹھ گیا۔ ہر طرف پھیلی خاموشی، بُول کی ٹھنڈی میٹھی، گھنی چھاؤں،

[1] پانچ پہاڑوں کے برابر دن۔ لمبے دن، گرمیوں کے دن

اُوپر سے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے جو آئے تو بے اختیار اس شخص کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ چند لمحوں بعد اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ وہیں زمین پر لیٹ کر خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگا۔

وہ زندگی میں اتنی بے فکری کی نیند پہلے کبھی نہیں سویا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اس کی آنکھ کُھلی تو کھچڑی، کھاچڑی'' بن چکا تھا۔ وہ کھچڑی کا لفظ بھول گیا تھا، اور اب اونچی آواز میں ''کھاچڑی'' کہتا ہوا چل پڑا۔ آگے ایک کسان نے اپنے کھیت میں بڑی محنت سے ہل جوت کے بیج بکھیرے ہوئے تھے۔ اب وہ وہاں بیٹھا رکھوالی کر رہا تھا۔ چڑیاں اُڑا رہا تھا، جو بیج کھانے کے لیے بار بار کھیت میں اُتر آتی تھیں۔ کسان تنگ آیا ہوا تھا۔ وہ پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ سونے پہ سہاگہ، ایک شخص ''کھاچڑی، کھاچڑی'' کہتا ہوا کھیت کی مینڈ پر سے گزرا۔ کسان لال پیلا ہوگیا۔ اس نے سوچا کہ ایک تو پہلے ہی چڑیاں میرے بیج کھا رہی ہیں اور اُوپر سے یہ آدمی بھی اُنھیں مزید دعوت دے رہا ہے، یہ کہہ کر کہ ''کھاچڑی!'' یعنی اے چڑیا! کھالے۔ گویا کھیت اُس کے باپ کا ہے۔ کسان نے اسے پکڑ لیا۔ پیٹ پیٹ کر بھُرکس نکال دیا اور پھر کہا: ''ابے! کھاچڑی! کھاچڑی! نہ کہہ۔ بلکہ کہہ: اُڈ چڑی! اُڈ چڑی!'' (اردو ترجمہ: اُڑ چڑی)۔

آدمی جسم سہلاتا ہوا اور ''اُڈ چڑی! اُڈ چڑی'' کہتا ہوا اپنے راستے پر ہولیا۔ آگے ایک چڑی مار نے چڑیاں پکڑنے کے لیے کسی کھیت میں جال بچھا رکھا تھا۔ گھر سے بے چارہ صبح سویرے سے امید لے کر نکلا تھا کہ آج بہت سی چڑیاں پکڑوں گا، لیکن اتنے انتظار کے بعد ایک چڑی بھی جال میں نہیں پھنسی تھی؛ سوچ رہا تھا کہ آج شاید خالی ہاتھ ہی گھر لوٹنا پڑے۔ اُوپر سے ایک شخص ''اُڈ چڑی! اُڈ چڑی!'' کہتا ہوا گزرا۔ چڑی مار کو بہت غُصہ آیا کہ ایک تو صبح سے جال میں کوئی چڑی نہیں پھنسی۔ رہی سہی کسر یہ نکال رہا ہے۔ چڑیوں سے کہہ رہا ہے: ''اُڈ چڑی!'' یعنی اے چڑیا اُڑ جا۔ چڑی مار نے اسے جا پکڑا اور وہ مار ماری کہ توبہ ہی بھلی۔ پھر کہا: ''ابے! اُڈ چڑی! اُڈ چڑی! نہ کہہ۔ بلکہ کہہ: آئی جاؤ تے پھنسی جاؤ'' (اردو ترجمہ: آتے جاؤ اور پھنستے جاؤ)۔

بے چارے کے جسم پر نیل پڑ گئے تھے۔ وہ ہائے ہائے کرتا ہوا اور ''آئی جاؤ تے پھنسی جاؤ'' کہتا ہوا پھر چل پڑا۔ آگے کوتوال اور سپاہی چور کو پکڑ کے کوتوالی لیے چلے جا رہے تھے۔ پہلے ہی بہت دوڑ دھوپ کے بعد اُن کے ہاتھ چور آیا تھا، اوپر سے ایک شخص ''آئی جاؤ تے پھنسی جاؤ'' کہتا ہوا پاس سے گزر رہا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ یہ تو ہمارے پیشے کا مذاق اڑا رہا ہے۔ جس طرح سے یہ کہہ رہا ہے کہ ''آئی جاؤ تے پھنسی جاؤ'' ہم ایسے ہی تو بلاوجہ کسی کو نہیں پکڑتے۔'' کوتوال

اور اُس کے سپاہیوں نے اسے پکڑلیا۔ غریب کو وہ بے بھاؤ کی پڑی کہ دشمن کو بھی خُدا بچائے۔ پھر کوتوال نے کہا: ''ابے! یہ نہ کہہ کہ ''آئی جاؤ تے پھنسی جاؤ'' بلکہ یوں کہہ: ''خُدا ایہہ ویلا کسے تے نہ لیاوے۔'' (اردو ترجمہ: خُدا یہ وقت کسی پر نہ لائے)۔

دکھتا ہوا جسم لیے، وہ ہانپتا کانپتا، یہ کہتا ہوا اپنے سفر پر روانہ ہو گیا کہ ''خُدا ایہہ ویلا کسے تے نہ لیاوے۔'' آگے ایک جنیت (بارات) چلی جا رہی تھی۔ لاڑا (دولھا) سہرا باندھے، گھوڑے پہ سوار تھا۔ پیچھے پیچھے جانجی (باراتی) تھے۔ باجے بج رہے تھے۔ لوگ ویلاں[ے] دے رہے تھے کہ اچانک باراتیوں کے کان میں ایک آواز پڑی: ''خُدا ایہہ ویلا کسے تے نہ لیاوے'' کُچھ سکتے میں آ گئے، کُچھ سٹپٹا کے رہ گئے کہ ایسی شُبھ گھڑی میں یہ کیا سُننے کو مل رہا ہے۔ پھر کیا تھا، انھوں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس شخص کو گچی (گدّی) سے پکڑ لیا، اور سب نے مل کر ایسا پیٹا، ایسا پیٹا کہ کچومر نکال دیا۔ پھر کہا: ''ابے! قسمت کے ہیٹے، یوں کہہ: خدا ایہہ ویلا سبھ تے لیاوے'' (اردو ترجمہ: خُدا یہ وقت سب پر لائے)۔

زخم زخم جسم لیے وہ دوبارہ چل پڑا۔ حالت یہ تھی کہ پاؤں کہیں رکھتا تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ ہونٹوں پر یہ جملہ ''خدا ایہہ ویلا سبھ تے لیاوے، خدا ایہہ ویلا سبھ تے لیاوے''۔ ماڑی (بری، کھوٹی) تقدیر، آگے ایک جنازہ جا رہا تھا۔ گلاب اور عُود میں بسی، سفید کفن میں لپٹی مَیّت ایک چارپائی پر اُٹھائے، لوگ کلمہ شہادت پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اتنے میں یہ حضرت بھی پاس سے گزرے، پکار پکار کے کہتے ہوئے: ''خدا ایہہ ویلا سبھ تے لیاوے۔'' ایک نہ دو دفعہ، لگا تار وِرْدْ ہو رہا تھا۔ مرنے والے کے رشتے دار پہلے ہی دکھ میں ڈوبے ہوئے تھے، اُوپر سے ایک شخص تسلّی کے دو بول بولنے کے بجائے یہ کہہ کر کہ ''خدا ایہہ ویلا سبھ تے لیاوے'' گویا زخم پر مشک چھڑک رہا تھا۔ اُنھوں نے مَیّت کو زمین پہ رکھا اور اس آدمی کو جا لیا۔ نیکی اور پُوچھ پُوچھ۔ جنازے میں شامل کُچھ اور لوگ بھی آگے بڑھے۔ پھر کیا تھا، کسی نے چانٹا مارا، کسی نے مکّا، کسی نے لات رسید کی۔ غرض سب نے مل کر وہ ٹھکائی کی کہ چمڑی ادھیڑ ڈالی۔ جی بھر کے ارمان نکالے، پھر کہنے لگے: ''ابے احمق! کہنا ہے تو یوں کہہ: ''ایہو جیہا ویلا کسے ویری دشمن تے وی نہ آوے'' (اردو ترجمہ: اس طرح کا وقت کسی دشمن پر بھی نہ آئے) زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ بے چارہ بدقسمت یہی کہتا ہوا چل پڑا۔ سوچ رہا تھا کہ جانے آج صبح ہی صبح کس کا مُنھ دیکھ لیا، جو یوں بار بار جوتی پیزار ہو رہی ہے۔ مسلسل مار پیٹ سے اس کا پتلا حال ہو چکا تھا۔ آخر تقدیر جاگی۔ شام ہو رہی تھی۔ کھیتوں

[ے] ویل: ڈوموں وغیرہ کو دیے گئے انعام کا برسرِ عام اعلان

میں گھرا، پیپل کے درختوں میں سے جھانکتا اس کا پیارا گاؤں نظر آ رہا تھا۔ کچے کچے گھر، گھروں سے اُٹھتا پاتھیوں (اُپلوں) کا دھواں، جو اس بات کی علامت تھا کہ گاؤں کی زنانیاں رات کا کھانا پکا رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر اس نے کچھ ہمت کی اور گرتا پڑتا یہ کہتا ہوا گاؤں میں داخل ہو گیا: ''ایہو جیہا ویلا کسے ویری دشمن تے وی نہ آوے۔'' عورتیں اس وقت کنوئیں سے پانی بھر رہی تھیں۔ بھاگی بھاگی آئیں، مُنھ سے پانی لگایا۔ پنڈ (گاؤں) کے مرد بھی دوڑے دوڑے آئے۔ بے چارے، قسمت کے مارے کو اُٹھایا اور گھر کی طرف لے چلے۔ وہ مسلسل ایک ہی وِرد کر رہا تھا: ''ایہو جیہا ویلا کسے ویری دشمن تے وی نہ آوے۔'' گاؤں والوں نے خیال کیا کہ شاید یہ اپنی حالت کی وجہ سے کہہ رہا ہے کہ جیسا بُرا وقت مجھ پہ آیا ہے، کسی دشمن پر بھی نہ آئے۔ گھر پہنچے۔ بیوی نے دیکھا تو خوب چیخم دھاڑ مچائی کہ: ''ہے ہے! ٹھیک ٹھاک گھر سے گیا تھا، یہ کس حال میں لوٹا۔ اسے کسی کی آئی آئے، خُدا کرے اُس کے ہاتھ ٹوٹ جائیں، جس نے میرے بھولے بھالے پر ہاتھ صاف کیے۔'' بے چاری دوپٹے سے آنسو پونچھتی جاتی تھی اور شوہر کو ٹکور کرتی جاتی تھی۔ اُدھر ڈھاک کے تین پات۔ شوہر چارپائی پہ پڑا یہی مالا جپ رہا تھا: ''ایہو جیہا ویلا کسے ویری دشمن تے وی نہ آوے''۔

اسی دوران میں ایک شخص دوڑا دوڑا گیا اور گاؤں کے وید کو بلا لایا۔ وید جی نے نبض دیکھی، جسم کے نیل دیکھے اور بولے: ''خُدا جھوٹ نہ بلوائے، بڑی کُھبی مار پڑی ہے۔'' جہاں جہاں خُون رس رہا تھا، حکیم جی نے مرہم پٹی کر دی۔ دوا دی۔ اُٹھ کے جانے لگے تو اُس کی گھر والی نے حسبِ دستور پوچھا: ''حکیم جی! پرہیز؟'' وید جی بولے: ''تیرے خاوند کی حالت بہت خراب ہے۔ اسے کوئی سخت غذا نہ دیجو۔ نرم غذا مثلاً کھچڑی وغیرہ کھلائیو۔'' جونہی اس شخص نے کھچڑی کا لفظ سُنا، وہ اپنا سارا دکھ، درد بُھول گیا اور پُکار پُکار کے کہنے لگا: ''ایہی تے سی، ایہی تے سی (اُردو ترجمہ: یہی تو تھی، یہی تو تھی)۔ بیوی کی سمجھ میں کُچھ نہ آیا۔ بہر حال اس نے کھچڑی پکا کے شوہر کے آگے رکھی تو اس نے یوں مزے لے لے کر، شوق سے کھائی جیسے صدیوں کا بھوکا ہو۔ چند ہفتوں بعد وہ صحت یاب تو ہو گیا مگر اس نے کھچڑی کھانی کبھی نہیں چھوڑی۔ کیوں کہ کھچڑی اس کی پسندیدہ ڈِش بن چکی تھی اور کیوں نہ بنتی، بڑے پاپڑ بیلنے کے بعد جو ہاتھ آئی تھی۔

سوموار ۲۳/مارچ ۲۰۰۹ء

بابا گویڑو ؎

اس خُوب صُورت لوک کہانی میں چند بہت ہی اچھے مشورے دیے گئے ہیں۔ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، لیکن یہی چھوٹی باتیں انسان کی زندگی کو بڑا حسین بنا دیتی ہیں۔ اس کہانی کا کوئی انجام نہیں ہے۔ راوی کے مطابق جب اس نے بچپن میں یہ کہانی سنی تھی تو اس میں چند اور بھی پیارے پیارے مشورے شامل تھے۔ لیکن اب وہ اسے بھول چکے ہیں۔ اس لوک کہانی کا مرکزی خیال اچھے مشورے کی اہمیت اور اچھے مشورے دینے والے کی عظمت کو نمایاں کرنا ہے۔

پُرانے زمانے کی بات ہے، پنجاب کے کسی گاؤں میں ایک بوڑھا شخص رہتا تھا۔ وہ اپنے گاؤں والوں کو ہمیشہ بہت اچھے اچھے مشورے دیا کرتا تھا۔ خُدا نے قدرتی طور پر اسے یہ صلاحیت بخشی تھی، لیکن صورتِ حال یہ تھی کہ: بھینس کے آگے بین بجائے، بھینس کھڑی پگرائے۔ گاؤں والے سمجھتے تھے کہ یہ ہمیں غلط مشورے دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے کام بنتے نہیں، بلکہ بگڑ جاتے ہیں۔ یہ ہمارے ہر کام میں ٹانگ اڑاتا ہے۔ ہم جو کام کر رہے ہوتے ہیں، اس میں خواہ مخواہ ٹوکم ٹاکا کرتا ہے۔ پہلے تو پیٹھ پیچھے کہتے تھے، ایک روز تو حد ہی ہو گئی، دیہاتیوں نے ڈنکے کی چوٹ اسے "پاگل" اور "دیوانہ" کہنا شروع کر دیا۔ اس نے کسی کام میں کچھ مشورہ دیا تو سب یک زبان ہو کر بولے: "تجھ کو پرائی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تُو۔"

گاؤں والوں کے اس رویّے پر بُوڑھا سخت مایوس ہوا۔ ایک دن وہ سچ مچ گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔ چلتے چلتے دُور، ایک گاؤں میں پہنچا۔ وہاں کے لوگ بہت اچھے تھے۔ ایک آدمی اُسے مہمان بنا کے اپنے گھر لے گیا۔ اس کی بیوی بھی بے حد نیک تھی۔ دونوں نے مہمان کی خاطر داری میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ان کے گھر میں دو کمرے تھے اور دو ہی گائیں۔ بھرا پُرا گھر تھا۔ جب رات پڑتی تو یوں کر لیا کرتے کہ ایک گائے ایک کمرے میں باندھتے اور گھر کے آدھے افراد، وہیں گائے کے پاس، چارپائیاں بچھا کے لیٹتے۔ دوسری گائے دوسرے کمرے میں باندھتے اور خاندان کے باقی کے آدھے لوگ وہاں گائے کے پاس سوتے۔ ایک دن تو بوڑھا مہمان یہ سب دیکھتا رہا، لیکن دوسرے دن اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے میاں بیوی سے کہا: "میری بات ذرا غور سے سنو۔ تمھارے دونوں کمروں میں مچھر بہت ہیں۔ ساری رات کان میں بھیں بھیں کرتے

؎ گویڑ: سوچ، خیال، اندازہ، جانچ، قیافہ، پرکھ۔ گویڑن / گویڑنا: سوچنا، غور و خوض کرنا
گویڑی / گویڑیا / گویڑو (تلفظ: گ۔ وے۔ ڑو): غور و خوض کرنے والا، اندازہ لگانے والا، مفکر، قیافہ شناس

رہے۔ مجال ہے جو پَل بھر کے لیے بھی آنکھ لگی ہو۔ مچھروں کی زیادتی اس وجہ سے ہے کہ کمرے میں گائے بندھی ہے۔ گائے ہوگی تو ظاہر ہے چارہ بھی ہوگا اور گوبر بھی۔ گندگی پر مچھر پرورش پاتے ہیں۔ تم لوگ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ایک کمرے میں دونوں گائیں باندھ دیا کرو اور دوسرے کمرے میں گھر کے سب افراد سو جایا کرو۔" گھر والے یہ مشورہ سُن کر بہت خوش ہوئے۔ بظاہر چھوٹی سی بات تھی لیکن ان میں اتنی سمجھ بوجھ ہی نہیں تھی کہ خود سوچ سکتے۔ چناں چہ سالہا سال سے یونہی رہ رہے تھے۔ اہلِ خانہ نے دل میں کہا: "ارے! یہ آدمی تو اپنے وقت کا ارسطو ہے۔" وہ اسے "بابا گویڑو" کے نام سے پکارنے لگے اور اُس کے بے حد شکر گزار ہوئے۔ بابا گویڑو نے سوچا: "یہی کام میں اپنے گاؤں میں کرتا تھا تو لوگوں نے "پاگل" کہنا شروع کر دیا۔ یہی کام یہاں کیا تو "بابا گویڑو" کہلایا۔ سچ ہے: "گھر دا جوگی جوگڑا، باہر دا جوگی سدھ ؎۔" میرے گاؤں والے ناقدرے تھے، لیکن یہاں کے لوگ قدر دان ہیں۔" ہولے ہولے وہ گاؤں بھر میں مشہور ہو گیا اور چند دن بعد جب وہ وہاں سے جانے لگا تو لوگوں نے کہا: "تم تو بابا گویڑو ہو۔ ہمیں چھوڑ کے مت جاؤ۔ خُدا کے لیے یہیں ہمارے پاس رہو، تا کہ تمھاری دانائی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔" لیکن جس نے جانا ہو، اسے بھلا کون روک سکا ہے۔

چلتے چلتے بابا گویڑو ایک اور گاؤں میں پہنچا۔ وہاں کے لوگ بھی بہت اچھے تھے؛ مہمان کو خُدا کی رحمت سمجھنے والے۔ ایک شخص اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے گھر میں لے گیا اور خُوب آؤ بھگت کی۔ گھر خاصا بھرا پُرا تھا۔ میزبان کے بیٹے بھی شادی شدہ تھے۔ سب گھل مل کر رہتے تھے۔ بابا گویڑو نے ایک بات کا مشاہدہ کیا کہ جب بھی گھر کا کوئی فرد باہر سے آتا ہے، گھر کی عورتیں اپنا کام، جو بھی وہ کر رہی ہوتی ہیں، چھوڑ چھاڑ کے اُٹھتی ہیں۔ اس کے لیے دو روٹیوں کا آٹا گوندھتی ہیں، روٹی پکا کے سامنے رکھتی ہیں۔ وہ روٹی کھانے لگتا ہے۔ یہ دوبارہ اپنے چھوڑے ہوئے کام میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ یہ سلسلہ ایسے ہی دن بھر جاری رہتا ہے۔ بابا گویڑو اپنی عادت سے مجبور تھا۔ ایک دن تو جیسے تیسے برداشت کیا، لیکن دوسرے دن گھر کی عورتوں کو اپنے پاس بلایا اور کہنے لگا: "بیٹیو! تم سلائی کڑھائی کر رہی ہوتی ہو۔ بار بار اپنا کام بیچ میں چھوڑتی ہو۔ بار بار آٹا گوندھتی ہو۔ بار بار روٹیاں پکاتی ہو۔ تمھارا سارا دن تو اسی اُٹھک بیٹھک میں گزر جاتا ہے۔ شام تک تھک کر چور ہو جاتی ہو۔ یوں کر لیا کرو کہ ایک دفعہ سارا آٹا گوندھ لیا اور ایک ہی دفعہ سب کے لیے روٹی

؎ یہی مضمون ایک اردو مثل میں یوں بیان ہوا ہے: "گھر کی مُرغی دال برابر۔"

پکالی۔ اس سے تمھارا وقت بھی بچے گا اور مشقت بھی کم کرنی پڑے گی۔" اب یہ بظاہر عام سی بات تھی، لیکن اُن عورتوں کو بالکل پتا نہیں تھی۔ انھوں نے اتنے اچھے مشورے پر اس کا بہت شکریہ ادا کیا۔ وہ اس کی عقل مندی پر اتنی خوش ہوئیں کہ انھوں نے بھی اسے بے اختیار "بابا گویڑو" کہہ کر پکارا۔ گاؤں کے سب لوگ اس کی دانائی سے متاثر ہوئے اور پھر ایک دن جب وہ وہاں سے جانے لگا تو لوگوں نے کہا: "تم تو بابا گویڑو ہو، ہمیں چھوڑ کے مت جاؤ۔ خُدا کے لیے یہیں ہمارے پاس رہو، تاکہ ہم تمھاری دانائی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔" لیکن جس نے جانا ہو، اُسے بھلا کون روک سکا ہے۔

چلتے چلتے بابا گویڑو ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچا۔ اب کے وہ جس گھر میں ٹھہرا، ان کا بیٹا بہت بیمار تھا۔ لیکن گھر والوں کو اتنی سمجھ بوجھ بھی نہیں تھی کہ اسے کسی حکیم کو دکھائیں۔ دوا دارو کرنے کے بجائے گھر ہی میں لٹا کے ٹونے ٹوٹکے کر رہے تھے۔ لیکن ٹوٹکوں سے گا جیں نہیں ٹلتی ہیں۔ ایک دن تو بوڑھا مہمان دیکھتا رہا اور حیران ہوتا رہا کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ بیمار بے چارے کی حالت یہ تھی کہ منکا ڈھلک گیا تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ گھر والوں سے بولا: "ارے خُدا کے بندو! یہ کیا کر رہے ہو۔ فوراً لڑکے کو کسی وید جی کے پاس لے کر جاؤ۔" یہ سُن کر وہ کہنے لگے: "ہم نے تو آج تک اپنے کسی بیمار کو کبھی کسی وید کو نہیں دکھایا۔ اس کا بخار بھی اپنے آپ اُتر جائے گا اور یہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" لیکن مہمان نے پھر اصرار کیا: "بھلا ایسے کیسے خود بخود ٹھیک ہو گا۔ دوا درمن کرنا انسان کا کام ہے اور شفا دینا بھگوان کا۔ وقت ضائع نہ کرو۔ فوراً کسی حکیم کو بلا کے لاؤ۔"
گھر والے کہنے لگے: "لیکن ہم کیسے بلائیں؟ ہمارے چھوٹے سے گاؤں میں تو کوئی حکیم نہیں اور ہمیں کچھ پتا نہیں کہ حکیم کہاں ملے گا؟" دانا مہمان کہنے لگا: "میں تمھیں ایک تدبیر بتاتا ہوں۔ تم لوگ گاؤں کے پاس سے گزرنے والے راستے پر جا کر کھڑے ہو جاؤ۔ اور جو کوئی بھی راہی مسافر گزرے، اس سے کسی وید کا پتا پوچھو۔ کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی وید کا تھوہ ٹکانا (پتا، ٹھکانہ) ضرور بتائے گا۔" انھوں نے ایسا ہی کیا۔ راستے پہ جا کے کھڑے ہو گئے اور آتے جاتے لوگوں سے حکیم کا پتا پوچھنے لگا۔ آخر ایک مسافر نے بتایا کہ تین کوس پر فلاں گاؤں میں ایک بہت اچھا حکیم رہتا ہے۔ عمر رسیدہ ہے اور بے حد تجربہ کار۔ مریضوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہ سُن کر انھوں نے اپنے مریض کو اٹھایا؛ بیل گاڑی میں ڈالا اور اسی وید کے پاس لے گئے۔ وید جی نے بیمار کا نہایت تسلی سے معائنہ کیا۔ دوا دارو کیا۔ پرہیز بتایا۔ گھر والے بچے کو واپس گھر لے آئے۔ باقاعدہ علاج

سے وہ دو تین دن میں ٹھیک ہو گیا۔ سب اہلِ خانہ بوڑھے مہمان سے بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے: "بابا جی! اگر آپ ہمیں اچھا مشورہ نہ دیتے تو یقیناً ہم اپنے لال کو کھو دیتے۔" سب نے اسے "بابا گو یڑو" کا نام دیا۔ چند دن بعد جب وہ وہاں سے بھی جانے لگا، تو لوگوں نے کہا: "تم تو بابا گو یڑو ہو۔ ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ۔ خُدا کے لیے یہیں ہمارے پاس رہو، تا کہ ہم تمھاری دانائی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔" لیکن جس نے جانا ہو، اسے بھلا کون روک سکا ہے۔

چلتے چلتے بابا گو یڑو کے رستے میں ایک گاؤں آیا۔ وہاں کے لوگ بھی بے حد اچھے اور مہمان نواز تھے۔ ایک شخص اسے اپنے گھر لے گیا۔ بوڑھے مہمان نے وہاں ایک عجیب بات کا مشاہدہ کیا: گھر والے جس کمرے میں کھانا کھانے بیٹھتے تھے، وہاں سوائے دہی کے ہر چیز دستر خوان پر موجود ہوتی تھی۔ دہی کا برتن دوسرے کمرے میں رکھتے تھے۔ کھانے کے دوران میں جس کو ضرورت پڑتی، وہ اپنا پیالہ لے کر دستر خوان سے اُٹھتا، دوسرے کمرے میں جاتا۔ حسبِ ضرورت پیالے میں دہی لیتا، پھر پیالہ اُٹھائے واپس پہلے کمرے میں دستر خوان پہ آ کے بیٹھ جاتا اور سب کے ساتھ مل کر کھانا کھانے لگتا۔ ایک دن تو بابا گو یڑو دیکھتا رہا، لیکن دوسرے دن بول ہی پڑا: "یہ تم لوگ کیا کرتے ہو۔ باری باری، اُٹھ اُٹھ کے سب لوگ دوسرے کمرے میں جاتے ہو اور تھوڑا تھوڑا، اپنی اپنی ضرورت کے مطابق دہی لے کر آتے ہو۔ ایک دفعہ ہی سارا کھانا، دہی سمیت، دستر خوان پر کیوں نہیں چُن لیتے۔ جس کو ضرورت ہو، ہاتھ بڑھائے، وہیں سے دہی اٹھائے اور مزے سے کھائے۔ اس اُٹھا بیٹھی سے تو نجات ملے۔" گھر والوں نے سنا تو بہت خوش ہوئے، بولے: "ارے! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ہمارے ذہن میں کیوں نہ آئی؟ اس پر عمل کر کے تو ہم بہت زحمت سے بچ جائیں گے۔" انھوں نے ایسا اچھا مشورہ دینے پر مہمان کا شکریہ ادا کیا۔ گاؤں والوں نے اسے "بابا گو یڑو" کہہ کے پکارا۔ اور جب ایک دن وہ جانے لگا تو سب لوگ جمع ہوئے، بولے: "تم تو بابا گو یڑو ہو۔ ہمیں چھوڑ کے مت جاؤ۔ خُدا کے لیے یہیں ہمارے پاس رہو، تا کہ ہم تمھاری دانائی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔" لیکن جس نے جانا ہو، اسے بھلا کون روک سکا ہے۔

یوں بابا گو یڑو کا سفر جاری رہا اور آج بھی جاری ہے۔ آج بھی بابا گو یڑو ہر ملک کے ہر شہر، قصبے، گاؤں اور گھر میں، کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی موقع پر، ہر شخص سے ضرور ملتا ہے۔ اسے کوئی نہ کوئی ایسا اچھا اور قیمتی مشورہ دیتا ہے، جس سے اس شخص کی زندگی بہت آرام دہ ہو جاتی ہے، یا وہ

کسی بھاری مصیبت سے بچ جاتا ہے۔ اگر تمھاری ملاقات بھی کبھی بابا گویڑو سے ہو تو اس کی بات غور سے سننا، اس کی قدر کرنا اور اُس کے مفت کے، لیکن بہت قیمتی مشورے پر عمل کرنا۔

سوموار ۲۰ر اپریل ۲۰۰۹ء

سوئے کرم جگانا (۱)

یہ کہانی اصل میں ، ایک طویل کہانی کی تمہید ہے۔ مجھ تک اس لوک داستاں کی دو روایتیں (narrations) پہنچی ہیں۔ درج ذیل روایت کی ایک انفرادیت ہے اور وہ یہ کہ کہانی کے آخر میں "کرم" یعنی تقدیر کو مشخص اور متشکل کر کے پیش کیا گیا ہے۔ یہ "ایلیگری" Allegory یا "تمثیل" کا انداز ہے۔ ایلیگری کسی صنف سخن کا نہیں بلکہ اسلوب کا نام ہے۔ Personification اس کی بنیاد ہے جس سے مراد ہے۔ غیر مرئی خیال کو مرئی خیال میں، غیر مادی اشیاء کو مادی صورت میں، یا کسی مجرد (Abstract) چیز کو مجسم کر کے پیش کرنا۔

ایک عرصہ گزرا، کسی گاؤں میں دو بھائی رہا کرتے تھے۔ دونوں شادی شدہ تھے۔ ماں باپ کب کے فوت ہو چکے تھے۔ اب وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔ جب کاتک کا مہینہ آیا تو دونوں بھائیوں نے اپنے اپنے کھیت میں ہل چلایا۔ گندم بوئی۔ دونوں باری باری کھیتوں کو پانی دیتے۔ رفتہ رفتہ پودے زمین میں سے سر نکال کے باہر جھانکنے لگے۔

ایک روز اپنی باری پر بڑا بھائی چھوٹے بھائی سے کہنے لگا: "میں کھیتی کو پانی دیتا ہوں۔ تم بھاگم بھاگ جاؤ اور گھر سے کھانا لے آؤ۔" یہ سُن کر چھوٹا بھائی گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں بڑے بھائی نے رَہٹ سے اپنے کھیتوں کو خُوب پانی لگایا؛ تاکہ زیادہ سینچنے سے اُس کے کھیتوں میں چھوٹے بھائی کی نسبت زیادہ فصل اُگے۔ اب وہ ہمیشہ اپنی باری پر ایسا ہی کرتا۔ چھوٹے بھائی کو کھانا لینے کے بہانے گھر بھیج دیتا۔ بعد میں اپنے کھیتوں کو خُوب سیراب کرتا۔

آخر بیساکھ کا مہینہ آیا۔ سب گاؤں والوں نے مل کر بیساکھی کا تہوار منایا۔ گندم کی بالیاں دھوپ میں پک کر سنہری ہو چکی تھیں۔ کھیتوں میں ہر طرف سونا ہی سونا بکھرا تھا۔ فصل کٹنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ دھوم دھام سے کٹائی شروع ہوئی۔ کٹی ہوئی فصل کے ڈھیر لگنے لگے۔ دونوں بھائیوں نے بھی فصل کاٹی۔ پریاں [1] باندھی گئیں۔ اب فصل گاہنے [2] کی نوبت آئی۔ سب سے پہلے پیڑی [3] جمائی گئی۔ پھر دو بیلوں کے پیچھے پھلاہ [4] باندھا گیا۔ پھلاہ پر وزن ڈالنے کے لیے ایک آدمی کھڑا ہو گیا۔ بیل اناج پر پھرنے لگے، اپنے پیروں سے بالیوں کو روندنے اور مسلنے لگے۔ دانے بالیوں میں سے باہر نکلنے لگے۔ گاہن کے بعد تنگلی [5] کی مدد سے کنک اُڑائی گئی، یعنی فصل اُوپر کو اچھالی گئی تاکہ ہوا سے بھوسا الگ ہو جائے اور دانے الگ۔ جب

---

[1] پری : فصل کے گٹھے
[2] گاہن/گاہنا: اناج پر بیلوں کو پھرانا
[3] پیڑی: گاہنے کے لیے دائرے کی صورت میں بکھرا ہوا کھلیان
[4] پھلاہ/پھلاہی : کیکر کی قسم کا ایک درخت یا جھاڑی
[5] تنگلی/ترنگل: ایک شاخ دار، پنجا نما آلہ

بوہل[1] لگایا گیا تو چھوٹے بھائی کا بوہل بڑا تھا اور بڑے بھائی کا کم۔ یہ دیکھ کر بڑے کو بڑی حیرت ہوئی۔ دل میں کہنے لگا کہ میں نے تو اپنی جوت کے کھیت کو زیادہ پانی دیا تھا۔ اس کے باوجود میری فصل کم ہوئی۔ دوسری طرف چھوٹے بھائی کی جوت کے کھیت کو کم پانی دیا مگر پھر بھی اس کی فصل زیادہ ہوئی۔ اس نے چھوٹے بھائی سے پوچھا: ''ہم دونوں نے مل کر فصل بوئی تھی۔ ایک جیسی محنت کی تھی۔ پھر تمھاری پیداوار کیوں زیادہ ہے؟ اور میری کیوں کم؟'' چھوٹے بھائی نے جواب دیا: ''بات صاف ہے۔ میرے نصیب جاگ رہے ہیں اور تیرے کرم سوئے ہوئے ہیں۔ تو دریا کے کنارے جا اور اپنے سوئے بھاگ جگا''۔ یہ کہہ کر اس نے بڑے بھائی کو وہ کلمہ کلام بھی بتایا جو اس نے دریا کے کنارے پہنچ کے پڑھنا تھا اور جس کے پڑھتے ہی بقول چھوٹے بھائی کے، اُس کے سوئے کرم جاگ جائیں گے۔

اگلے روز پو پھٹتے ہی بڑا بھائی اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔ چلتا چلا جا رہا ہے؛ چلتا چلا جا رہا ہے۔ چلتے چلتے رستے میں بیری کا ایک درخت آیا۔ شکر دوپہر (سخت دوپہر) ہوگئی تھی۔ لمبے، پیدل سفر سے وہ تھک گیا تھا۔ سانس لینے کے لیے اس کی ٹھنڈی، گھنی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ جب آنکھ اُٹھا کے اُوپر دیکھا، بیری پر سرخ سرخ بیر لگے نظر آئے۔ مُنہ میں پانی بھر آیا۔ بیری پر چڑھا۔ جونہی بیر توڑے، بیری میں سے آواز آئی: ''اونہوں[2]! جب سے میں اگی ہوں، میرے بیر کسی نے نہیں کھائے۔ اے انسان! اگر تُو کھائے گا تو فوراً مر جائے گا۔ اس لیے خیریت اسی میں ہے کہ میرے اُوپر سے اُترو اور راستہ ناپو۔'' یہ سُنتے ہی بڑے بھائی کے کان کھڑے ہوگئے۔ مٹھی میں جتنے بیر تھے، سب زمین پر پھینک دیے۔ نیچے اتر آیا اور سفر کا دوبارہ آغاز کیا۔

چلتا چلا جا رہا ہے، چلتا چلا جا رہا ہے۔ چلتے چلتے رستے میں کھجور کا ایک درخت آیا۔ آنکھ اُٹھا کے اُوپر دیکھا تو پکی ہوئی کھجوروں کے گچھے لٹکتے دکھائی دیے۔ مُنہ میں پانی بھر آیا۔ دل کڑا کر کے کھجور پر چڑھنا شروع کیا۔ چڑھتے چڑھتے ہانپنے لگا۔ آخر منزل تک جا پہنچا۔ جونہی کھجوروں کا گچھا توڑا، کھجور میں سے آواز آئی: ''اونہوں! جب سے میں اُگی ہوں، میری کھجوریں کسی نے نہیں کھائیں۔ اے انسان! اگر تو کھائے گا تو فوراً مر جائے گا۔ اس لیے خیریت اسی میں ہے کہ میرے اُوپر سے اُترو اور راستہ ناپو۔'' یہ سُنتے ہی بڑے بھائی کے کان کھڑے ہوگئے۔ مٹھی

---

[1] بوہل: اناج کا ڈھیر، خرمن

[2] اُونہوں: اُونھ! نہ، نہیں، بہت خوب! واہ! نیز کراہنے کی آواز

میں جتنی کھجوریں تھیں، سب زمین پر پھینک دیں۔ ہولے ہولے کھجور سے نیچے اُتر آیا اور سفر کا دوبارہ آغاز کیا۔

چلتا چلا جا رہا ہے، چلتا چلا جا رہا ہے۔ ایک جگہ دیکھا کہ وَن کے ایک درخت تلے، ہری ہری دوب میں ٹھنڈے میٹھے پانی سے بھرے مٹی کے دو گھڑے رکھے ہیں۔ اُدھر بڑے بھائی کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ زبان خشک ہو گئی تھی۔ پیاس کے مارے جان لبوں پر تھی۔ بے اختیار پانی کے مٹکوں کی طرف بڑھا۔ جلدی جلدی مٹی کے پیالے میں پانی انڈیلا۔ ابھی پیالہ ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ گھڑے میں سے آواز آئی: ''اونہوں! جب سے ہم یہاں پڑے ہیں، کسی نے ہمارا پانی نہیں پیا۔ اے انسان! اگر تو پیے گا تو فوراً مر جائے گا۔ اس لیے خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے اُٹھو اور راستہ ناپو۔'' یہ سُنتے ہی بڑے بھائی کے کان کھڑے ہو گئے۔ پیالے کو اُلٹایا اور پانی زمین پر گرا دیا۔ کپڑے جھاڑ کے اُٹھ کھڑا ہوا اور سفر کا دوبارہ آغاز کیا۔

چلتا چلا جا رہا ہے، چلتا چلا جا رہا ہے۔ چلتے چلتے رستے میں ایک ندی آئی۔ بڑے بھائی نے ندی کے کنارے کھڑے ہو کر کچھ دیر سوچ بچار کیا۔ آخر جی کڑا کیا اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اچانک اُس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی، سنہری مچھلی کی دم آ گئی۔ اچک کر مچھلی پر سوار ہو گیا اور بولا: ''مچھلی! مچھلی! مجھے ندیا پار کراؤ۔'' مچھلی کہنے لگی: ''اونہوں! جب سے میں پیدا ہوئی ہوں، مجھ پر کسی نے سوار ہو کر سفر نہیں کیا۔ اے انسان! اگر تُو کرے گا تو فوراً ڈوب جائے گا۔ اس لیے خیریت اسی میں ہے کہ میرے اُوپر سے اُترو اور راستہ ناپو۔'' یہ سُنتے ہی بڑے بھائی کے کان کھڑے ہو گئے۔ مچھلی سے نیچے اُتر آیا۔ ہاتھ پاؤں مارتا ہوا، بمشکل ندی کے دوسرے کنارے سے آ لگا۔ بہت دیر تک پڑا رہا۔ جب اوسانوں میں آیا تو اُٹھ کھڑا ہوا اور سفر کا دوبارہ آغاز کیا۔

چلتا چلا جا رہا ہے، چلتا چلا جا رہا ہے۔ چلتے چلتے رستے میں ایک گھنا جنگل آیا۔ وہ سوچنے لگا: اب جنگل کیسے پار کروں؟ آنکھ اُٹھا کے جو دیکھا تو ایک نہایت خُوب صورت، لال سرخ گھوڑی، ہری ہری گھاس چرتی نظر آئی۔ بڑا بھائی خوشی سے کھلے جا رہا تھا۔ بے اختیار اس کی اور بڑھا۔ اُچک کر اس پہ سوار ہوا اور بولا: ''اے گھوڑی! مجھے جنگل کے پار لے چلو۔'' گھوڑی کہنے لگی: ''اونہوں! جب سے میں پیدا ہوئی ہوں، مجھ پر کسی نے سفر نہیں کیا۔ اے انسان! اگر تُو کرے گا تو فوراً گر کر مر جائے گا۔ اس لیے خیریت اسی میں ہے کہ میرے اُوپر سے اُترو اور راستہ ناپو۔'' یہ سُنتے ہی بڑے بھائی کے کان کھڑے ہو گئے۔ گھوڑی سے نیچے اُتر آیا اور سفر کا دوبارہ آغاز کیا۔

چلتا چلا جا رہا ہے، چلتا چلا جا رہا ہے۔ آخر جنگل ختم ہو گیا۔ اب جو آنکھ اُٹھا کے دیکھا تو

سامنے دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کے کنارے بوہڑ (بڑ) اور ٹاہلی (شیشم) کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ بڑا بھائی ایک ٹاہلی کی ٹھنڈی، گھنی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ من ہی من میں یہ بھی خوف کہ اگر ناکام لوٹا تو دیکھنے سُننے والے کہیں گے: ارے! یہ تو وہی مثل ہوئی: "دریا پر جانا اور پیاسے آنا۔" تاہم دل کڑا کیا اور آنکھیں بند کر کے چھوٹے بھائی کا بتایا ہوا کلمہ کلام پڑھنے لگا، جس کی تاثیر سے سوئے ہوئے کرم جاگ جاتے ہیں۔ جونہی وظیفہ ختم ہوا، آواز آئی، کانوں میں رس پڑا: "اے اللہ کے بندے! تُو یہاں کہاں؟" بڑے بھائی نے آنکھیں کھولیں۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سامنے ایک جوان، بالکل اس کا ہم شکل، کھڑا تھا۔ ایک آم کی دو پھانکیں۔ وہی قد، وہی ناک نقشہ، وہی پوشاک۔ جیسے اس کا ہم زاد یا جڑواں ہو۔ بڑے بھائی نے اٹک اٹک کر، کانپتی ہوئی آواز میں اپنی رام کہانی سنائی اور پُوچھا: "آپ کون؟" جواب ملا: "میں تیرا کرم، جواب جاگ گیا ہوں۔" بڑے بھائی کو اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہ آرہا تھا۔ اسے یہ سب خواب لگتا تھا۔ آخر اس کا جاگا ہوا نصیب بولا: "اے اللہ کے بندے! میری بات دھیان سے سُن۔ وہ جو جنگل کے اس طرف تمھیں گھاس چرتی ہوئی سرخ گھوڑی ملی تھی، اس کی کنڈ (پیٹھ) میں بیش بہا موتی ہیں۔ گھوڑی جو کُچھ بھی کہے، ہرگز کان نہ دھرنا۔ اس پر ضرور سواری کرنا، اپنے خنجر سے اس کی کنڈ چیرنا اور تمام موتی نکال لینا۔ ندی میں وہ جو مچھلی ملی تھی، اُس کے سر میں ایک لعل ہے، جس کی قیمت کا اندازہ کرنا دنیا کے کسی جوہری کے لیے ممکن نہیں۔ مچھلی جو کُچھ بھی کہے، ہرگز کان نہ دھرنا، اس پر ضرور سواری کرنا، اپنے خنجر سے اس کا سَر چیر کر وہ اَن مول لعل نکال لینا۔ تمھارے رستے میں، وَن تلے، ہری ہری دُوب میں وہ جو پانی سے بھرے مٹی کے دو گھڑے پڑے تھے، ان کے نیچے زمین میں بیش بہا جواہر دفن ہیں۔ گھڑے جو کُچھ بھی کہیں، ہرگز کان نہ دھرنا۔ ان کا پانی پینا، باقی پانی زمین پر گرا دینا اور زمین کھود کر ان کے نیچے سے سب جواہر نکال لینا۔ تمھارے رستے میں وہ جو کھجور آئی تھی، اُس کے مُڈھ (جڑ) میں سات بادشاہیوں کا خزانہ دفن ہے۔ تم اس پر چڑھنا، وہ جو کُچھ بھی کہے، ہرگز کان نہ دھرنا۔ پکی ہوئی کھجوریں کھانا اور پھر اُس کے مُڈھ میں کھدائی کر کے سارا خزانہ نکال لینا۔ وہ جو تمھارے رستے میں بیری کا ایک درخت آیا تھا، اُس کے اردگرد سونا دفن ہے۔ تم اس بیری پر چڑھنا، وہ جو کُچھ بھی کہے، ہرگز کان نہ دھرنا۔ سرخ سرخ بیر توڑ کے کھانا۔ پھر نیچے، بیری کے چاروں طرف کھدائی کرنا اور سارا سونا نکال لینا۔" اتنا کہہ کے کرم چُپ ہو گیا۔ بڑا بھائی ان تمام ہدایات پر عمل کرنے کے لیے پلٹا۔ جب وہ واپس جانے لگا تو آواز آئی: "اللہ کے بندے! اب کدھر؟" وہ بولا: "آپ سوئے ہوئے تھے۔ میں بس آپ کو جگانے کے لیے ہی آیا تھا۔ آپ کو جگا لیا ہے اور اب میں واپس چلا۔"

سوموار ۱۸ / دسمبر ۲۰۰۸ء

سوئے کرم جگانا (۲)

ایک دفعہ کا ذکر ہے، کسی گاؤں میں دو بھائی رہتے تھے۔ گاؤں کے پاس ہی ان کی زمین تھی۔ بنے[1] سے بنا جُڑا ہوا تھا۔ مرنے سے پہلے باپ نے بڑے بیٹے کو وصیت کی کہ دیکھو، خُدا کے فضل سے تم دونوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ ماشاءاللہ بچوں والے ہو۔ میرے بعد جب زمین بانٹنا تو چھوٹے بھائی کو گاؤں کے ساتھ والی زمین دینا کیونکہ اس کی بیٹیاں زیادہ ہیں۔ نیائیں[2] کی زمین ہوگی تو لڑکیاں بھی آرام سے چار قدم پہ جا کر فصل کاٹ لیں گی۔ اور تمھارے ہاں بیٹے زیادہ ہیں، گاؤں سے ذرا ہٹ کے، پرے واقع زمین تم لے لینا۔

چند دن گزرے تھے کہ باپ وفات پا گیا۔ بڑے بھائی نے حرف بحرف باپ کی وصیّت پر عمل کیا۔ گاؤں سے مُلحق اَراضی چھوٹے بھائی کے حوالے کر دی اور خود دُور والی زمین لے لی۔ کنک، چاول، مکئی، کماد، غرض بڑے نے اپنی زمین پر جو بھی فصل بیجی، وہ اُگی۔ چھوٹے کا حال بر عکس تھا۔ اس نے اپنی اراضی پر ہر فصل بوئی لیکن اُگا کچھ بھی نہیں۔ ہزار جتن کر کے دیکھے۔ پانی، کھاد، بیج، محنت کسی شے میں بھی وہ بڑے بھائی سے کم نہ تھا۔ مگر بڑے کے کھیت تو لہلہا رہے تھے اور اُس کے کھیت ویران پڑے تھے۔

باج مقدراں کجھ نئیں مِل دا، بھانویں خاص نیائیں دی وَنڈ ہووے
باج بھراواں گنڈ ننگی ، بھانویں مگر قبیلے دا ڈنڈ ہووے

(اُردُو ترجمہ: مقدر کے بغیر کچھ نہیں ملتا، چاہے خاص، گاؤں سے مُلحق زرخیز زمین ہی بٹوارے میں کیوں نہ ملی ہو۔ بھائیوں کے بغیر پیٹھ ننگی رہتی ہے۔ چاہے انسان کے پیچھے پورے قبیلے کا شور و غُل ہی کیوں نہ ہو۔)

جب کبھی چھوٹے بھائی کے لڑکے لڑکیاں گنّے، چھلّیاں[3] وغیرہ مانگنے کے لیے تائے کے کھیتوں میں جاتے تو تایا ہنس کے کہتا: ''تمھارے باپ کے کرم تو سوئے ہوئے ہیں، اس سے کہو کہ انھیں جگائے۔'' بچے آ کر باپ سے کہتے۔ آخر ایک دن چھوٹے بھائی کی قوتِ برداشت

---

[1] بنّا / بنّاں: (مذکر) کھیت کا کنارا، مینڈھ
[2] نیائیں: (مونث) گاؤں یا شہر سے ملحقہ زرعی اراضی، زرخیز زمین
[3] چھلّی: (مونث) مکئی کا بھٹا

جواب دے گئی۔ وہ گاؤں کے مولوی صاحب کے پاس گیا اور بولا: ''مولوی جی! میرا بڑا بھائی ہر روز طعنے دیتا ہے کہ تیرے کرم سوئے ہوئے ہیں، انھیں جگا۔ اب آپ ہی بتایئے میں کہاں جا کے اپنے سوئے بھاگ جگاؤں؟'' یہ سُن کر مولوی صاحب فرمانے لگے: ''بیٹا! دریا کنارے چلا جا۔ وہاں ایک بزرگ کا جھونپڑا ہے۔ انہی کے پاس تیری مشکل کا حل ہے۔''

اگلے ہی روز چھوٹا بھائی سفر پر روانہ ہو گیا۔ چلا جا رہا ہے۔ جیٹھ ہاڑ کے دن تھے۔ شِکر دوپہر (سخت دوپہر)۔ راستے میں ایک جگہ کچھ لوگ نظر آئے۔ وہ پیپل کی ٹھنڈی، گھنی چھاؤں میں بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔ جب ان کے پاس سے گزرنے لگا تو وہ بولے: ''برخوردار! کہاں جا رہے ہو؟'' چھوٹا بھائی چلتے چلتے رک گیا اور بولا: ''میں اپنے سوئے کرم جگانے جا رہا ہوں۔ سنا ہے دریا کنارے ایک بزرگ رہتے ہیں۔ وہی میرے بھاگ جگائیں گے۔'' یہ سُن کے وہ لوگ کہنے لگے: ''میاں! ہمارے بھی کرم سوئے ہوئے ہیں۔ بابا جی سے اُنھیں جگانے کا نسخہ بھی پوچھتے آنا۔'' چھوٹا بھائی بولا: ''بزرگو[1]! کچھ بتاؤ تو سہی، تمھارے نصیب کیسے سوئے ہوئے ہیں؟'' ان میں سے ایک بوڑھا بولا: ''ہم جب بھی گھر تعمیر کرنے لگتے ہیں، دیواریں تو بن جاتی ہیں لیکن جب چھت کی نوبت آتی ہے، اِدھر چھت پڑتی ہے، اُدھر گر جاتی ہے۔ صرف ہمارے ساتھ ہی یہ معاملہ نہیں، پورے پِنڈ (گاؤں) والوں کے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔ خُدا معلوم، کیا بات ہے؟'' چھوٹا بھائی یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا: ''خاطر جمع رکھو، میں ضرور سرکار سے پُوچھتا ہوا آؤں گا۔''

چلتے چلتے رستے میں ایک دریا آیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ کنارے کے اُتھلے پانی میں ایک ماچھی[2] کھڑا ہے۔ مشک بھر بھر کے جسم پر پانی ڈال رہا ہے اور مسلسل پیتا چلا جا رہا ہے۔ رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ جب چھوٹا بھائی اُس کے پاس سے گزرنے لگا تو وہ بولا: ''دوست! کہاں جا رہے ہو؟'' چھوٹا بھائی چلتے چلتے رُک گیا اور بولا: ''میں اپنے سوئے کرم جگانے جا رہا ہوں۔ سُنا ہے، اِدھر دریا کنارے ایک بُزرگ رہتے ہیں۔ وہی میرے بھاگ جگائیں گے۔'' یہ سُن کر ماچھی کہنے لگا: ''یار! میرے بھی کرم سوئے ہوئے ہیں۔ بابا جی سے اُنھیں جگانے کا نسخہ بھی پوچھتے آنا۔'' چھوٹا بھائی بولا: ''کچھ بتاؤ تو سہی، تمھارے نصیب کیسے سوئے ہُوئے ہیں؟'' ماچھی اپنے بدن پر پانی سے بھری مشک انڈیلتے ہُوئے بولا: ''میں دریا میں کھڑا ہوں اور جل رہا ہوں۔ ایسے لگتا ہے،

---

[1] بزرگو: اے بزرگ!

[2] ماچھی: سقا، بہشتی، ماشکی، پنھارا

جیسے میرے جسم کو آگ لگی ہوئی ہے۔ رات دن پانی سے مشکیں بھر بھر کے خود پہ اُنڈیلتا ہوں، لگاتار پانی پیتا ہوں لیکن آگ ہے کہ بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟'' چھوٹا بھائی یہ کہتے ہُوئے آگے بڑھ گیا: ''خاطر جمع رکھو، میں ضرور سرکار سے پُوچھتا ہوا آؤں گا۔''

دریا کے کنارے کنارے چلا جارہا تھا۔ چلتے چلتے ایک جگہ آئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ کنارے پر ایک بوہڑ (بڑ) اُگی ہُوئی ہے۔ آدھی سوکھی، آدھی ہری۔ جو حصّہ پانی کی طرف ہے، وہ تو ہرا ہے۔ جو دوسری جانب ہے، وہ سوکھا ہوا ہے۔ چھوٹا بھائی سر اُٹھائے، بوہڑ کو دیکھتا ہوا، پاس سے گزرنے لگا تو بوہڑ سے آواز آئی: ''ویرا (بھائی)! کہاں جارہے ہو؟'' چھوٹا بھائی حیران ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ بوہڑ پھر پکاری۔ چھوٹا بھائی چلتے چلتے رُک گیا اور بولا: ''میں اپنے سوئے کرم جگانے جارہا ہوں۔ سُنا ہے اِدھر دریا کنارے ایک بزرگ رہتے ہیں۔ وہی میرے بھاگ جگائیں گے۔'' یہ سُن کر بوہڑ کہنے لگی: ''ویرا! میرے بھی کرم سوئے ہُوئے ہیں۔ بابا جی سے اُنھیں جگانے کا نسخہ بھی پوچھتے آنا۔'' چھوٹا بھائی بولا: ''کُچھ بتاؤ تو سہی، تمھارے نصیب کیسے سوئے ہُوئے ہیں؟'' بوہڑ ٹھنڈی آہ بھر کے بولی: ''میں دریا کنارے اُگی ہُوئی ہُوں، پھر بھی آدھی ہری ہُوں اور آدھی سُوکھی۔ سمجھ میں نہیں آتا، میری یہ حالت کیوں ہے؟'' چھوٹا بھائی یہ کہتے ہُوئے آگے بڑھ گیا: ''خاطر جمع رکھو، میں ضرور سرکار سے پُوچھتا ہوا آؤں گا۔''

آخر چلتے چلتے ایک جگہ آئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ شرینھ (سرس) کے درخت تلے، کٹیا کے سامنے، ہری ہری گھاس پر ایک بزرگ نماز پڑھ رہے ہیں۔ لمبی، گھنی، سفید ڈاڑھی، گورا چٹّا رنگ، سفید پگڑی، سفید چوغہ۔ جب اَلتَّحِیَّات پڑھ رہے تھے تو چھوٹا بھائی آگے بڑھا اور سرکار کے قدم پڑھ لیے۔ سرکار نے سلام پھیرا اور بولے: ''آ گئے جب پانی سر سے اُونچا ہو گیا۔'' چھوٹا بھائی جواب دینے کے بجائے بس روتا چلا جارہا تھا۔ سرکار نے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا: ''بچّہ! اُٹھ۔ جا دریا کے کنارے سے ریت اُٹھا کے لا۔'' چھوٹا بھائی دوڑا دوڑا گیا، کنارے سے ریت اُٹھا لایا۔ سرکار نے آنکھیں بند کیں، تھوڑی دیر کلمہ پڑھا، ریت پر پھونکا اور کہا: ''جا، اپنی زمین پر جا کے اس ریت کا چھٹّا[ہ] لگا۔ رب نے چاہا تو ہر قسم کی فصل اُگے گی۔'' چھوٹا بھائی واپس جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ یکا یک بوہڑ کا خیال آیا۔ سرکار سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولے: ''بوہڑ جس طرف سے سُوکھی ہوئی ہے، وہاں سات بادشاہیوں کا خزانہ دفن ہے۔ خزانہ نکال دو، بوہڑ اُدھر سے بھی ہری ہو جائے

ہ چھٹّا: (مذکر) بکھیرنے کا فعل، بکھراؤ

گی۔''اب چھوٹے بھائی نے ماچھی کی کیفیت بیان کی تو سرکار نے کہا: ماچھی کے سینے میں تین لعل ہیں، جن کی تیز روشنی کی وجہ سے جل رہا ہے۔ اگر ماچھی تینوں لعل اُگل دے تو اس کے جسم کو لگی آگ بجھ جائے گی۔'' آخر میں چھوٹے بھائی نے دیہاتیوں کا مسئلہ بتایا۔ سرکار بولے: ''ان سے کہنا جو کنواریاں ہیں، اُنھیں بیاہ دو۔ جو بیاہی ہُوئی ہیں، اُنھیں ان کے گھروں میں بھیج دو۔ اِن شاءَ اللہ گاؤں کے گھروں پر چھتیں پڑنے لگیں گی۔''

چھوٹے بھائی نے باباجی کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور واپس روانہ ہوگیا۔ سب سے پہلے بوہڑ ملی۔ دیکھتے ہی بولی: ''ویرا! میرے بارے میں سرکار نے کیا بتایا؟'' چھوٹا بھائی کہنے لگا: ''بہنا (اے بہن!) تیری جڑوں میں سات بادشاہیوں کا خزانہ دفن ہے۔ اگر وہ نکال دیا جائے تو تو پوری کی پوری ہری ہو جائے گی۔'' یہ سُن کر بوہڑ خوش ہوگئی اور بولی: ''ویرا! تمھی خزانہ نکال کر لیتے جاؤ۔ میں نے اس کا کیا کرنا ہے۔'' بوہڑ چوں کہ آسمان سے باتیں کر رہی تھی، کہنے لگی: ''میں دیکھ رہی ہُوں، دور ایک بیل گاڑی چلی جارہی ہے۔ تم زمین کھود کے خزانہ نکالو اور پھر اس پر لاد کر اپنے گھر لے جانا۔ ٹھہرو، میں اسے روکتی ہُوں۔'' اتنا کہہ کر بوہڑ نے گاڑی بان کو آواز دی۔ وہ فوراً چلا آیا۔ دونوں نے مل کر زمین کھودی اور خزانہ نکالنا شروع کیا۔ دو دن لگ گئے مگر خزانے نے ختم ہونے کا نام نہ لیا۔ گاڑی بان اور بیل گاڑیاں لے آیا۔ تین بیل گاڑیاں خزانے سے بھر گئیں۔ کھدائی کے باعث بوہڑ مُدھ (جڑ) سے ننگی ہوگئی تھی۔ انھوں نے اس پہ مٹی ڈالی اور روانہ ہوگئے۔ جب کُچھ دور جا کے پلٹ کے دیکھا تو بوہڑ ہری ہو چکی تھی۔

آگے بڑھے تو دریا کنارے ماچھی پانی پیتا اور نہاتا ہُوا نظر آیا۔ اس نے دیکھتے ہی پُوچھا: ''کہو، میرے بارے میں سرکار نے کیا بتایا؟'' چھوٹا بھائی بولا: ''سُن، تیرے سینے میں تین بیش بہا لعل ہیں۔ اگر تو انھیں اُگل دے تو تیرے اندر کی آگ بجھ جائے گی۔'' یہ سُن کر ماچھی نے لعل اگل دیے، لعل اگلنے کی دیر تھی کہ اُس کے بدن کا جلنا ختم ہو گیا۔ ماچھی خوش ہو کر کہنے لگا: ''دوست! یہ تینوں لعل بھی تم اپنے ساتھ ہی لیتے جاؤ، میں نے کیا کرنے ہیں۔ تمھاری وجہ سے مجھے سکون مل گیا، میرے لیے یہی بہت ہے۔''

آگے بڑھے تو بغیر چھتوں والے گاؤں کے پاس پیپل تلے، وہی دیہاتی بیٹھے حقہ پیتے نظر آئے۔ وہ دیکھتے ہی کہنے لگے: ''کہو برخوردار! ہمارے بارے میں سرکار نے کیا بتایا؟'' چھوٹا بھائی بولا: ''بزرگو! یہ بیٹیوں کا وبال ہے، جو تمھارے گاؤں پر پڑ گیا ہے۔ تم لوگ اپنی زمینوں

میں سے حصہ دینے کے ڈر سے لڑکیوں کو کنوارہ رکھتے ہو۔ جو بیاہی ہوئی ہیں، اُنھیں سسرال نہیں بھیجتے۔ آج ہی کنواریوں کو بیاہ دو اور شادی شدہ کو اپنے گھر بھجوا دو، تمھاری مشکل آسان ہو جائے گی۔'' گاؤں والوں نے ایسا ہی کیا۔ واقعی اب وہ جو بھی گھر بناتے تھے، چھتیں قائم و دائم رہتی تھیں۔

چھوٹا بھائی ہیرے جواہرات اور اشرفیوں سے بھری بیل گاڑیاں اور تین بیش بہا لعل لے کر جب اپنے گاؤں پہنچا تو بڑے بھائی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے گاڑی بانوں کو بھی بے شمار دولت دی۔ بے چارے دُعائیں دیتے خوش خوش گھروں کو لوٹے۔ اس نے اپنے بنجر کھیتوں میں جا کر بابا جی کی دَم کی ہُوئی ریت کا چھِڑکا دیا۔ واقعی اب زمین کی زرخیزی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس نے جو بھی فصل بوئی، وہ اُگی اور اس قدر بھرپور کہ اُس کے بھائی سمیت گاؤں کے دوسرے کسان جتنی فصل دس ایکڑ سے حاصل کرتے تھے، اتنی اُس کے صرف ایک ایکڑ میں اُگتی تھی۔

اتوار/۶/دسمبر ۲۰۰۹ء

شام ۷ بجے

میں گنگا رام

لوک ادب کا ایک پسندیدہ موضوع بہن بھائی کی باہمی محبت ہے اور یہی محبت اس کہانی کا بھی مرکزی خیال ہے۔ اُس کے علاوہ اس مجموعے میں شامل ''بیری اور چکّن'' بھی اسی قبیل کی کہانی ہے۔

پُرانے وقتوں کی بات ہے، گنگا کنارے ایک گاؤں آباد تھا۔ وہیں ایک ہندو گھرانے میں دو بچے تھے۔ ایک بہن اور ایک اُس کا ویر (بھائی)۔ دونوں کسی پَل نچلا نہ بیٹھتے تھے۔ ہروقت ٹیٹری[1] کی طرح پھُدکتے رہتے تھے۔ دونوں میں پیار بھی بہت تھا۔

ایک روز اُن کی ماں مرگئی۔ باپ نے فوراً دوسرا بیاہ رچالیا۔ ماں کے مرنے سے بچّوں کی جو قسمت بگڑی تھی سو بگڑی تھی لیکن سوتیلی ماں کے آتے ہی رہی سہی کسر بھی نکل گئی۔ ظالم نے آتے ہی پھُول جیسی بچّی کو گھر کے کام کاج میں ایسا اُلجھایا کہ بے چاری کو سر اُٹھانے کی فرصت نہ ہوتی تھی۔ طعنے مہنے، مار پیٹ الگ۔ لڑکی کا چونکہ سوتیلی ماں کو فائدہ تھا، بلکہ ڈھیروں فائدہ تھا، اس لیے تو اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کرلیا لیکن لڑکا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ اوپر سے بہن کی طرف داری بھی بہت کرتا تھا۔ چند دنوں میں صورتِ حال یہاں تک پہنچی کہ اِدھر سوتیلی ماں نے لڑکی پر ہاتھ اُٹھایا اُدھر وہ آڑے آیا۔ اب تو سوتیلی ماں کو اُس سے خوف آنے لگا۔ سوت بھلی سوتیلا بُرا۔ اُس نے شوہر کے کان بھرنے شروع کردیے۔ دِن رات لگائی بجھائی کرتی۔ بات گھڑتی۔ باپ کو بیٹے کے خلاف بھڑکاتی۔ ایک دِن سوتیلی ماں نے پہلے تو لڑکے کو خُوب مارا اور پھر شوہر سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر تم مجھے اس گھر میں بسانا چاہتے ہو تو لڑکے کو قتل کردو۔ ظالم ایسا جورو کا غُلام نکلا کہ نہ دیکھا نہ بھالا، نہ سوچا نہ سمجھا، دیکھتے ہی دیکھتے تلوار میان سے نکالی اور فرزند کے سینے میں گھونپ دی۔ سنگ دل نے اسی پر بس نہ کی، لختِ جگر کو لخت لخت کردیا۔ لاش کی بوٹیاں بوٹیاں کردیں۔ بہن بہت روئی پیٹی لیکن جب مارنے والا کوئی غیر نہیں بلکہ اپنا ہی باپ ہو تو کوئی کیا کرے۔

بہن نے بھائی کے لاشے کے ٹکڑے اُٹھائے، جھولی میں ڈالے اور گھر سے باہر نکل

---

[1] ٹیٹری: (تلفظ: ٹ۔ ٹی۔ ری) (ہندی۔ مونث) ایک پرند جس کی آواز سے یہ نام رکھا گیا۔ چونکہ یہ پرندہ زمین پر بیٹھا ہوا ہر وقت اچھلتا رہتا ہے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ اسی لیے پنجاب میں کسی پَل نچلا نہ بیٹھنے والے بچّوں کو اس سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

آئی۔ دریا کنارے پہنچی اور بھائی کا ماس اپنی جھولی سے نکالا اور گنگا میّا کی گودی میں ڈال دیا۔ جسم کے پارچے گنگا میں بہا دیئے، جو بہتے بہتے کنارے پہ آ لگے۔ بہن روتی دھوتی پلٹ گئی۔

اتفاقاً دریا کے پاس سے ایک جوگی گزرا۔ سوا سو برس کا سن، دھنی (ناف) تک لٹکی ہوئی سفید ڈاڑھی، جٹوں میں راکھ، بدن پر صرف ایک لنگوٹی جو گھٹنوں تک لٹک رہی تھی، سارے تن میں جھرّیاں پڑی ہوئی، اس پر بھبھوت رمائی ہوئی۔ ایک ہاتھ میں لمبا سا چمٹا، لال لال ڈیلے۔ جوگی نے کنارے پہ انسانی بوٹیاں لگی دیکھیں تو ٹھٹکا۔ اسی وقت زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند، سوتا نہ جاگتا، سنسار سے منہ موڑے، اپنے دھیان میں مگن۔ جوگی مہاراج نے بھگوان سے پرارتھنا کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھائی کے لاش کے ٹکڑے آپس میں جڑے اور توتا بن کر اُڑ گئے۔ جوگی "اوم مہادیو" کہتا ہوا اپنے راستے پر چل پڑا۔

توتا اُڑتا ہوا ایک دُکان پہ جا بیٹھا اور بولا:

ماں ماریا
پیو وڈھیا
بہن گنگا تاریا
میں گنگا رام ؎

(اردو ترجمہ: میری ماں نے مجھے مارا پیٹا، میرے باپ نے مجھے (تلوار سے) کاٹ ڈالا، میری بہن نے مجھے دریائے گنگا میں تیرایا، میرا نام گنگا رام ہے)۔

؎ یہی کہانی یوں بھی مشہور ہے: ایک راجا اور رانی کے دو بچّے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ رانی کے مرنے کے بعد راجے نے بیاہ رچا لیا۔ سوتیلی ماں نے آتے ہی دونوں بہن بھائی سے بُرا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ ایک روز نئی رانی نے سوتیلے بیٹے کو تلوار سے قتل کیا۔ ہڈیاں بہن کی جھولی میں ڈال دیں۔ بیٹے کا گوشت پکا کے باپ راجے کو کھلا دیا۔ اُدھر بہن نے باہر جا کر جھولی اُلٹی تو بھائی کی ہڈیاں توتا بن کر اُڑ گئیں۔ توتا جہاں بھی جاتا ہے، یہ اشعار پڑھتا ہے:

ماں رانی وڈیا — پیو راجا کھادا
بہن جھولی پایا — گنگا جی تو آیا
میں چلبی توتا

(اردو ترجمہ: رانی ماں نے مجھے کاٹا۔ باپ راجے نے مجھے کھایا۔ بہن نے مجھے جھولی میں ڈالا۔ میں گنگا جی (دریا) سے آیا ہوں۔ میں (ایک چھوٹا سا) توتے کا بچہ ہوں۔)

دکان دار نے توتے کو یوں کلام کرتے سنا تو پھولا نہ سمایا۔ خوشی سے بولا: ''ہیں ہیں! راتوتیا[1]! (اے راتوتے!) تُو تو بہت اچھی باتیں کرتا ہے۔ ایک دفعہ پھر سنا، جو مانگے گا ہم تمھیں دیں گے۔''

توتے نے ایک بار پھر وہی کلامِ مَوزُوں سنایا۔ دکان دار خوش ہو کر کہنے لگا۔ ''میاں مٹھو! مانگ کیا مانگتا ہے؟'' توتا بولا: ''میرے پروں میں گدوئیاں (سوئیاں) رکھ دو۔''

دکان دار نے توتے کے پروں میں گدوئیاں رکھ دیں۔ توتا وہاں سے اُڑا اور اپنے گھر کے بنیرے (منڈیر) پہ آ کر بیٹھ گیا۔ بہن نے دیکھا تو خوشی خوشی باپ سے کہنے لگی: ''پتا! ذرا دیکھو تو ہماری مُنڈیر پر کیسی موہنی صورت والا توتا بیٹھا ہوا ہے۔'' باپ نے جونہی آنکھ اُٹھا کر اُوپر دیکھا، توتا اپنی جگہ سے اُڑا، پتا کے چہرے کے پاس آ کر اپنے ہرے ہرے پر پھڑ پھڑائے۔ گدوئیاں پروں سے گر کر باپ کی آنکھوں میں چبھ گئیں۔ باپ اندھا ہو گیا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے: آپ ای بیج تے آپ ای گاہ[2]۔ توتا پھر اُڑا، اب کے ایک پنساری کی دکان پہ جا بیٹھا اور بولا:

ماں ماریا
پیو وڈھیا
بہن گنگا تاریا
میں گنگا رام

پنساری نے توتے کو یوں کلام کرتے سنا تو پھولا نہ سمایا۔ خوشی سے بولا: ''ہیں ہیں! راتوتیا! تُو تو بہت اچھی باتیں کرتا ہے۔ ایک دفعہ پھر سنا، جو مانگے گا ہم تمھیں دیں گے۔''

توتے نے ایک بار پھر وہی کلامِ مَوزُوں سنایا۔ پنساری خوش ہو کر کہنے لگا: ''میاں مٹھو! مانگ کیا مانگتا ہے؟'' توتا بولا: ''میرے پروں پر پسی ہُوئی لال مرچیں چھڑک دو۔''

پنساری نے توتے کے پروں پر مرچیں چھڑک دیں۔ توتا وہاں سے اُڑا۔ پُرے دی وا (پُروا، پُورب کی ہوا) چل رہی تھی۔ وہ پھر اپنے گھر کے اُوپر اڑنے لگا، چکر کاٹنے لگا۔ بہن انگنائی میں کھڑی، سر اُٹھائے دیکھ رہی تھی۔

توتا اپنے گھر کے بنیرے پہ آ کر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی سوتیلی ماں نے سر اُٹھا کے اُوپر دیکھا۔ یکا یک توتا اپنی جگہ سے اُڑا، پلک جھپکنے میں اس کے چہرے کے پاس آیا، اپنے پر پھڑ

---

[1] راتوتیا: ایک قسم کا پالتو توتا، جو بولنا سیکھ جاتا ہے۔

[2] جو بوؤ گے وہی کاٹو گے

پھڑائے اور سُرخ سُرخ پسی ہُوئی مرچیں سوتیلی ماں کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ وہ سی سی کرتی ہُوئی بھاگی، صحن میں رکھے ہُوئے پانی کے کچے گھڑے کی طرف۔ چُلّو میں پانی لے کے، لگی آنکھوں پر چھینٹے مارنے۔ بڑی دیر کے بعد آنکھوں کی سوزش کم ہُوئی۔ اُدھر توتا اُڑ کے دُور کہیں چلا گیا۔

ایک روز کا ذکر ہے، بہن نے اپنے سر پر چھابا (چنگیر) رکھا۔ چھابے میں کنک کے دانے تھے۔ وہ خُراس[1] پہ اناج پسوانے جارہی تھی۔ توتا آسمان پہ اُڑ رہا تھا اور اُسے دیکھ رہا تھا۔

اب کی بار توتا ایک ایسے گھر کے بنیرے پہ جا بیٹھا، جہاں ایک نئی نویلی دُلھن شوہر کے گھر میں پہلی دفعہ کھانا پکانے بیٹھی تھی۔ عورت کیا تھی، پدمنی کہیئے۔ گوری چٹی، نہایت نازک اندام، مُکھ ایسا کہ بس دیکھتے ہی رہیے۔ ایک جانب ہنڈیا میں سرسوں کا ساگ پک رہا تھا۔ دوسری جانب وہ رنگین پیڑھی پہ بیٹھی اپنے منھدی لگے لال سرخ ہاتھوں سے ایک کنالی[2] میں مکئی کا پیلا پیلا آٹا گوندھ رہی تھی۔

توتا بنیرے پہ بیٹھا دیکھتا رہا۔ جب ساگ اور روٹی پک کے تیار ہوگئی تو بولا:

ماں ماریا
پیو وڈھیا
بہن گنگا تاریا
میں گنگا رام

اس نئی نویلی دلھن نے توتے کو یوں کلام کرتے سُنا تو چاہت سے بولی: ''میں واری، میں صدقے۔ ہیں، ہیں! راتو تیا! تُو تو بہت اچھی باتیں کرتا ہے۔ ایک دفعہ پھر سنا، جو مانگے گا ہم تمھیں دیں گے۔''

توتے نے ایک بار پھر وہی کلامِ موزُوں سنایا۔ نئی دلھن بولی: میاں مٹھو! مانگ کیا مانگتا ہے؟'' توتا بولا: ''مجھے مکئی کی ایک روٹی پہ ساگ رکھ کر دے دو۔'' دلھن نے بڑے ناز سے اپنے منھدی لگے ہاتھوں میں مکئی کی روٹی پکڑی، ڈوئی سے ساگ اُٹھا کے اس پہ رکھا اور توتے کے آگے رکھ دی۔ توتے نے اپنی چونچ میں اُٹھائی اور لے اُڑا۔ اُڑتے اُڑتے اپنی بہن کے سر پہ پہنچ

---

[1] خراس : (مذکر) آٹا پیسنے کی بڑی چکی، جسے مویشی کھینچتے ہیں۔

[2] کنالی : (مونث) مٹی کا ایک برتن، آٹا گوندھنے کا برتن

گیا۔ بہن ابھی تک راستے میں تھی۔ اس نے مکّی کی روٹی اور ساگ بہن کے سر پر رکھے ہوئے چھابے میں ڈالا اور خوب دھمکر کر کے اُڑ گیا۔

اسی طرح دِن پر دِن گزرتے گئے۔ ایک دِن بہن گھر میں بیٹھی روئی دُھن رہی تھی، تاکہ اس سے اپنے لیے کپڑا بُن سکے۔ توتے نے بہن کو روئی دُھنتے دیکھا تو گھر کے بنیرے سے اُڑا اور ایک کپڑے والے کی دُکان پہ جا بیٹھا اور بولا:

ماں ماریا

پیو وڈھیا

بہن گنگا تاریا

میں گنگارام

دکان دار نے توتے کو یوں کلام کرتے سُنا تو خوشی سے بولا: ''ہیں ہیں، راتو تیا! تُو تو بہت اچھی باتیں کرتا ہے۔ ایک دفعہ پھر سُنا، جو مانگے گا ہم تمھیں دیں گے۔''

توتے نے ایک بار پھر وہی کلامِ موزوں سنایا۔ دُکان دار خوش ہو کر کہنے لگا: ''میاں مٹھو! مانگ کیا مانگتا ہے؟''

توتا بولا: ''اپنی دُکان کا سب سے بہترین لال رنگ کا کپڑا مجھے دے دو۔''

دُکان دار نے گز لیا اور سب سے قیمتی تھان سے شلوار قمیص کا کپڑا کاٹا اور توتے کے حوالے کر دیا۔ توتے نے اپنی سُرخ چونچ سے سُرخ کپڑا اُٹھایا، اُڑتا ہوا اپنے گھر آیا اور اپنی پیاری بہنا کے زانو پہ رکھ کے [illegible]

اسی دوران میں بہن کی شادی طے ہوگئی۔ جس روز وہ دُلھن بنی، اُس نے وہی لال جوڑا پہنا جو توتا دے کر گیا تھا۔ لڑکے والے باجے گاجے کے ساتھ بیاہنے آئے۔ دُلھن روتی دھوتی رخصت ہوئی۔ اُسے سب سے بڑا غم بھائی کے نہ ہونے کا تھا۔ سسرال میں بھی وہ ہر وقت اداس اداس سی رہتی تھی۔ بیاہ کے شروع کے دِنوں میں جیسی دُلھنیں ہوتی ہیں، وہ بات اُس میں نہ تھی۔ نہ کنگی چوٹی کا شوق، نہ پہننے کا ہوش۔ لیکن شوہر بہت اچھا تھا۔ ایک دِن اُس نے ہر وقت کی اس اداسی کا سبب پُوچھا۔ لڑکی پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ پھر اُس نے شوہر کو سارا قصہ سُنایا کہ کیسے اس کے باپ نے سوتیلی ماں کے کہنے میں آ کر اُس کے بھائی کو قتل کیا، لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور کیسے وہ بھائی کی لاش کے پارچے گنگا ندی میں بہا آئی۔ یہ سب بتانے کے بعد وہ دکھیاری خاوند

کے کاندھے پہ سر رکھ کے اِتنا روئی کہ ہچکی بندھ گئی۔

ایک دِن نیک دِل شوہر نے بیوی سے کہا کہ وہ اُس مقام کو دیکھنا چاہتا ہے، جہاں اُس نے بھائی کا ماس دریا میں بہایا تھا۔لڑکی راضی ہوگئی۔دونوں میاں بیوی گھر سے نکلے،اور گنگا کنارے چلتے چلتے ایک جگہ پہنچے،بیوی رُک گئی اور ہاتھ کے اِشارے سے رو رو کر بتانے لگی کہ یہی وہ جگہ ہے، جہاں اُس کے بھیا کی نعش کے ٹکڑے بہتے ہوئے، کنارے پہ آ لگے تھے۔

حُسنِ اتفاق سے عین اُس وقت جب وہ یہ سب شوہر کو بتا رہی تھی، وہی جوگی پھرتا پھرتا وہاں آنکلا جس کی دُعا نے اُس کے بھائی کے لاشے کے ٹکڑے جوڑے تھے اور انھیں تو تا بنا کر اُڑا دیا تھا۔جوگی مہاراج نے لڑکی سے رونے کی وجہ پوچھی۔بہن نے سارا واقعہ سُنایا۔جوگی کو سب یاد آ گیا اور اُس نے بتایا کہ ہاں، ہاں اِس کنارے پہ لگی اِنسانی بوٹیاں میں نے دیکھی تھیں۔میری پرارتھنا سپھل ہوئی، پربھو نے انھیں جوڑ دیا اور تو تا بنا کر اُڑا دیا۔توتے کا ذکر سُنتے ہی بہن چونکی۔اب اُس کی سمجھ میں آیا کہ وہ توتا جس نے ظالم باپ کی آنکھوں میں گدوئیاں مار کر اندھا کیا تھا،سوتیلی ماں کی آنکھوں میں پسی ہوئی مرچیں ڈالی تھیں؛ اُس کے کھانے کے لیے مکئی کی روٹی پر ساگ اور پہننے کے لیے لال سُرخ کپڑا لے کر آیا تھا؛ اصل میں اُس کا پیارا بھائی تھا۔توتے کی حقیقت کُھلنے کے بعد بہن کی آنکھوں میں امید کے دیئے جگمگانے لگے۔جوگی نے کہا: "پُتری! اگر تم چاہو تو میں ترنت اُس توتے کو یہاں بُلا سکتا ہوں۔" یہ تو اس ستم رسیدہ کے دِل کی آواز تھی۔وہ تو بے چاری جذبات سے اس قدر مملوتھی کہ کوشش کے باوجود منھ سے ایک لفظ نہ بول سکی۔بس جوگی کے چرنوں میں گر گئی۔جوگی مہاراج بیراسن مار کر بیٹھ گیا۔آنکھیں مُوند لیں۔پرمیشور کو یاد کیا۔اتنے میں پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سُنائی دی۔پلک جھپکنے میں ایک توتا اُڑتا ہوا آیا۔بہن کے سامنے زمین پر بیٹھا اور لڑکا بن کر اُٹھ کھڑا ہوا۔بہن تو خوشی سے پاگل ہوگئی۔دونوں بہن بھائی گلے ملے اور پھوٹ پھوٹ کر روئے۔جب دِل کا غُبار نکل گیا تو بہن نے خوشی خوشی بھائی کو اپنے شوہر سے ملوایا۔بھائی بہنوئی کے گلے ملا۔پھر سب نے جوگی مہاراج کے قدم چھوئے۔جوگی نے باری باری تینوں کے سر پہ ہاتھ رکھا اور انھیں دعائیں دیتا ہوا، "اوم مہادیو" کے نعرے مارتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

بہن بھائی کو اپنے گھر لے آئی۔جیجا اور جیجی نے اس کی خوب خاطر داری کی۔اور پھر چند دنوں بعد اُس کی شادی ایک پدمنی سے کر دی۔بہن بھائی کے لیے بالکل ویسی ہی دُلھن ڈھونڈ کے لائی جیسی اُس نے ، جب وہ توتا تھا؛ ایک گھر کے بنیرے پہ بیٹھ کے دیکھی تھی اور جس کے

گورے چٹے مہندی لگے ہاتھوں سے مکئی کی روٹی اور ساگ لے کر، وہ اپنی پیاری بہنا کے کھانے کو لایا تھا۔

پیر ۷/نومبر ۲۰۱۱ء

بھابو سالو رنگیا

یہ پنجاب کی ایک بھولی بسری لوک کہانی ہے۔ اس کہانی کا انداز بتاتا ہے کہ یہ پنجاب کی ایک بے حد قدیم ، کلاسیکی کہانی ہے۔ اس مجموعے کی پہلی کہانی کے بیری اور چنن کی طرح یہاں آم کا درخت اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی فریاد کرتا سنائی دیتا ہے۔

پرانے وقتوں کی بات ہے، پنجاب کے کسی گاؤں میں ایک لڑکی رہتی تھی۔ چندے آفتاب ، چندے ماہتاب ، حسین تو تھی ہی؛ سونے پر سُہاگہ ، نہایت نیک اور بھولی بھالی بھی۔ ہنستی تو گالوں میں گڑھے پڑتے۔ وہ تھی اور اس کی ماں۔ دونوں ایک حویلی میں رہتی تھیں۔ اُس کے چار بھائی اور بھی تھے۔ چاروں شادی شدہ ، بال بچہ دار (صاحبِ اولاد)۔ چاروں اپنی بیویوں کے ساتھ الگ حویلیوں میں رہتے تھے۔ یہ زمین داروں کا گھرانا تھا۔ کوٹھیاں[1] دانوں سے بھری تھیں۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ سب سے بڑے بھائی کی بیوی آفت کی پرکالہ تھی۔ بہت جھگڑالو۔ ہر وقت غصہ ناک پر ہوتا تھا۔ غصیلی کے ساتھ ظالم بھی۔ لیکن باقی بھائیوں کی بیویاں بہت اچھی تھیں۔

ایک روز کا ذکر ہے، لڑکی کے ماموں کی شادی تھی۔ بارات جا رہی تھی۔ بھانجی نے دیکھا تو اتفاق سے سر پر اوڑھنے کے لیے کوئی دھوئی ہُوئی چادر پاس نہ تھی۔ دیوار سے دیوار جُڑی تھی، کود کر بڑی بھابی کے پاس گئی، اور اس سے اوڑھنی مانگی۔ اچنبھا ہوا، توقع کے خلاف بھابی نے اپنا سالو[2] نند کے حوالے کر دیا۔

"ہان نوں ہان پیارا" (ہم عمر لوگوں کو ایک دوسرے کی صحبت بہت اچھی لگتی ہے) لڑکی بھابی کا سالو اوڑھے، ہم جولیوں کے ساتھ ہنستی، کِھل کِھلاتی ماموں کی بارات میں شامل ہُوئی۔ بارات دُلھن کے ہاں پہنچی۔ زمین داروں کی بارات تھی، خُوب باجا گاجا، دھوم دھڑکا ہُوا۔ نکاح کے بعد براتیوں کو کھانا کھلایا گیا۔ زردہ ، بریانی ، قورمہ ، پلاؤ ، تنجن ، مزعفر ، فرنی سب ہی کچھ موجود تھا۔ اچانک کرنا خُدا کا کیا ہوا، کھانا کھانے کے دوران میں شوربے سے بھرا ہوا ڈونگا کسی کے ہاتھ سے لڑکی پہ اُلٹ گیا۔ سالو پر شوربے کا یہ بڑا سا داغ لگ گیا۔ لڑکی کی تو جان ہی نکل گئی۔ بے چاری بھابی

---

[1] کوٹھی: اناج وغیرہ ڈالنے کی مٹی سے بنی کوٹھڑی

[2] سالو: (مذکر) سرخ رنگ کا ایک کپڑا، جو دلہن اوڑھتی ہے اور نند بند کے طور پر بھی استعمال کرتی ہے، شال

کے خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ آنسوؤں سے مُنہ دھونے لگی۔ سہیلیوں نے تسلی دی۔ پانی سے سالو کو دھویا، مگر دھبا نہ گیا۔ سرخ رنگ پہ داغ کُچھ زیادہ ہی نمایاں تھا۔ لڑکی برات کے ساتھ واپس گھر آئی۔ سالو تہ کیا اور شام کے جھٹ پٹے میں بھابی کو دے آئی۔ اس نے بھی اسی طرح پکڑا اور ٹرنک میں رکھ دیا۔

یہ کُچھ دن بعد کی بات ہے۔ بڑی بھاوج کے دل میں میکے جانے کی سمائی۔ نہائی، دھوئی۔ لمبے لمبے کالے بال جو کولھوں سے نیچے تک آتے تھے، دُھوپ میں سکھائے۔ کپڑے بدلے، سر پر اوڑھنے کے لیے ٹرنک سے سالو نکالا۔ تہہ کھولی۔ ارے یہ کیا۔ بڑی بھابی کا دل دھک سے ہو گیا۔ سالو پر یہ بڑا سا داغ لگا ہوا تھا۔ فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گئی۔ اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہی۔ شام کو میاں گھر آیا۔ بیوی سے رُوٹھنے کی وجہ پُوچھی تو بولی: ''تیری بہن نے میرے سالو پر داغ لگا دیا ہے۔ جا اسے قتل کر۔ اس کا خُون لے کر میرے پاس آ۔ میں اُس کے لہو سے اپنا سالو رنگوں گی۔ تبھی داغ جائے گا اور تیری بہن کے سرخ خُون سے میرے سالو کا سرخ رنگ پھر سے بحال ہو جائے گا۔''

چار لوگوں کی ضد بڑی مشہور ہے: ''راج ہَٹ، بالک ہَٹ، تریا ہَٹ، جوگی ہَٹ۔''
جیسے تیسے کُچھ رات گزری۔ ابھی صبح کاذب تھی کہ بڑے بھائی نے بہن کو آ جگایا۔ کوئی بہانہ کر کے اسے گاؤں سے باہر لے آیا۔ نہر کنارا، جھاڑیاں، اندھیرا، ہُو کا عالم۔ نہ نام لیوا، نہ پانی دیوا۔ ایک جگہ پہنچ کر بھائی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ بہن کو زمین پر گرایا۔ ظالم چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ نیفے میں اُڑسا ہوا لمبا دو دھاری چُھرا نکالا اور بہن کے گلے پر رکھ دیا۔ بے چاری ''ویرا! ویرا!'' (اے بھائی! اے بھائی!) پکارتی رہی مگر سنگ دل کو رحم نہ آیا۔ آن کی آن میں بہن کو ذبح کر دیا۔ شہ رگ کٹی تو سُرخ سُرخ گرم لہو کا فوارہ چُھوٹا۔ جلاّد اپنے ساتھ برتن بھی لیتا آیا تھا۔ بہن کے خُون سے اُسے بھرا۔ نہر کنارے گڑھا کھود کر خون آلود لاش کو دفن کیا۔ ابھی یو نہیں پھٹی تھی کہ گھر لوٹ آیا۔ بیوی کے چرنوں میں بہن کے لہو سے بھرا ہوا برتن رکھ دیا۔ ظالم عورت کِھل کِھل ہنسی۔ پھر اس ڈائن نے لال لال خُون سے اپنا سالو رنگا۔

ماں نے بیٹے سے پُوچھا کہ تیری بہن کہاں ہے؟ تو اس زَنْ مرید (زن مرید) نے بہانہ کیا اور رو رو کر کہا کہ اُسے تو نہر کنارے بھیڑیا اُٹھا کے لے گیا۔ مگر بُوڑھی ماں کی تسلی نہ ہُوئی۔ رات دن بیٹی کی یاد میں اشکوں کے ہار پروتی تھی۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ چند دن بعد لڑکی کی قبر پہ آم کا پودا اُگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پودا بڑا ہوتا گیا اور کُچھ مہینوں میں چھتنار درخت بن گیا۔ ڈالیوں سے بڑے بڑے آم لٹکنے لگے۔

ایک صبح، ایک دھوبی، اپنی بیوی، بیٹی اور بیٹے کے ساتھ نہر پر کپڑے دھونے کے لیے آیا۔ اس نے میلے کچیلے کپڑوں سے لدا پھندا گدھا پھلاہی کے ایک پیڑ سے باندھا۔ میاں بیوی نے گدھے سے کپڑے اُتارے اور اُنھیں دھونے کے لیے نہر کے کنارے پہ آ گئے۔ دھوبی اور دھوبن ایک بڑے سے چوڑے چکلے، کالے پتھر پہ کپڑے کو مار مار کے دھونے لگے۔ ساتھ ساتھ آواز بھی آ رہی تھی: چھُو اچھُو، چھُو اچھُو۔

تھوڑی دیر کے بعد دھوپ چڑھی۔ جیٹھ ہاڑ کے دن تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین تپنے لگی۔ دھوبی کا بیٹا اور بیٹی پسینے میں شرابور ہو گئے۔ ذرا سے فاصلے پر آم کا گھنا درخت نظر آ رہا تھا۔ دھوبی اور دھوبن نے بچوں کو اس کی چھاؤں میں بھیج دیا۔ بہن بھائی آم کے نیچے پہنچے۔ سر اُٹھا کے دیکھا تو شاخوں سے بڑے بڑے، موٹے موٹے آم لٹکتے دکھائی دیے۔ آم ٹپکا پڑتا تھا۔ پھل کے بوجھ سے شاخیں جھکی ہُوئی تھیں۔ بچوں کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ بھائی نے بے اختیار ڈھیم (روڑا) مار کے آم توڑنا چاہے۔ دفعتاً درخت سے آواز آئی:

اَمب نہ توڑ، دھوبی بیٹیا!
وڈّے بھرا خُون کیتا
بھابو سالو رنگیا

(اُردو ترجمہ: اے دھوبی کے بیٹے! آم نہ توڑ۔ بڑے بھائی نے خُون کیا۔ بھاوج نے (خون سے اپنی) شال رنگی)

بہن بھائی تھرتھرانے لگے، اور "بھُوت، بھُوت" پُکارتے ہُوئے بھاگے۔ دھوبی اور دھوبن نے پلٹ کر دیکھا: بچے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ آتے ہی ماں باپ سے لپٹ گئے۔ دھوبی اور دھوبن نے بہتیرا پُوچھا کہ کیا ہوا؟ کُچھ تو بتاؤ۔ مگر دونوں بچے ہیں کہ "بھُوت، بھُوت" کی رٹ لگائے چلے جا رہے ہیں۔ ماں باپ نے بچوں کے مُنہ چُومے، تسلی دی۔ آخر کُچھ دیر بعد وہ اوسانوں میں آئے۔ بیٹے نے ساری بپتا کہہ سنائی۔ ماں باپ کو یقین نہ آیا۔ اُنھوں نے کپڑے نہر کے کنارے چھوڑے، بچوں کی اُنگلی پکڑی اور اُن کی ہمّت بندھاتے ہُوئے آم کے پیڑ کی طرف چل پڑے۔ درخت تلے پہنچ کر ماں نے بیٹی سے آم توڑنے کے لیے کہا۔ پہلے تو وہ بہت ڈری۔ آخر ماں باپ کے

حوصلہ بڑھانے پر اس نے دھیرے دھیرے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آموں سے لدی ایک شاخ پر ٹھیم (روڑا) ماری، درخت سے آواز آئی۔

اَمب نہ توڑ، دھوبی بیٹیا!
وڈّے بھرا خُون کیتا
بھابو سالو رنگیا

(اُردو ترجمہ: اے دھوبی کی بیٹی! آم نہ توڑ۔ بڑے بھائی نے خُون کیا۔ بھاوج نے (خون سے اپنی) شال رنگی)۔

دھوبی اور دھوبی کا خاندان دہشت زدہ ہو کر بھاگنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ آم کے پیڑ سے پھر آواز آئی: ''اے دھوبی! مجھ سے مت ڈر۔ میں کوئی بُھوت پریت نہیں۔ میں تو ایک دکھیاری لڑکی ہُوں، جسے اُس کے اپنے بھائی نے قتل کر ڈالا۔ صرف اس لیے کہ نند کے ہاتھوں بھابی کے سالو پہ داغ لگ گیا تھا۔ میں تو وہ دُکھیاری لڑکی ہُوں، جس کے خُون۔ سے بھاوج نے اپنا سالو رنگا۔ اے دھوبی! میری بات غور سے سُن۔ تیرے سب دِلدّر دُور ہونے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ جلدی سے میرا ایک ٹہنا کاٹ لے۔ اسے گھر لے جا۔ اس کی لکڑی سے ایک سانگی[1] بنوا۔ میرے گاؤں جا کے میرے بھائیوں اور میری ماں کے دروازے پہ سانگی بجانا۔ صدا لگانا۔ وہ زمین دار ہیں۔ وہ اتنا پُن دان کریں گے کہ تیری سات پشتیں بیٹھ کر کھائیں گی مگر دولت ختم نہ ہوگی۔''

دھوبی نے ڈرتے ڈرتے، کانپتے ہُوئے ہاتھوں سے کلہاڑی ماری، آم۔ کے پیڑ کا ایک ٹہنا کاٹا۔ پھر دھوبی کا خاندان ہانپتا کانپتا گھر پہنچا۔ چند روز تو حیرت ہی میں گزر گئے۔ آخر ایک دن دھوبی کو ہوش آیا۔ اس نے آم کے ٹہنے سے سانگی بنوائی۔ دھوبی نے فقیر کا روپ دھارا اور درخت کے بتائے ہُوئے گاؤں میں جا پہنچا۔ کچے مکانوں اور گھاس پھوس کے جھونپڑوں کے بیچ ٹھاکروں کی حویلیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ دھوبی نے ایک حویلی کے دروازے پہ کھڑے ہو کے صدا لگائی۔ جونہی سانگی بجائی تو اس میں سے خلاف توقع یہ آواز آئی:

وَج وَج، سانگیے!
اپنے ویرے دے دربار
پا، نی بھابو! پچھیا
تیری نند کھڑی دربار

---

[1] سانگی: موسیقی کا ایک ساز

(اُردو ترجمہ: اے سانگی (ساز)! بجتی رہ، بجتی رہ۔ اپنے بھائی کے آستانے پر۔ اے بھابی! خیرات دے۔ تیری نند (تیرے) آستانے پر کھڑی ہے)

سب سے چھوٹی بھاوج نے سنا تو آنکھ بھر آئی: پرات میں اشرفیاں رکھ کر لائی۔ دھوبی دعائیں دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ایسا ہی تیسری اور دوسری بھابی کے دروازے پر ہوا۔ سانگی سے وہی آواز نکلی۔ ویسے ہی بھابیاں روئیں۔ خیرات میں اسی طرح اشرفیاں ملیں۔ اب سب سے بڑے بھائی کی حویلی آئی۔ جب دھوبی نے صدا لگا کر سانگی بجائی تو اس بار سانگی سے یہ آواز نکلی:

وَنج وَنج، سانگیے!

اپنے ویری دے دربار

پا، نی بھابو تتیئے! پچھیا

تیری نند کھڑی دربار

(اردو ترجمہ: اے سانگی (ساز)! بجتی رہ، بجتی رہ؛ اپنے دشمن کے آستانے پر۔ اے تیز مزاج بھابی! خیرات دے۔ تیری نند (تیرے) آستانے پر کھڑی ہے)

بڑی بھاوج نے سنا تو ٹھٹھکی۔ ظالم ایک پرات میں روڑے، کنکر اور چولھے سے راکھ لے کر آئی۔ دھوبی کی جھولی میں ڈالی اور جلدی جلدی چلتا گیا۔

اب لڑکی کی ماں کی حویلی آئی۔ دھوبی نے حسبِ سابق صدا لگائی۔ جونہی سانگی بجائی تو اس میں سے یہ آواز آئی:

وَنج وَنج، سانگیے!

اپنے بابل دے دربار

پا، نی ماتا! پچھیا

تیری دھی کھڑی دربار

(اردو ترجمہ: اے سانگی (ساز)! بجتی رہ، بجتی رہ؛ اپنے باپ کے آستانے پر۔ اے ماں! خیرات دے۔ تیری بیٹی (تیرے) آستانے پر کھڑی ہے۔)

لڑکی کی ماں نے سنا تو خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ بھاگی بھاگی دروازے پر آئی۔ کیا دیکھتی ہے کہ ایک فقیر کی سانگی میں سے یہ آواز نکل رہی ہے۔ گھر سے تمام تُوم گہنا اور اشرفیاں اُٹھا لائی اور دھوبی کو دے کر، اس سے سانگی خرید لی۔

لڑکی کی ماں نے سانگی گھر کے سب سے پچھلے کمرے میں رکھ دی۔ اس کمرے کی طرف کوئی بھی نہیں جاتا تھا۔ یہ عام طور پر خالی ہی رہتا تھا۔ اگلے روز ماں کسی کام سے باہر گئی۔ شام کو جب واپس آئی تو اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیا دیکھتی ہے کہ گھر کی ہر چیز بہت سلیقے سے رکھی ہوئی ہے۔ گھر کے سب فرشوں پر کسی نے جھاڑو دیا ہے۔ برتن بھانڈے پرچھتیوں؎ پر نہایت ترتیب سے سجے ہوئے ہیں۔ ماں نے لاکھ ذہن لڑایا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر تھک ہار کر سوگئی۔

اگلے روز پھر کہیں جانا ہوا۔ صبح کی گئی، شام کو آئی۔ آج اور ہی گل کھلا ہوا تھا۔ صفائی ستھرائی (جھاڑ پونچھ) کے ساتھ ساتھ ماں کے تمام ہنتے پرانے کپڑے، بستروں کی چادریں، تکیوں کے غلاف، کھڑکیوں کے پردے کسی نے دھوکر، صحن کے بیچوں بیچ بندھی ہوئی لوہے کی تار پر، دھوپ میں سوکھنے کے لیے پھیلائے ہوئے ہیں۔ یہ ڈراما کئی دنوں تک ہوتا رہا۔ آخر ایک دن بات ماں کے پلے پڑی (بات سمجھ میں آئی)۔ یکا یک سانگی کا خیال آیا۔ بھاگی بھاگی پچھلے کمرے میں گئی۔ کیا دیکھتی ہے کہ کمرہ چاندنی میں نہایا ہوا ہے۔ چنبیلی کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ اور اس کی پیاری بیٹی پھول دار چادر سے ڈھکی چارپائی پر بیٹھی، سر پر آنچل لیے، سفید کپڑوں میں ملبوس، قرآن پاک کی تلاوت کر رہی ہے۔ شدّتِ جذبات سے بے قابو ہو کر ماں آگے بڑھی اور بیٹی سے لپٹ گئی۔ بیٹی کو یوں لگا جیسے جلتی بلتی دھوپ میں سفر کے بعد بوہڑ (بڑ، برگد) کے گھنے سائے میں آ گئی ہو۔ کیوں کہ مثل مشہور ہے: "ماواں ٹھنڈیاں چھانواں، تے موج بھراواں دی" (اردو ترجمہ: مائیں ٹھنڈی چھاؤں کی طرح ہیں اور بھائیوں کے دم سے خوشیاں، مزے ہیں) ہاں یہ دوسری بات اُس لڑکی کے حق میں صحیح ثابت نہیں ہوئی تھی۔

جمعہ ۱۱۔ اپریل ۲۰۰۸ء

؎ پرچھتی: کمرے کے اندر دیوار کے ساتھ بنائی ہوئی پٹی، جو برتن رکھنے کے کام آتی ہے۔

گئوماتا

"گئوماتا" اور اس مجموعے کی کہانی "بیری اور چنن" دونوں کہانیوں کا آغاز ایک ہی واقعہ سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں میں سوتیلی ماں اور اُس کے ظلم کا تذکرہ ہے۔ تاہم اس کہانی کا مرکزی کردار گئوماتا ہے۔ ہندو مذہب اور ہندوستانی تہذیب میں گائے کی جو اہمیت ہے، اُس کے اثرات اس لوک کہانی میں بھی نظر آتے ہیں۔

پُرانے وقتوں کی بات ہے، پنجاب پر ایک راجا حکومت کرتا تھا۔ راجے کا ایک ہی بیٹا تھا۔ ابھی کم سن ہی تھا۔ رانی ہر وقت بیمار رہتی تھی۔ ایک روز رانی محل میں لیٹی ہوئی تھی۔ اُوپر جو نظر اُٹھی تو کیا دیکھتی ہے کہ چھت کے شہتیر میں ایک چڑے اور چڑیا نے گھونسلا بنا رکھا ہے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ چند دن گزرے، محل کے سنگِ مرمر کے فرش پر چڑیا کی لاش پڑی نظر آئی۔ رانی کو چڑیا کے مرنے کا بہت دُکھ ہوا۔ نرم دل کی مالک رانی یہ سوچ کر اور بھی پریشان ہوئی کہ اب چڑیا کے بچوں کا کیا ہوگا؟ بن ماں کے بچے کیسے پلیں گے؟ کون ان کی نگہداشت کرے گا؟ اگلے ہی روز گھونسلے میں نئی چڑیا بیٹھی دکھائی دی۔ چڑے نے ایک اور بیاہ رچا لیا تھا۔ مگر یہ کیا، سوتیلی ماں نے آتے ہی بچوں کو بھکھڑا[1] کھلا دیا۔ کھاتے ہی بچوں کے نرم و نازک گلے کٹ گئے۔ وہ آن کی آن میں مر گئے۔ ظالم نے باری باری، ایک ایک کر کے، چونچ سے ان کی لاشیں اُٹھائیں اور گھونسلے سے باہر پھینک دیں۔ رانی نے یہ سب دیکھا تو تڑپ کر رہ گئی۔ وہ یہ سوچ کر ہلکان ہونے لگی کہ اگر میں مر گئی اور راجے نے نئی شادی کر لی تو کہیں سوتیلی ماں میرے بچے کے ساتھ بھی یہی سلوک نہ کرے۔ اس شام جب راجا کچہری سے واپس آیا تو رانی نے راجے سے وعدہ لیا کہ اگر وہ مر گئی تو راجا نیا بیاہ نہیں رچائے گا۔ اُس کے فرزند پر سوتیلی ماں کا سایہ نہیں پڑنے دے گا۔

چند دن گزرے تھے کہ رانی واقع میں مر گئی۔ کچھ عرصہ تک تو راجا ٹالتا رہا۔ رانی سے کیے ہوئے اپنے وچن کو نبھاتا رہا۔ لیکن آخر امیروں، وزیروں کے اصرار پر اور بچے کی بہتر پرورش کے خیال سے دوسری شادی کے لیے رضامند ہو گیا۔ محل میں نئی رانی آ گئی۔ پہلا سال تو خیریت سے گزرا۔ رانی کے ہاں ایک بچے نے جنم لیا۔ بس اپنی اولاد کے پیدا ہونے کی دیر تھی کہ جلاپا شروع ہو گیا۔ سوتیلی ماں بات بات پر فرق کرنے لگی۔ وقت جیسے تیسے گزرتا رہا۔ دونوں بھائی

---

[1] بھکھڑا: ایک خاردار پودا

اکٹھے، مل کر کھیلتے تھے لیکن دوسری طرف سوتیلی ماں کا ظلم بڑھتا رہا۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے تو گرم گرم، تازہ روٹی پکاتی، دیسی گھی سے چپڑتی اور پاس بٹھا کر اپنے ہاتھوں سے لقمے توڑ توڑ کر منہ میں ڈالتی اور سوتیلے بیٹے کو بِہی ؎ روٹی دیتی۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں: "روٹی کو کبھی "بِہی" نہ کہو۔ رات کی بچی ہوئی روٹی رات بھر اللہ کی عبادت کرتی ہے۔ اسی لیے اس میں زیادہ طاقت ہوتی ہے۔" لڑکے نے صبح سویرے ناشتے میں رات کی روٹی کھانی شروع کی تو سوتیلی ماں کی توقع کے خلاف، وہ کم زور ہونے کے بجائے پہلے سے کہیں زیادہ صحت مند ہونے لگا۔ سچ ہے: جب دشمن کوئی شر پیدا کرتا ہے تو اس میں ہمارے لیے خیر کا پہلو بھی نکل آتا ہے۔ رانی اسے دیکھ دیکھ کر حیران اور پریشان ہوتی تھی۔ جب منصوبہ ناکام ہو گیا تو اس نے اپنا انداز بدلا۔ اب وہ سوتیلے بیٹے کو کھانے کے لیے سوکھی روٹی دینے لگی، سالن کے بغیر۔ لڑکا سوتیلی ماں کی آنکھ بچا کر، روکھی روٹی کھانے کے بجائے جیب میں ڈال لیتا، اور محل سے باہر جا کر ببول کے ایک گھنے درخت کے نیچے بندھی اپنی گائے کو کھلا دیتا، بدلے میں گئو ماتا کے تھن کو منہ لگا کر دودھ پی لیتا۔ لڑکا پہلے کی طرح جوان اور تندرست ہوتا رہا۔ اب سوتیلی ماں نے پوری روٹی کی جگہ آدھی روٹی کر دی۔ لڑکا چھپ چھپا کے وہ بھی گائے کو کھلاتا رہا اور اس کا دودھ پیتا رہا۔ رانی بھی ہٹ کی پوری تھی۔ باز نہ آئی۔ اب لڑکے کو بُورکی روٹی پکا کر دینے لگی۔ لڑکا چپکے سے بُورکی روٹی بھی گائے کو کھلا دیتا اور اس کا دودھ پی لیتا۔ مثل مشہور ہے: "گاں دا دُدھ سو ماں دا دُدھ۔" (اردو ترجمہ: گائے کا دودھ سو ماں کا دودھ)۔ لڑکا روز بروز جوان اور صحت مند ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جب اس پہ کوئی اثر ہوتے ہوئے نہ دیکھا، کوئی تدبیر کارگر ہوتی نظر نہ آئی، تو رانی بہت سٹپٹائی۔ شومئی قسمت، ایک دن ظالم عورت نے لڑکے کو گئو ماتا کا تھن منہ میں ڈالے دودھ پیتے دیکھ لیا۔ لڑکے کی جوانی اور تن درستی کا سارا بھید پا گئی۔ پھر کیا تھا، تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اسی وقت بُلاوا بھیج کر بیوپاری بلوا لیے۔ بچارا لڑکا بہتیرا رویا، معافی مانگی کہ خدا کے لیے گائے نہ بیچو مگر سوتیلی ماں نے تو کانوں میں روئی ٹھونس لی۔ بچے کی آہ و بکا کا کچھ اثر نہ لیا۔ بیوپاریوں سے گائے کا سودا طے پا گیا۔ اتنے میں شام پڑ گئی۔ بیوپاری اگلی صبح گائے لے جانے کا کہہ کر چلے گئے۔

جب رات ہوئی، سب لوگ اپنے اپنے بستر میں دبک کر سو گئے۔ لڑکا چپکے سے اُٹھا، چارپائی سے اُترا، محل سے باہر آیا۔ پورن ماشی کی رات تھی۔ چودھویں کا چاند آسمان پر چمک رہا

؎ بِہی/بِہیا: (صفت) باسی، رات کا بچا ہوا۔

تھا۔ چاندنی کھیت کیے ہُوئے تھی۔ گائے بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔ لڑکا اُس کے پاس گیا۔ جی بھر آیا۔ گائے کے قریب بیٹھ گیا۔ گائے کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بے اختیار رونے لگا۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ جب دل ہلکا ہوا تو کہنے لگا: ”گئو ماتا! ماں کے مرنے کے بعد میں نے تجھی کو اپنی ماں مانا تھا۔ تجھی سے اپنے دکھ سکھ کہتا تھا۔ تیرے سوا میرا اور کون ہے؟ تُو نے مجھے ماں کی طرح پالا۔ کل تو چلی جائے گی تو میں واقعی اکیلا ہو جاؤں گا۔ میری ماں دوسری دفعہ مر جائے گی۔“ یہ کہتے ہُوئے لڑکا پھر بے اختیار ہو کر گائے سے لپٹ گیا اور زار زار رونے لگا۔ تب گائے کی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی: ”اے بھگوان! اے میرے خالق! مجھے زبان عطا کر دے۔ مجھے انسانوں کی بولی میں بات کرنے کی صلاحیت بخش دے۔“ انسان ہُوں یا جانور، دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی بات آسمان چیرتی ہُوئی بارگاہ میں پہنچ جاتی ہے اور ضرور، ضرور مُستجاب ہوتی ہے۔ ایشور نے اسی وقت گائے کو قوتِ گویائی عطا کر دی۔ گائے نے کہا: ”اے میرے پُوت! مت رو۔ اُٹھ میرا رَسّا کھول۔ مجھ پر سوار ہو جا۔ میں تجھے یہاں سے دُور، بہت دُور لے جاتی ہُوں۔ اس ظالم نگر سے، تیری سوتیلی ماں سے دور، کہیں دور۔“ لڑکے نے سر گھما کے چاروں طرف دیکھا وہ حیران تھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی تھی؟ اتنے میں گائے دوبارہ بولی۔ اس نے اپنی بات دوہرائی۔ پہلے تو لڑکے کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پھر یکایک خوشی سے کھل گیا۔ جلدی جلدی اُٹھا، کھونٹے سے گائے کا رَسّا کھولا اور دھیرے سے اس پر بیٹھ گیا۔ گائے آہستہ سے اُٹھی اور یک دم ایک جانب دوڑنا شروع کر دیا۔

ساری رات لڑکے کو لیے گائے بھاگتی رہی۔ شب کے اندھیارے میں وہ دونوں، دیہاتوں کی خاموشی میں ڈوبی گلیوں میں سے گزرے، دوب میں ڈھکی زمینوں میں رینگتی چُپ چاپ پگڈنڈیوں پر چلے، سرسبز و شاداب کھیتوں میں بہتے کھالوں کو پھلانگا۔ جب پو پھٹی تو وہ دریا کنارے، ایک گھنے جنگل میں کھڑے تھے۔ ایک طرف بوہڑ (بڑ) کے چند درخت اُگے ہُوئے تھے۔ وہیں ایک بوہڑ کے نیچے گائے نے لے جا کر لڑکے کو اُتارا۔ اُسے ٹھنڈی، گھنی چھاؤں میں بٹھا کر کہنے لگی: ”میرے بچے! کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جانا۔ یہیں بیٹھ کر میرا انتظار کرنا۔ میں ابھی آتی ہُوں۔“ اتنا کہہ کر گائے ایک طرف روانہ ہو گئی۔ چلتے چلتے دُور ایک گاؤں میں پہنچی۔ ایک گھر میں ایک کمہار بیٹھا، چاک پر مٹی کے برتن بنا رہا تھا۔ گائے نے اس سے ایک ہانڈی اور ایک پیالہ مانگا۔ گائے کو انسانی بولی بولتے دیکھ کر کمہار بھی بھونچکا رہ گیا۔ پھر اسے قدرت کا جلوہ جان کر، پرماتما کی نشانی

سمجھ کر اُٹھا، ہنڈیا اور پیالہ لا کے گؤ ماتا کے چرنوں میں رکھ دیا۔ گائے نے سر جھکایا، دونوں برتن اپنے سینگوں میں پھنسائے اور واپس جنگل کی طرف روانہ ہو گئی۔

لڑکا اسی طرح بوہڑ تلے بیٹھا، راہ دیکھ رہا تھا۔ جونہی گائے کو آتے دیکھا، خوش ہو گیا۔ گائے لڑکے کے پاس آ کر کہنے لگی: ''میرے بیٹے! یہ لے ہانڈی اور پیالہ۔ اب تو بچّہ نہیں رہا، بڑا ہو گیا ہے۔ ہانڈی میں میرا دودھ دھونا اور پیالے میں ڈال کر پی لینا۔'' لڑکا نہایت ادب سے بولا: ''میّا! جیسی آپ کی آگیا۔'' گائے سارا دن جنگل میں اِدھر اُدھر، آزادی سے ہری ہری، تازہ گھاس چرتی۔ جب لڑکے کو بھوک لگتی، گائے کو بلانا ہوتا، لڑکا بانسری بجاتا۔ بانسری کی مدھ بھری آواز سُنتے ہی گائے چلی آتی اور لڑکے کو اپنا دودھ پلا دیتی۔ ہنڈیا میں جو دودھ بچ جاتا، لڑکا بوہڑ کی جڑوں میں موجود ایک ڈڈ (بل) میں ڈال دیتا۔

دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ پانچ سال بیت گئے۔ ایک دن ڈڈ میں سے آواز آئی: ''او دودھ پلانے والے! مانگ کیا مانگتا ہے؟'' لڑکا، جواب خُوب جوان ہو چکا تھا، پہلے تو بہت حیران ہوا۔ جب آواز نے دُوبارہ پکارا تو کُچھ سوچ کر کہنے لگا: ''میرے بال سونے کے ہو جائیں۔'' درا صل اس کھڈ (بل) میں جانے کن وقتوں سے ایک سانپ رہتا تھا۔ سانپ نے پھنکار ماری۔ لڑکے کے بال سونے کے ہو گئے۔ ایک تو ویسے ہی بھرپور جوان، خُوب صُورت او گورا چِٹا تھا۔ اُوپر سے سنہری بال اور وہ بھی خالص سونے کے۔ سونے پر سُہاگہ۔

ایک دن کا ذکر ہے، وہ حسین نوجوان دریا کنارے کھڑا نہا رہا تھا۔ غسل کے دوران میں سر سے کُچھ بال ٹوٹ گئے۔ نوجوان نے سونے کے ان چمکتے بالوں کی گچھی بنائی اور دریا میں پھینک دی۔ دریا کا پانی اسے اپنے ساتھ بہا کر دُور ایک ریاست میں لے گیا۔ اس زمانے میں ہندوستان بہت سی راجپوت ریاستوں میں تقسیم تھا۔ حُسنِ اتفاق دیکھیے، اس ریاست کی راج کماری، جو اپنی خُوب صُورتی میں بے مثل تھی؛ اس وقت باندیوں اور نوکروں چاکروں کے ساتھ اپنی ریاست کے سب سے حسین جنگل کی سیر کو آئی ہوئی تھی۔ جنگل کے بیچوں بیچ دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کے کنارے پھولوں سے ڈھکے ہُوئے تھے۔ راج کماری جب رنگ اور خوشبو کے اس مسکن میں پہنچی تو بے اختیار اس کا دل نہانے کو چاہنے لگا۔ درختوں کے ایک جھرمٹ میں جا کے، اُس نے اور اُس کی حسین داسیوں نے ساڑھیاں اُتاریں اور گلابوں کے ایک کنج میں بہتے پانی میں اُتر گئیں۔ سب دیویاں ہندی حسن کی مجسم تصویریں تھیں۔ بوٹا سا قد، گدرایا ہوا گداز بدن، جیسے شرینھ (سرس)

کا کول پھول۔ جلد کا رنگ زردی مائل جیسے کنول کا پھول۔ بڑی بڑی، کالی کالی، مدبھری آنکھیں۔ سرین اور سینے کے اُبھار غیر معمولی۔ بس اجنتا کی مورتیں دریا میں اُتری ہُوئی تھیں۔ ایک دوسرے پر پانی کے چھینٹے اُڑا رہی تھیں، کھِل کھِلا کر ہنس رہی تھیں۔ دفعتہً راج کماری کی نظر پانی میں بہتی ہُوئی ایک عجیب، سنہری سنہری چیز پر پڑی۔ ارے یہ کیا؟ سونے کے بال۔ راج کماری بھونچکا رہ گئی۔ داسیوں نے بھی بال پکڑ پکڑ کے، چُھو چُھو کر دیکھے، وہ بھی حیرت میں ڈوب گئیں۔ چوں کہ بالوں کی لمبائی بہت زیادہ نہیں تھی، اسی لیے سب داسیوں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ یہ ضرور کسی مرد کے بال ہیں۔ راج کماری نے سنا تو سینے میں آتشِ عشق بھڑک اُٹھی۔ شانوں تک دریا کے پانی میں تھی اور بدن کو آگ لگی ہُوئی تھی۔ اسی لمحے باندیوں کو ساتھ لے کر دریا سے نکلی، سب نے ساڑھیاں باندھیں، رتھ میں بیٹھیں اور واپسی کی راہ لی۔ راج محل میں آ کر سیدھی پتا کے پاس گئی۔ سونے کے بال دکھا کے بس ایک ہی بات کہی: ''اگر آپ میری زندگی چاہتے ہیں تو جس مرد کے یہ بال ہیں، اُسے ڈھونڈ کے لائیے۔''

راجے نے فوراً اپنے وفادار ملازموں اور سپاہیوں کو دریا کے بہاؤ کی مخالف سمت میں، اُوپر کی طرف روانہ کر دیا کہ جاؤ اور سونے کے بالوں والا مرد تلاش کرو۔ جہاں نظر آ جائے، پکڑو اور میرے پاس لے آؤ۔ ملازم ہاتھ میں سونے کے ٹوٹے ہُوئے بال پکڑے، دریا کے کنارے کنارے چلتے گئے، چلتے گئے۔ آخر کار، دُور کی ریاست میں واقع جنگل کے اُن بوہڑ کے درختوں کے پاس جا پہنچے، جہاں ایک طرف گائے گھاس چر رہی تھی؛ دوسری طرف سونے کے بالوں والا نوجوان بیٹھا تھا۔ بس پھر کیا تھا، انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، نوجوان کو پکڑا، رسّوں سے باندھا، گھوڑے پر ڈالا اور یہ جا، وہ جا۔ چند دنوں میں نوجوان، راجے اور ان کی حسین پُتری کے رُوبرُو کھڑا تھا۔ راجا اپنی بیٹی کے انتخاب سے بے حد مسرور تھا۔ سچ تو یہ ہے، وہ چراغ لے کر ڈھونڈتا تو ایسا بَر نہ ملتا۔ سونے کے بالوں والا مرد۔ ایسا تو دنیا میں پہلے کسی نے نہ کبھی سنا تھا، نہ دیکھا تھا۔ راجے نے سوچا کہ ارد گرد کی سب ریاستوں میں میری تو دھوم مچ جائے گی کہ راجے نے اپنی پُتری کے لیے کیسا غیر معمولی بَر ڈھونڈا ہے۔ سب راجے مہاراجے میرے آگے چھوٹے ہو جائیں گے۔ چٹ منگنی، پٹ بیاہ کے مصداق راجے نے فی الفور اپنی بیٹی کی شادی سونے کے بالوں والے نوجوان سے کر دی۔

راج کماری کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ جسے چاہا، وہی مل گیا۔ عشق کامیاب ہو گیا۔

دُوسری طرف نوجوان بھی پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس قدر خُوب صورت عورت، سچ مچ پدمنی، دُلھن کے روپ میں ملی تھی۔ سونے پر سہاگہ، راج کماری۔ ہر شب، شبِ برات تھی، ہر روز روزِ عید۔ نوجوان خوشیوں میں ایسا مست ہوا کہ اپنی ماں کو بھی بھول گیا۔ گئو ماتا کو، جس نے اپنا دودھ پلا کر اسے پالا تھا، جس نے اسے سوتیلی ماں کے ظلم سے بچایا تھا۔

کئی سال بیت گئے۔ راجے کے نرینہ اولاد نہیں تھی۔ فقط بیٹی ہی بیٹی تھی۔ راجے کی موت کے بعد جوائی راجا (داماد) تخت پر بیٹھا۔ دُنیا اُسے "سونے کے بالوں والا راجا" کہہ کر پکارتی تھی۔ وہ بڑی آن بان سے حکومت کر رہا تھا، راجا راج، پرجا سکھی۔ ریاست کے کام دھندوں میں ایسا کھویا کہ نہ دن گزرنے کا پتا چلتا تھا، نہ رات پڑنے کا۔ ایک شب تھک ہار کے چھپر کھٹ پر سویا ہوا تھا، اچانک سپنے میں گائے کو دیکھا۔ اسی گھڑی آنکھ کُھل گئی۔ ماں، ماں کہتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ رانی بھی آنکھ ملتی ہُوئی اُٹھ کے بیٹھ گئی۔ راجا مسلسل روئے چلا جا رہا تھا اور ماں ماں پُکار رہا تھا۔ رانی بے چاری بہت حیران پریشان ہوئی۔ پتی کا ماتھا چھوا، مُکھ چُوما اور رونے کی وَجہ پُوچھی۔ راجے نے سسکیاں بھرتے ہُوئے ساری بپتا کہہ سنائی۔ آخر میں اپنے اُوپر لعنت بھیج کر کہنے لگا کہ میں کیسا بیٹا ہُوں، جو اپنی ماں کو بھول گیا۔ گئو ماتا کو بُھول گیا اور اتنے سال بھولا رہا۔ رانی نے اسے تسلی دی، ہمت بندھائی اور کہا کہ ابھی بھی کُچھ نہیں بگڑا۔ اسی جنگل میں جاؤ اور گئو ماتا کو اپنے ساتھ یہاں لے آؤ۔

باقی کی رات آنکھوں میں کٹی۔ گجر دم، راجا سپاہیوں کے ایک چاق و چوبند دستے کو ہم راہ لے کر روانہ ہو گیا۔ دریا کے کنارے کنارے کئی دن سفر کیا۔ آخر اسی جنگل میں پہنچا۔ بوہڑ کے پُرانے گھنے درختوں کے پاس آیا اور رو رو کر بانسری بجانے لگا، گئو ماتا کو بُلانے لگا۔ مگر گائے نہ آئی۔ چاروں اور نظر دوڑائی، گائے کہیں دکھائی نہ دی۔ اب تو چلا چلا کر رونے لگا، سر پیٹنے لگا۔ آخر بوہڑ کی جڑ میں بنی اسی کھڈ کی طرف گیا، جس میں ایک سانپ صدیوں سے رہ رہا تھا، جس میں وہ بچا کھچا دودھ ڈالا کرتا تھا۔ اور اسی دودھ کے عوض سانپ کی پھنکار نے اُس کے بالوں کو سونے کا کر دیا تھا۔ بانبی میں سے آواز آئی: "ارے ظالم! اب آیا ہے۔ اپنی ماں کو بھول گیا تھا، جس کے دودھ نے تجھے زندگی بخشی تھی۔ وہ بے چاری سارا سارا دن جنگل میں تجھے ڈھونڈتی رہی۔ رات رات بھر تجھے پکارتی رہی۔ اور یُونہی اڑنگ اڑنگ ؎ کر مر گئی۔" یہ سُن کر تو راجا بہت رویا۔ روتے روتے اس کی حالت اتنی غیر ہو گئی کہ ہم راہیوں کے پسینے چُھوٹ گئے۔ یہ سوچ کر

؎ اڑنگنا: چیخنا، حلق پھاڑ کر چیخنا

بے چاروں کا دم نکلا جا رہا تھا کہ کہیں یہاں سے راجے کی ارتھی ہی اُٹھا کے نہ لے جانی پڑے۔
ناگ راجا سے راجے کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ اسے ترس آ گیا۔ بانبی سے آواز آئی: ''وہ سامنے شرینھ تلے گائے کی ہڈیاں پڑی ہیں۔ جا اُٹھا لا۔'' یہ سُنتے ہی راجا بھاگا بھاگا گیا، گئو ماتا کا پنجر اُٹھایا، سینے سے لگایا اور ناگ کے پاس آ گیا۔ سانپ نے پنجر زمین پر رکھنے کا حکم دیا۔ راجے نے تعمیل کی۔ ناگ دیوتا نے پھنکار ماری۔ گائے زندہ ہو گئی۔ زندہ ہو کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ راجے کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ یہ دیکھ کر ساتھیوں کی بھی جان میں جان آئی۔ راجا گئو ماتا کے گلے لگ کے خُوب رویا۔

راجا گئو کو بڑی عزت اور شان و شوکت سے محل میں لایا۔ گائے کی تکریم بالکل ماں کی طرح کی۔ جب تک گئو ماتا زندہ رہی، راجا رانی، دونوں میاں بیوی اس کی خدمت میں جُتے رہے۔ رات دن دل و جاں سے اس کی سیوا میں لگے رہے۔ ایک مدت کے بعد جب گئو ماتا فوت ہوئی تو پورے شاہی اعزاز کے ساتھ اس کی چتا راج محل کے صحن میں جلی، اس کا کِرِیا کرم کیا گیا۔ وہیں اس کی مڑھی (سمادھی) بنائی گئی، جس پر ساری عمر، ہر اتوار کی شام کو، راجا اور رانی چراغ جلاتے رہے۔

اتوار ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۹ء

سمندر نا کُتّی، گائے اور گھوڑا

یہ صدیوں سے انسان کے ساتھ رہنے والے تین پالتو جانوروں کی کہانی ہے۔ ان کی وفاداری کا نہایت خُوب صُورت، اثر انگیز مرقع ہے۔ یہ اس عہد کی داستان ہے جب ہندوستان چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستوں میں منقسم تھا۔ ہر ریاست کا اپنا راجا تھا۔ اس کلاسیکی کہانی میں قدیم ہندی تہذیب کی ایک مشہور رسم ''سُویمبر'' کا ذکر بھی ہوا ہے۔

پُرانے وقتوں کی بات ہے۔ پنجاب پر ایک راجا حکومت کرتا تھا۔ راجا راج پر جا سکھی۔ راجے کے ہاں خُدا کا دیا سب کُچھ تھا، بس اولاد نہیں تھا۔ وہ رات دن نرینہ اولاد کے لیے دعائیں مانگا کرتا، تا کہ اُس کے بعد راج سنگھاسن خالی نہ رہے اور راج لاج چلتا رہے۔ ایک روز راجا اسی سوچ میں ڈوبا ہوا، بہت پریشان بیٹھا تھا کہ راج محل کے دروازے پر ایک جوگی نے صدا دی۔ راجے نے اسے اپنے پاس بلوالیا۔ فقیر نے راجے سے اس کی پریشانی پوچھی۔ راجا بولا: ''اے سوامی! تم سے پہلے بھی چھ فقیر آئے اور آ کر چلے گئے۔ ان میں سے کوئی میرے من کی مُراد پُوری نہیں کر سکا۔ تم ساتویں ہو۔'' فقیر کہنے لگا ''اے راجے! تو بتا تو سہی۔ ہر کام کا ایک سمے ہے۔ کیا خبر، میرے ہی ہاتھوں تیرا کام بننا ہو۔'' فقیر نے خُدا لگتی کہی تھی۔ راجا مُتاثر ہُوئے بغیر نہ رہ سکا۔ فوراً دل کی بات زبان پر لے آیا۔ فقیری شیر کا برقع ہے۔ فقیر نے اپنی گدڑی میں ہاتھ ڈالا۔ جب باہر نکالا تو ہتھیلی پر ایک آم تھا۔ فقیر نے آم راجے کو دیتے ہوئے کہا: ''اے راجا! یہ آم اپنی رانی کو کھلا دینا۔ بھگوان کی کرپا سے نو ماہ بعد رانی راج گدی کے وارثِ کو جنم دے گی۔'' فقیر نے اتنا کہا، آن کی آن میں محل سے نکلا اور یہ جا، وہ جا۔

راجے کی سات رانیاں تھیں۔ ساتویں غریبوں کی بیٹی تھی لیکن حُسن اور نیکی میں سب سے آگے۔ سچ ہے: ''پدمنی چماراں وِچ ہندی اے'' (اُردو ترجمہ: پدمنی چماروں میں ہوتی ہے۔) راجے کو اس سے سب سے زیادہ محبّت تھی۔ چوں کہ ساتویں رانی بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، جب راجے سے اس کی شادی ہُوئی تو اسے اپنے ماں باپ کی طرف سے جہیز میں صرف تین چیزیں آئیں: ایک کتی، جس کا نام ''سمندر نا'' تھا، ایک گھوڑا اور ایک گائے۔ غرض راجا ناک کی سیدھ ساتویں رانی کے محل میں گیا اور اسے فقیر کا دیا ہوا آم کھلا دیا۔ رانی کو گربھ ہوا۔ جب یہ خبر دوسری رانیوں تک پہنچی تو وہ جلاپے کے مارے پیچ و تاب کھانے لگیں۔ سوچنے لگیں کہ

ساتویں کی ہاں ولی عہد کی پیدائش کے بعد ہماری قدر کم ہو جائے گی اور راجے کی نظر میں ساتویں کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ وہ چھ کی چھ اکٹھی ہو گئیں۔ اُنھوں نے مل کر ساتویں کے خلاف ایک مکروہ سازش تیار کی۔ اس سازش کو پایۂ تکمیل تک صرف دائی پہنچا سکتی تھی۔ چنانچہ دائی کو ہزاروں اشرفیوں کا لالچ دے کر ساتھ ملا لیا گیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ جیسے بھی بن پڑے نوزائیدہ بچے کو ماں سے جُدا کر دیا جائے۔ جب بچے کی پیدائش کا وقت قریب آیا تو دائی چھاپا کٹنی کہنے لگی: ''میری آنکھوں پر کس کر پٹی باندھ دو۔ میں بنا دیکھے بچہ جنواؤں گی۔'' سو ایسا ہی ہوا۔ سب مان گئے۔ جنائی نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی۔ حُسنِ اتفاق دیکھیے کہ جب رانی کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو اسی دن کتی اور گائے بھی سُوئیں ؎۔ ظالم دائی نے سمندر نا کتی کا بچہ اُٹھا کے رانی کے ساتھ لِٹا دیا اور رانی کا بچہ لے جا کے باہر کتی کے ساتھ لٹا دیا کہ سردی دھوپ سے خود ہی مر جائے گا۔

اُدھر رانیوں نے سارے شہر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ راجے کے ہاں کتیا کے بچے نے جنم لیا ہے۔ راجا بھاگم بھاگ محل میں پہنچا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ واقعی رانی کے پہلو میں ایک کتورا (پلّا) لیٹا ہوا تھا۔ راجے نے رانی کو محل سے نکال دیا۔ بے چاری غریبوں کی بستی میں آ کے، ایک جھونپڑی میں رہنے لگی۔ یہ دیکھ کر باقی رانیاں پھولا نہ سمائیں، ایک دوسری کو اترا اترا کے مبارک باد دینے لگیں اور بولیں: ''جل کی مچھلی جل ہی میں بھلی۔''

ادھر سمندر نا کتی نے راج کمار کو اپنا دودھ پلانا شروع کر دیا۔ راج کمار کتی کے دودھ سے پروان چڑھنے لگا۔ دن پر دن گزرتے گئے۔ بچہ خُوب صحت مند تھا، اور اب تو رڑھنے (گھٹنوں کے بل چلنے) بھی لگا تھا۔ ایک روز سوتنوں نے محل کے دریچے سے جھانک کے دیکھا کہ بچہ تو ابھی تک زندہ ہے اور کتیا اسے پال رہی ہے۔ چھ کی چھ رانیاں کھن پٹی لے کے پڑ رہیں۔ شام کو جب راجا کچہری سے واپس آیا تو انھوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ سمندر نا کتی کو فی الفور مار دیا جائے ورنہ ہم زندہ نہیں رہیں گی۔ راجے نے اسی وقت جلاّد کو حکم دیا۔ جلاّد سمندر نا کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''اے کتیا! جو کچھ کھانا ہے، کھا پی لے، تجھے کل، پو پھٹتے سے قتل کر دیا جائے گا۔'' تب سمندر نا بچے کو لے کر گائے کے پاس گئی اور سارا واقعہ سنا کے کہنے لگی: ''یہ ہماری رانی کا بچہ ہے۔ اب تک میں نے اس کی نگہداشت کی ہے۔ مجھے کل صبح راجے کے حکم سے مار دیا جائے گا۔ میرے بعد اس بچے کو پالنے کی ذمہ داری تیری ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے بچہ گائے کے سپرد کیا اور واپس

؎ سُون، سُونا: مویشی کا بچہ جننا

چلی آئی۔ اگلی صبح جلاّد نے سمندر نا کتی کو قتل کر دیا۔

اب بچہ گئو کا دودھ پی کر پلنے لگا۔ سچ ہے: ''گاں داؤدھ سو ماں داؤدھ'' (اُردو ترجمہ: گائے کا دودھ سو ماں کا دودھ)۔ گائے اسے ماں کی طرح پال رہی تھی۔ اس نے سمندرنا کو جو وچن دیا تھا، اس کا پالن کر رہی تھی۔ اب راج کمار پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ ہولے ہولے پانچ چھ برس کا ہو گیا۔ ایک روز سوتنوں نے محل کے دریچے سے جھانک کے دیکھا کہ بچہ تو ابھی تک زندہ ہے اور گائے اسے پال رہی ہے۔ چھ کی چھ رانیاں کھٹ پٹی لے کے پڑ رہیں۔ شام کو جب راجا کچہری سے واپس آیا تو انھوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ گائے کو فی الفور مار دیا جائے، ورنہ ہم زندہ نہیں رہیں گی۔ راجے نے اسی وقت جلاّد کو حکم دیا۔ جلاّد گائے کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''اے گائے! جو کچھ کھانا ہے، کھا پی لے۔ تجھے کل، پو پھٹتے سے قتل کر دیا جائے گا۔'' تب گائے بچے کو لے کر گھوڑے کے پاس گئی اور سارا واقعہ سُنا کے کہنے لگی: ''یہ ہماری رانی کا بچہ ہے۔ سمندرنا کے بعد میں نے اس کی نگہداشت کی ہے۔ مجھے کل صبح راجے کے حکم سے مار دیا جائے گا۔ میرے بعد اس بچے کو پالنے کی ذمہ داری تیری ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے بچہ گھوڑے کے سپرد کیا اور واپس چلی آئی۔ اگلی صبح جلاّد نے گائے کو قتل کر دیا۔

گھوڑے کو گندم، جو وغیرہ کے جو دانے کھانے کو ملتے تھے، وہ اس میں سے آدھے بچے کو دے دیتا۔ راج کمار کی بہت اچھے انداز سے پرورش ہونے لگی۔ گھوڑا اسے شاہی اصطبل سے باہر نہیں جانے دیتا تھا۔ اندر رکھ کر ہی پال پوس رہا تھا۔ جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔ راج کمار اب بارہ تیرہ سال کا ہو گیا تھا اور خوب کھیلتا کودتا پھرتا تھا۔ ایک روز سوتنوں نے محل کے دریچے سے جھانک کے دیکھا کہ بچہ تو ابھی تک زندہ ہے اور گھوڑا اسے پال رہا ہے۔ چھ کی چھ رانیاں کھٹ پٹی لے کر پڑ رہیں۔ شام کو جب راجا کچہری سے واپس آیا تو انھوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ گھوڑے کو فی الفور مار دیا جائے، ورنہ ہم زندہ نہیں رہیں گی۔ راجے نے اسی وقت جلاد کو حکم دیا۔ جلاد گھوڑے کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''اے گھوڑے! جو کچھ کھانا ہے، کھا پی لے۔ تجھے کل، پو پھٹتے سے قتل کر دیا جائے گا۔'' بچہ اب کافی سمجھ دار ہو چکا تھا۔ گھوڑے نے راج کمار کو سارا واقعہ سنایا اور کہا: ''سمندرنا کتی کے بعد تجھے گائے نے پالا اور گائے کے بعد میں نے، لیکن میرے بعد ایسا کوئی نہیں جو تیری پرورش کی ذمہ داری لے سکے۔ کیوں نہ ہم دونوں رات کے اندھیارے میں جان بچا کے یہاں سے بھاگ جائیں۔'' راج کمار نے بھی گھوڑے کی ہاں میں ہاں ملائی۔ چناں چہ

جب آدھی رات ہوئی، گھوڑے نے لڑکے کو اپنے اُوپر بٹھایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگتے بھاگتے وہ شہر سے نکلے اور دُور کسی دوسری بادشاہی میں واقع جنگل میں جا پہنچے۔

جب پو پھٹی، سورج کی روشنی پھیلی، گھوڑا کہنے لگا: ''راج کمار! میں جنگل کی ہری ہری گھاس چرتا ہوں۔ پاس ہی اُدھر پورب کی طرف ایک گاؤں دکھائی پڑتا ہے۔۔ تم وہاں جاؤ۔ تنّدور سے روٹی لے کر کھا لینا۔ میں یہیں ٹاہلی (شیشم) کے درختوں کے نیچے تمھارا انتظار کروں گا۔'' لڑکا گاؤں میں پہنچا۔ ایک ماچھن [1] نے تنّدور تایا ہوا (تپایا ہوا) تھا اور روٹی لگا رہی تھی۔ راج کمار تنور کے پاس ہی بیٹھ گیا اور بولا: ''مائی! ایک روٹی مجھے بھی دے دو۔ مجھے بہت بُھوک لگی ہے۔'' ماچھن نے ایک روٹی لی، اُوپر تھوڑا سا سالن رکھا اور راج کمار کو کھانے کے لیے دی۔ اس نے روٹی کھائی، پانی پیا اور وہیں بیٹھ رہا۔ ایک دو گھنٹے گزرے تھے کہ ماچھن کا شوہر ماچھی لکڑیاں کاٹنے جنگل کی اور جانے لگا۔ راج کمار نے کہا: ''بابا! مجھے بھی اپنے ساتھ ہی رکھ لو۔ میں لکڑیاں کاٹنے میں تیری مدد کیا کروں گا۔ بدلے میں مجھے دو وقت کی روٹی دے دیا کرنا۔'' غرض راج کمار ماچھی کے ساتھ ہی رہنے لگا۔

کئی روز گزر گئے۔ ایک دن راج کمار، لکڑیاں بیچتا، پھرتا پھراتا راج دھانی میں پہنچا۔ وہ محل کے نیچے سے گزر رہا تھا کہ حُسنِ اتفاق سے راج کماری جھروکے میں کھڑی تھی۔ اس کی نظر راج کمار پر پڑی تو اس کا حسین مکھ دیکھ کر دل و جان سے عاشق ہو گئی۔ راج کمار تو گزر گیا مگر راج کماری کو اُٹھتے بیٹھتے کسی پل چین نہ تھا۔ عشق کی آگ میں تڑ تڑ جل رہی تھی، ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ جب سہار ہونی ممکن نہ رہی تو پِتا سے کہا کہ میرے لیے فوراً سُوئمبر کی رسم منعقد کی جائے۔ میں اپنے لیے شوہر کا انتخاب کروں گی۔ راجے نے پُتری کی بات مان لی۔ اسی وقت پورے ملک میں ڈھنڈورا پٹوا دیا گیا۔

مقررہ دن آیا۔ سب لوگ تڑ پھڑ (سج سجا، بن سنور) کے محل کے گرد جمع ہُوئے۔ ماچھی نے بھی لڑکے سے کہا کہ پتر! تُو بھی جا۔ سوئمبر میں شرکت کر۔ کیا خبر تیرے ساتھ ہی راج کماری کا بیاہ ہو جائے۔ غرض سُوئمبر کی رسم کا آغاز ہوا۔ راج کماری ہاتھ میں کنگو [2] کی کٹوری لیے، ایک جھروکے میں آ کھڑی ہُوئی۔ ایک ایک کر کے لوگ جھروکے کے نیچے سے گزرنے لگے۔ سب گزر

---

[1] ماچھن: ''ماچھی'' قوم کی عورت، جس کا کام تنور میں روٹیاں لگانا ہے۔

[2] کنگو: (مذکر) ۱۔ زعفران ۲۔ ایک سرخ رنگ جو تلک لگانے کے کام آتا ہے۔ ۳۔ پتلی سی

گیئے، راج کماری نے کسی پر کنگنو نہ ڈالا۔ لیکن جب لڑکا گزرا تو راج کماری نے فوراً کٹوری سے کنگنو اُس پر گرا دیا۔ لوگوں میں شور مچ گیا۔ شہر والوں نے واویلا کیا کہ کہاں راجہ بھوج، کہاں گنگوا تیلی۔ راج کماری سے ضرور بھول چوک ہوگئی۔ سُوِیمبر کی رسم دوبارہ منعقد کی جائے۔ سُوِیمبر پھر سے ہُوا۔ مگر ہائیں، یہ کیا، راج کماری نے دوسری دفعہ پھر اسی لڑکے پر کنگنو گرایا۔ لوگوں نے پھر دوہائی دی۔ ضرور اب کی کی بار بھی راج کماری سے بُھول ہوگئی۔ سو تیسری مرتبہ سُوِیمبر کی رسم منعقد کی گئی۔ مگر ڈھاک کے تین پات۔ نتیجہ وہی نکلا۔ راج کماری نے اسی لڑکے پر کنگنو ڈالا۔ ناکام عاشق بہت خطرناک ہوتا ہے۔ سب ٹھکرائے ہُوئے لوگوں کا اکٹھ ہوا (پنچایئت ہُوئی)۔ سب نے فیصلہ کیا کہ چاہے کُچھ بھی ہو، ہم نے ہر قیمت پر اس شادی کو رکوانا ہے۔ اب انھوں نے ایک اور چال چلی۔ سب راجے کی کچہری میں گئے اور بولے: ''مہاراج! ہم جنگل میں شکار کھیلنے جاتے ہیں۔ جو سب سے زیادہ ہرن مار کر لائے گا اسی سے راج کماری کا بیاہ ہوگا اور اسی کو آدھا راج ملے گا۔'' راجے نے فوراً اسی کے موافق حکم جاری کر دیا۔ سب لوگوں کو اچھے اچھے گھوڑے ملے۔ نئی نئی تیز تلواریں ملیں۔ اس لڑکے کے حصّے میں سب سے کم زور گھوڑا آیا اور سب سے زیادہ کند اور زنگ آلود تلوار ملی۔

جنگل میں ٹاہلیوں کے نیچے گھوڑا کب سے اُس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اب راج کمار کو اس کی یاد آئی۔ فوراً اُس کے پاس پہنچا اور سب رام کہانی سنائی۔ گھوڑا بولا: ''راج کمار! پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ سب لوگ اسی جنگل میں ہرن مارنے آئیں گے۔ تم اس مریل گھوڑے کو یہیں چھوڑ دو۔ میں گھیر گھار کر ہرن لاتا جاؤں گا، تم آرام سے شکار کرتے جانا۔'' چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ لڑکے نے ذرا سی دیر میں کئی سو ہرن شکار کر لیے۔ دوسری طرف سب لوگ بے نیلِ مُرام رہے۔ کسی کے ہاتھ کوئی ایک ہرن بھی نہ آسکا۔ اب سب اُسی لڑکے کے پاس گئے۔ وہ اس وقت پیپل کے ایک درخت کے نیچے مُنہ پر نقاب ڈالے بیٹھا تھا۔ آگ تڑ تڑ جل رہی تھی اور وہ ہرن کا گوشت بھون رہا تھا۔ لوگ اُس کے سامنے جا کے آہ وزاری کرنے لگے کہ ہم پر عجب اُفتاد پڑی ہے۔ راجا ضرور ہمیں قتل کروا دے گا۔ تم شکار کر کر کے ہرنوں کا ڈھیر لگائے بیٹھے ہو۔ ایک ایک ہرن ہم سب کو دے دو۔ ہم تمھیں دعائیں دیں گے۔ راج کمار کی انگلی میں اس وقت اپنے باپ کا مندرنا (مندرا، بڑی انگوٹھی) تھا۔ اس نے لوگوں سے کہا ''میری ایک شرط ہے۔ میں آگ پر اپنا مندرنا گرم کروں گا۔ تم سب اپنا اپنا دایاں پٹ (ران، زانو) ننگا کر لو۔ میں اس پر مندرنے سے نشان لگاؤں گا۔ اُس کے بعد چاہو تو سارے ہرن اُٹھا کے لے جانا۔'' چوں کہ لڑکے نے مُنہ پہ نقاب لے رکھا تھا، اس لیے وہ اسے پہچان نہ سکے۔ اُنھوں نے

دل میں سوچا: مندرنے کا نشان لگوانے سے کیا ہوتا ہے۔ ذرا کی ذرا درد ہوگا۔ پٹ پر تو ہمیشہ کپڑا رہے گا۔ کسی کو کیا پتا چلے گا، اور اُس کے عوض ہمیں راجے کی بیٹی کا ساک (رشتہ) مل جائے گا۔ سب نے اپنے اپنے پٹ پر مندرنے کا نشان لگوا لیا۔ پھر ہرن اُٹھا کے کندھوں پر رکھے اور خوشی خوشی راج دربار کی طرف روانہ ہو گئے۔ اُنھوں نے راجے کے آگے شکار کیے ہُوئے ہرنوں کا ڈھیر لگا دیا، اور بڑی شیخی سے بتایا کہ یہ سب ہرن ہم شکار کر کے لائے ہیں۔ اور راج کماری کی پسند، وہ لڑکا جانے کہاں جنگل میں ٹامک ٹوئیے مار رہا ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد راج کمار بھی اپنے مریل سے گھوڑے پر سوار خراماں خراماں چلتا آن پہنچا۔ لوگوں نے خُوب مذاق اڑایا کہ بڑا سورما بنا پھرتا تھا، دیکھ لیجیے یہ تو ایک ہرن بھی شکار کر کے نہیں لایا۔ لڑکا کُچھ دیر سُنتا رہا، پھر بولا: "مہاراج! یہ سب ہرن میں نے ہی شکار کیے ہیں اور اُنھیں اس شرط پر دیئے ہیں کہ میرے مندرنے کا نشان اپنے اپنے پٹ پر لگوا لو۔ آپ ان سے کہیں کہ کپڑا اُلٹیں، اپنا اپنا دایاں پَٹ دکھائیں۔ ابھی دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو جائے گا۔" چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب ان لوگوں کے دائیں پٹ دیکھے گئے تو واقعی وہاں مندرنے کے نشان لگے ہُوئے تھے اور کسی ایک کا پَٹ بھی صاف نہیں تھا۔ راجے نے اپنی بیٹی کی شادی لڑکے سے کر دی۔ آدھا راج بھی اُس کے حوالے کر دیا۔

اس زمانے میں یہ رواج تھا کہ داماد کو پانچ برس بیوی کے میکے میں، ساس سسر کے پاس ٹھہراتے تھے۔ اس کے بعد میاں بیوی الگ گھر میں جا کے رہتے تھے۔ اُنھوں نے بھی پانچ سال راجے کے ہاں قیام کیا۔ اس دوران میں ان کے ہاں ایک بچّہ بھی پیدا ہوا۔ جب مقررہ وقت گزر گیا تو راج کمار بیوی سے کہنے لگا: "اب ہم واپس جائیں گے۔" دونوں نے راجے سے اجازت لی اور محل سے چلے گئے۔ اُنھوں نے جنگل میں جا کر گھوڑے کو ساتھ لیا۔ چلتے چلتے راج کمار اپنے باپ کے ملک میں پہنچا۔ اُنھوں نے راج دھانی سے کُچھ فاصلے پر ایک جنگل میں اپنے لیے محل تعمیر کروایا، اور وہ گھوڑے کے ساتھ وہیں رہنے لگے۔ گھوڑے کے کہنے پر راج کمار نے محل کے اندر ہی بوہڑ (بڑ) کے سائے میں تازہ پانی کا ایک چھوٹا سا تالاب بنوایا۔ پھر گھوڑے کے مشورے پر ترکھان (بڑھئی) سے ایک کاٹھ کا گھوڑا بنوایا اور تالاب کے کنارے لا کے کھڑا کر دیا۔ گھوڑا راج کمار سے کہنے لگا: "اب اپنے باپ کی دعوت کرو، تالاب کے کنارے۔ جب راجا کھانا کھانے لگے تو تم کہنا: "آٹ کاٹھ دے (کے) گھوڑے! چھیو [1] پانی پی۔" اور پھر اُس کے بعد والی ساری بات لڑکے کو سمجھائی۔

---

[1] گائے، بیل اور دوسرے مویشیوں وغیرہ کو بلانے اور پانی پلانے کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ راج کمار نے اپنے باپ کی شان دار دعوت کی۔ زردہ، بریانی، قورمہ، تنجن، فرنی، طرح طرح کے کھانے پکوائے گئے۔ راجا بڑے فخر سے دعوت میں آیا۔ جب وہ پہلا لقمہ منہ میں ڈالنے لگا تو راج کمار نے تالاب کے کنارے کھڑے کاٹھ کے گھوڑے کو پکڑا اور کہا: ''آ ٹ کاٹھ دے گھوڑے! چھپو پانی پی۔'' یہ سن کر راجا بہت حیران ہوا۔ لڑکے سے کہنے لگا: ''تیری کہیں مت تو نہیں ماری گئی۔ ہوش کے ناخن لو۔ بھلا کبھی کاٹھ کے گھوڑے نے بھی پانی پیا ہے؟'' لڑکا جواب میں کچھ نہ بولا۔ راجے نے دوسرا لقمہ لیا۔ لڑکے نے پھر وہی جملہ کہا۔ راجے نے پھر وہی سوال دوہرایا۔ آخر جب تیسری دفعہ یہی واقعہ ہوا تو راجے نے لقمہ ایک طرف رکھ دیا۔ کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور بولا: ''اے لڑکے! جب تک تو مجھے اصل بات نہیں بتائے گا، میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔'' لڑکا کہنے لگا: ''مہاراج! آپ یہ تو کہتے ہیں: بھلا کبھی کاٹھ کے گھوڑے نے بھی پانی پیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں: بھلا کبھی انسانوں کے گھر کتیا کے بچے نے بھی جنم لیا ہے؟'' راجے نے سنا تو کان کھڑے ہو گئے۔ برسوں پہلے کا واقعہ آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا۔ راجا پریشان ہو کر بولا: ''اس بات کا تمھیں کیسے پتا؟'' لڑکا بولا: ''میں غریب رانی کا وہی بیٹا ہوں، جس کی جگہ کتی کا بچہ رکھا گیا تھا۔'' پھر اس نے الف سے ی تک ساری کہانی کہہ سنائی۔ راجے نے سنا تو بے اختیار رونے لگا۔ اٹھ کے اپنے بیٹے، اپنے وارث کو گلے سے لگایا۔ اپنی بہو کے سر پہ ہاتھ رکھا، ماتھا چوما۔ پوتے کو بازوؤں میں اٹھایا، اٹھا کے کندھے پر سوار کر لیا۔ گھوڑے کو پیار کیا۔ اس کی وفاداری کی بہت بہت تعریف کی۔ خوب پیٹھ ٹھونکی۔ سب کو ہمراہ لیے اپنے راج محل میں واپس آیا۔ محل میں آ کے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ دائی اور چھ کی چھ رانیوں کے سر قلم کروا دیے۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ پھر راجا اپنے بیٹے، بہو اور پوتے کو لے کر غریبوں کی بستی میں گیا۔ ساتویں رانی جانے کب سے اس حسین لمحے کی راہ دیکھ رہی تھی؛ اسی آس کے سہارے زندگی گزار رہی تھی۔ جب اسے ساری حقیقت کا پتا چلا تو خوشی کے مارے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بیٹے اور بہو کو سینے سے لگایا۔ پوتے کا منھ چوما، گھوڑے کو بھی خوب جی بھر کے پیار کیا۔ راجے نے رانی سے اپنے کیے کی معافی مانگی۔ اپنی بے وقوفی پر خود کو خوب کوسا۔ پھر سارے لوگ محل میں لوٹ آئے۔ کتنے ہی مہینوں تک پورے ملک میں شادیانے بجتے رہے۔ رعایا نے دل کھول کر خوشیاں منائیں؛ ولی عہد کا پرتپاک استقبال کیا۔ چند سالوں بعد راجے نے اپنی سلطنت بیٹے کے سپرد کر دی۔ سب زندگی بھر ہنسی خوشی رہتے رہے۔

اتوار ۲۲۔ فروری ۲۰۰۹ء

پہلی عُمر کی آفت

مجھ تک اس لوک داستان کی دو روَایتیں (narrations) پہنچی ہیں۔ایک پیڑی والا کے شیر محمد کی اور دوسری کوٹ بوڑا کے پیر علی کی۔میں نے یہاں اوّل الذکر کو درج کیا ہے۔اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ کوئی قدیم کلاسیکی داستان ہے، جو پنجاب کے دیہاتوں میں کافی مشہور رہی ہے۔

پُرانے وقتوں کی بات ہے، کوئی نیک دل کسان اپنے کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا۔ اچانک ایک نقاب پوش ظاہر ہوا اور بولا: ''اے کسان! خُدا کی طرف سے تجھ پر آفت آنے والی ہے۔ میں فرشتہ ہُوں۔ مجھے خُدا نے تجھ سے یہ پُوچھنے کے لیے بھیجا ہے کہ وہ آفت تیری پہلی عُمر (جوانی) میں نازل ہو یا پچھلی عُمر (بڑھاپے) میں آئے؟'' کسان سوچ میں پڑ گیا۔ کُچھ دیر بعد بولا: ''میں گھر جا کر، بیوی سے پوچھ کے، مشورہ کر کے تمھیں بتاؤں گا۔'' کسان گھر پہنچا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ کسان کو پُوچھنا یاد نہ رہا۔ اگلے روز کھیتوں میں فرشتہ پھر ظاہر ہوا۔ کسان سے وہی سوال کیا۔ کسان بولا: ''کل ضرور بتاؤں گا۔'' گھر آ کے اس نے بیوی سے مشورہ کیا۔ کُچھ سوچ کر بیوی کہنے لگی: ''پچھلی عمر میں تو ہم دونوں نے بوڑھے ہونا ہے۔ اس وقت تو ہم میں مصیبت برداشت کرنے کی سکت ہی نہیں ہوگی۔ اب ہم دونوں جوان ہیں۔ طاقت ور ہیں۔ دُکھ سہہ سکتے ہیں۔ اس لیے تم کل فرشتے سے کہنا کہ اسی عمر میں ہم پر آفت نازل ہو جائے۔''

اگلے روز کسان نے یہی بات فرشتے سے کہی۔ فرشتہ پلک جھپکنے میں غائب ہو گیا۔ چند دنوں کے اندر اندر کسان کا مال ڈنگر (مویشی) مر گیا۔ بھڑولوں (غلہ دان) میں رکھے دانے سواہ (راکھ، خاکستر) ہو گئے۔ کسان کی ایک دھی (بیٹی) اور ایک پُتر (بیٹا) تھا۔ ماں باپ اپنے بیٹے کو لے کر کہیں دُور چلے گئے۔ پیچھے اکیلے گھر میں صرف بیٹی رہ گئی۔ سوچا: ہماری تقدیر میں تو دَر دَر کی ٹھوکریں کھانا لکھا ہے۔ جوان لڑکی کو کہاں لیے لیے پھریں۔ والدین بیٹی کے پاس ایک ملازم کو چھوڑ گئے۔ ملازم بہت قابلِ اعتماد اور بھروسے والا شخص تھا۔ خیال تھا کہ وہ ان کی عدم موجودگی میں لڑکی کی حفاظت بھی کرے گا اور اُس کے کھانے پینے کا بھی خیال رکھے گا۔ اِدھر لڑکی کا شباب تھا، اُدھر نوکر بھی جوان تھا۔ یہ تو بلّی سے چھیچھڑوں کی رکھوالی والا معاملہ تھا۔

ایک روز لڑکی چارپائی کھڑی کر کے، اوٹ میں نہانے کے لیے بیٹھی۔ اس زمانے میں عورتیں لسّی سے بھی غسل کیا کرتی تھیں۔ اس نے نوکر کو آواز دے کر کہا: ''وے! کھتّاتے

پھرائیں'' (ارے لسّی تو پکڑانا) نوکر نے لسّی کا مٹکا بڑھایا۔لڑکی نے چارپائی کے پیچھے سے بانہہ بڑھائی۔ جونہی نوکر کی نظر دودھ جیسی گوری چٹی بانھ پہ پڑی، اس کا دل بے ایمان ہو گیا۔ آنگن میں نیم کا درخت لگا ہوا تھا۔ جب رات ہُوئی، نوکر درخت پہ چڑھ کے بیٹھ گیا۔لڑکی نے رات کے اندھیرے میں کسی کو پیڑ پہ چڑھے دیکھا تو پکاری: ''تو کون ہے؟ جن ہے یا پری ہے؟'' نوکر نہوں میں سے بولا: ''نہ میں جن ہُوں، نہ پری ہُوں۔ میں تو خاک کا پُتلا ہُوں۔ تیرا قدیمی نوکر ہوں، اور اب تیرا عاشق ہُوں۔ تیرے وَصل کا طلب گار ہُوں۔'' یہ سُن کر لڑکی بولی: ''بھات کھانی داتوں، تے بھات کھانی دی تیری ماں (اُردو ترجمہ: بھات کھانے والا تُو اور بھات کھانے والی تیری ماں-ایک گالی)۔میرے ہاتھ میں ننگی تلوار ہے۔ میں تجھے کاٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی۔ او دو ٹکے کے نوکر! یہاں سے بھاگ جا۔ دفع ہو جا۔'' یہ سُن کر نوکر کو آگ لگ گئی۔ نیم سے چُپ چاپ اُترا اور بولا: ''یاد رکھنا میں تجھ سے اس بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔'' دھمکی سُن کر لڑکی بے پروائی سے کہنے لگی: ''جا، جا، بڑا آیا بدلہ لینے والا۔'' نوکر سیدھا، دُور کسی دوسرے گاؤں لڑکی کے باپ کے پاس پہنچا۔ بھائی بھی قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔نوکر نے بہتان باندھا: ''آپ کی بیٹی رکھنے کے قابل نہیں رہی۔ اُس کے ایک شخص سے ناجائز تعلقات ہیں۔'' غرض ظالم نے خُوب لگائی بجھائی کی۔ جھوٹھو جھوٹھ پتال [5]۔

بھائی نے سُنا تو تن بدن میں آگ لگی۔ طیش میں آیا۔ اُٹھ کھڑا ہوا۔ باپ نے بہتیرا روکا لیکن وہ نہ رکا۔ اچک کر گھوڑے پر سوار ہوا اور ایڑ لگائی۔ سیدھا بہن کے پاس پہنچا۔ بہن نے دیکھا تو پھولا نہ سمائی۔ بھائی پر واری صدقے گئی۔ مگر جی ہی جی میں حیران تھی کہ بھائی سیدھے مُنہ بات نہیں کر رہا۔ وہ جس طرف ہوتی ہے، بھائی گھوڑے کا مُنہ دوسری طرف موڑ لیتا ہے۔ آخر بھائی نے کہا: ''جو چیز اُٹھانی ہے، اُٹھا لو۔ جو شے لینی ہے، لے لو۔ ابھی اسی وقت میرے ساتھ چلو۔'' یہ سُن کر بہن اور حیران ہُوئی، بولی: ''بھائی کہاں جانا ہے؟'' مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مُنہ پھیر کر کھڑا رہا۔ بہن نے جلدی جلدی گہنا لتّا گٹھڑی میں باندھا اور بھائی کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ رستے میں ایک گھنا جنگل آیا۔ جب وہ جنگل کے بیچوں بیچ پہنچے تو بھائی نے بہانے سے اپنی مُندری انگلی سے نکال کر نیچے گھاس پر گرا دی۔ گھوڑا روک لیا اور بہن سے بولا: ''میری مُندری گر گئی ہے۔ ذرا گھوڑے سے نیچے اُتر کے، اُٹھانا۔'' بھائی کے کہنے پر جونہی بہن انگوٹھی اُٹھانے کے

---

[5] جھوٹ موٹ میں کسی کو پاتال میں پہنچا دینا۔ یعنی سر سے پاؤں تک جھوٹ۔ جھوٹ کی پوٹ

لیے نیچے اُتری، اس نے فوراً ایڑ لگائی۔ گھوڑا دیکھتے ہی دیکھتے سوار سمیت ہوا ہو گیا۔ بہن کھڑی رہ گئی۔ پہلے تو اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ اس کا ماں جایا اُسے اس جنگل بیاباں میں وحشی درندوں کا نوالہ ہونے کے لیے کیوں چھوڑ گیا؟ جب غور کیا تو یکایک نوکر کی دھمکی یاد آئی۔ فوراً سمجھ گئی کہ سب کیا دھرا اسی کم بخت پاجی کا ہے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس مقام سے ایک سُنار کے لڑکے کا گزر ہوا۔ لڑکی نے اسے دیکھا تو جان میں جان آئی۔ اس تنہا ویرانے میں ایک بے یارومددگار لڑکی کے لیے اپنے جیسے انسان کو پانا کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ وہ خوشی خوشی اس کی طرف بڑھی۔ دل میں سوچا: ایک بھائی گیا۔ خدا نے دوسرا بھائی بھیج دیا۔ مگر ہائیں، یہ کیا؟ جونہی اس نے سنار کے لڑکے کو ''بھرا'' (بھائی) کہہ کے مخاطب کیا، وہ ترشی سے بولا: ''بھات کھانی دی تُوں، تے بھات کھانی دا تیرا بھرا۔ فوراً کپڑے، زیور، اُتار کر میرے حوالے کر دے۔'' اتنا کہا اور ظالم خنجر لے کر مرنے مارنے پر اُتارو ہو گیا۔ لڑکی نے ہاتھ جوڑے، خدا رسول کا واسطہ دے کر کہا کہ میرا ننگ نہ دیکھو۔ تجھے زیور، کپڑے سے مطلب ہے۔ میں ابھی جھاڑیوں کے عقب میں جاتی ہُوں اور اُتار کر تیری طرف پھینکتی ہُوں۔ غرض ایسا ہی ہُوا، سُنار کا لڑکا گہنا پاتا، کپڑا لتا لے کر چلتا بنا۔

اس ملک کا راجا اپنے امیروں، وزیروں کے ساتھ شکار کھیلنے کے لیے جنگل میں آیا ہوا تھا۔ حُسنِ اتفاق سے ایک زخمی ہرن کا تعاقب کرتے کرتے وہ اُدھر سے گزرا۔ اچانک شکاری کتے اور باز جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کے گرد گل بُل گُل بُل (گلبُلانا، تڑپنا، بے قرار ہونا) کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر سب نے گھوڑے روک لیے۔ راجا گھوڑے سے اُترا اور جھنڈ کے قریب جا کر بولا: ''تو کون ہے؟ جن ہے؟ یا پری ہے؟ جھاڑیوں میں سے آواز آئی: ''نہ میں جن ہُوں، نہ پری۔ میں تو ایک عورت ہُوں۔'' یہ سُن کر راجا بولا: ''اگر ایسا ہے تو فوراً باہر نکل آ۔'' جب لڑکی نے اپنے برہنہ ہونے کے متعلق بتایا تو راجے نے اپنا صافہ اور قمیص اس کی جانب پھینکی۔ لڑکی نے قمیص پہن لی اور صافہ تیڑ باندھ لیا (صافے سے ستر چُھپا لیا)۔ جب وہ مردانہ لباس میں باہر نکلی تو راجا اس کا زنانہ حُسن دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں اتنی خُوب صُورت عورت نہیں دیکھی تھی۔ لڑکی نے راجے کو اپنی آپ بیتی سُنائی۔ راجے نے اسے اپنے پیچھے گھوڑے پر بٹھا لیا اور شاہی محل میں لے آیا۔ چند دن بعد راجے نے بیاہ کی درخواست کی۔ لڑکی نے بخوشی قبول کر لی۔ پھر کیا تھا، پُوری راج دھانی میں چراغاں کیا گیا۔ محل کو جھنڈیوں سے سجایا گیا۔ ہر طرف خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ راجے کی شادی کسان کی لڑکی سے نہایت دھوم دھام سے انجام پائی۔

دو برس بیت گئے۔ اس دوران میں رانی کے بطن سے راجے کے دو فرزند پیدا ہوئے۔
دن یونہی ہنستے کھیلتے گزر رہے تھے کہ ایک شام بیٹھے بیٹھے رانی کو اپنے ماں باپ یاد آ گئے۔ بے اختیار آنکھ بھر آئی۔ دل ملنے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ رات کو راجا راج پاٹ کے کاموں سے فارغ ہو کر محل میں آیا تو رانی کو اشکوں کے ہار پروتے ہُوئے پایا۔ یہ دیکھ کر راجے کے دل پر گھونسا پڑا۔ وجہ پوچھی۔ رانی دل کی بات زباں پہ لے آئی۔ رات جیسے تیسے گزری۔ صبح سویرے راجے نے پہلا حکم اپنے وزیر کے نام یہ جاری کیا کہ وہ رانی کے ہم راہ اُس کے والدین کی تلاش میں روانہ ہو جائے۔ چوں کہ دونوں راج کمار کم سن تھے، اس لیے فیصلہ ہوا کہ وہ ماں کے ساتھ رہیں گے۔ نوکروں کے علاوہ شاہی فوج کا ایک دستہ بھی ساتھ ہو لیا۔

دن بھر کے سفر کے بعد جب یہ قافلہ ایک گھنے جنگل میں پہنچا تو رات پڑ چکی تھی۔ آسمان پر ستاروں کی رقاصائیں جھلملاتی ہُوئی، ٹمٹماتی ہُوئی عالمِ رقص میں تھیں۔ پورن ماشی کا چاند، رات کا راجا، اپنے تخت پر بیٹھا اس محفلِ رقص سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وزیر نے خیمے لگانے کا حکم دیا۔ خیمے لگ گئے۔ سب اپنے اپنے خیموں میں خوابِ خرگوش کے مزے لوٗٹنے لگے۔ جب آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر ہُوئی، وزیر چپکے سے نکلا اور رانی کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ آہٹ سے رانی کی آنکھ کھل گئی۔ وزیر رانی کی طرف آیا اور اس سے اُس کے وصل کا خواست گار ہوا۔ ظالم جانے کب سے رانی پر آنکھ رکھے ہُوئے تھا اور آج موقع مل گیا تھا۔ رانی سوئے ہُوئے راج کماروں کی طرف اشارہ کر کے بولی: ''میرا چھوٹا بیٹا بھی سانپ ہے اور بڑا بیٹا بھی سانپ۔ اے بدنیت وزیر! یہ تجھے ڈس لیں گے۔'' یہ سُن کر اس جلاّد نے تلوار کے دو وار کیے اور دونوں راج کماروں کے سر دھڑ سے جدا کر دیے۔ پھر غصّے سے پھنکارتا ہوا خیمے سے باہر نکل گیا۔ رانی نے دونوں بچوں کی سر بریدہ لاشیں زمین میں دفن کیں۔ کٹے ہُوئے سروں کو سفید سوتی کپڑے میں لپیٹا اور رات کے اندھیارے میں وہاں سے کوچ کیا۔ اُدھر واپس جا کر حرامی وزیر نے جھوٹ کا پُل باندھا۔ بات بنائی اور راجے سے کہا کہ ماں باپ کو ڈھونڈنا تو محض ایک مکر تھا۔ آپ کی رانی تو بازار کی مٹھائی تھی۔ نہ خاندان کا پتا تھا، نہ حسب نسب کا۔ کسی جنگل میں پڑی ملی تھی، جنگل ہی میں بچوں سمیت کسی بھڑوے کے ساتھ بھاگ نکلی۔ راجہ دل پکڑ کر بیٹھ گیا۔

دوسری طرف رانی نے جوگی کا بانا بدلا اور ''اوم مہادیو'' کے نعرے مارتی ہُوئی شہر شہر، قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں اپنے والدین کو تلاش کرنے لگی۔ ایک روز کرنا خدا کا کیا ہوا، رانی کا گزر

اپنے بھائی کے ڈیرے کے قریب سے ہوا۔ رانی نے دیکھا تو کان کے کچے بھائی کے علاوہ رانی پر بہتان باندھنے والا حرام خور نوکر اور اسے لوٹنے والا سُنار کا لڑکا بھی وہیں بیٹھے ہُوئے ملے۔ رانی ڈیرے کے باہر دھونی رما کر بیٹھ گئی اور آلتی پالتی مار کر گیان دھیان میں مصروف ہو گئی۔

اتنے میں آسمان پر کالے بادل گھر آئے۔ کوندا لپکا اور دیکھتے ہی دیکھتے مینہ چھاجوں برسنے لگا۔ ڈیرے میں موجود کچھ لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگا: ''ارے بابا! باہر ایک سادھو دھونی رمائے بیٹھا ہے۔ مینہ میں بھیگ رہا ہوگا۔ ذرا جاؤ، اسے بھی یہیں لے آؤ۔'' یہ سُن کر دو تین آدمی اُٹھے، باہر گئے اور بصد ادب و احترام مہاتما جوگی کو اندر لے آئے۔ کچھ دیر تو خاموشی رہی۔ آخر ایک شخص نے سکوت توڑا اور کہا: ''اے گنی گیانی! اے وِدیا کے ساگر! آپ ہمارے بیچ پدھارے ہیں تو کوئی بات کیجیے۔ آپ نے سنسار دیکھا ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ کوئی آپ بیتی، جگ بیتی سُنائیے تاکہ سمے اچھا گزرے۔'' رانی یعنی کسان کی بیٹی جو اس گھڑی جوگی کے بھیس میں تھی، مردانہ آواز میں بولی: ''بالکو! سنانے کو تو سُنا دوں، مگر میری بات کے دوران میں دو قتل ہو جائیں گے۔'' یہ سُن کر حاضرین کا تجسّس بڑھ گیا۔ سب یک زبان ہو کر بولے: ''پربھو! اگر یہ بات ہے تو ہم ترنت سنیں گے۔'' رانی پھر مردانہ لب و لہجے میں بولی: ''بندھوؤ! میری ایک شرط ہے کہ اگر حاجت ہے تو ابھی رفع کر لو۔ کہانی کے بیچ میں کوئی پُرش اُٹھ کے نہیں جائے گا۔'' یہ سُن کر چند لوگ رفع حاجت کے لیے چلے گئے۔ جب واپس آئے تو سادھو یعنی کسان کی بیٹی نے اپنی بیتی سنانی شروع کر دی۔ جب کہانی کا وہ حصّہ آیا جہاں نوکر کسان کی بیٹی کے وصل کا طالب ہوتا ہے، انکار پر اس سے بدلہ لینے کی دھمکی دیتا ہے اور بھائی کے کان بھرتا ہے تو نمک حرام نوکر کا ماتھا ٹھنکا۔ جب وہ بہانے سے اُٹھ کے جانے لگا تو سب نے اس کا رستہ روک لیا۔ چوں کہ کسان کے بیٹے یعنی رانی کے بھائی پر حقیقت کھل چکی تھی؛ وہ اُٹھا، تلوار میان سے نکالی اور نوکر کا سر تن سے جُدا کر دیا۔ سادھو یعنی کسان کی بیٹی نے اپنی سرگزشت سنانی جاری رکھی۔ جب کہانی اس موڑ پر آئی جہاں بھائی بہن کو بیچ جنگل تنہا چھوڑ جاتا ہے اور سنار کا لڑکا بے یار و مددگار، اکیلی لڑکی کی مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر اسے لوٹ کر رفو چکر ہو جاتا ہے، تو سنار کے لڑکے کا بھی ماتھا ٹھنکا۔ جب وہ بھی حیلے بہانے اُٹھ کے جانے لگا تو لوگوں نے اس کا بھی رستہ روک لیا۔ کسان کے بیٹے نے تلوار لہرائی اور آن کی آن میں اس کا بھی دھڑ کہیں پڑا تھا اور سر کہیں۔ اب کہانی اور آگے بڑھی۔ راجے سے شادی، وزیر کے بدنیت ہونے اور دونوں راج کماروں کے قتل کا تذکرہ ہوا۔ جب سادھو بن

کر ڈیرے پر کہانی سُنانے کا ذکر آیا تو رانی نے پردہ اُٹھادیا۔ اپنی حقیقت ظاہر کر دی۔ کسان کا بیٹا اپنی بہن کو گلے لگا کے خُوب رویا۔ اس سے اپنے کیے کی معافی مانگی۔ رانی کی اپنے ماں باپ سے بھی ملاقات ہُوئی۔ بیٹی کو دیکھنے کے لیے جانے کب سے اُن کی آنکھیں ترس رہی تھیں۔ جب رانی نے رو کر اپنے دونوں بیٹوں کے کٹے ہُوئے سر دکھائے تو سب کلیجا تھام کر رہ گئے۔ ماں نے بین کیے۔ باپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ بھائی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کے خود کو کوسنے لگا۔

چند دن بعد وہ لوگ بیٹی کو لے کر راجے کے دربار میں پہنچے۔ وزیر نے راجے کے آگے رانی کے متعلق کیا کیا جُھوٹ سچ لگایا تھا، اول فول بکا تھا۔ اس نے دل پر صبر کی سل رکھ لی تھی۔ اب جو سامنے رانی کو دیکھا تو پُرانی صحبتیں یاد آئیں۔ آنکھ بھر آئی۔ مُنھ پھیر لیا۔ جب رانی نے راجے کی یہ بے رُخی دیکھی تو دل پکڑ لیا۔ آخر ماں باپ اور بھائی کے ڈھارس بندھانے پر اُٹھی۔ دل کڑا کیا اور بھرے دربار میں الف سے ی تک اپنی کہانی کہہ سنائی۔ جب راج کماروں کے کٹے ہُوئے سر دکھائے تو اہلِ دربار وزیر پر تھُو تھُو کرنے لگے۔ راجے کی آنکھوں سے پردہ اُٹھ گیا۔ اپنے بیٹوں کے کٹے ہُوئے سر دیکھ کر اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے غُصّے سے کانپتی ہُوئی آواز میں حکم دیا کہ فوراً وزیر کی کھال کھینچ لو۔ اُس کے بال بچّوں کو ہاتھی کے پاؤں تلے کچل ڈالو۔ اس موقع پر نیک دل رانی نے مداخلت کی اور نہایت پیار سے راجے کو سمجھایا کہ کسی کا کیا اوروں کے آگے کیوں آئے؟ جو بوئے، وہی کاٹے۔ چناں چہ رانی کی سفارش نے وزیر کی بیوی اور بچوں کو بچا لیا۔ وزیر کو اذیتیں دے دے کر موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔ واقعی "جو آگ کھائے گا انگار نے ہگے گا۔" راجا اور رانی نے نئے سرے سے زندگی کی شروعات کی۔ ایک سال بعد خُدا نے اُنھیں چاند سا بیٹا عطا کیا۔ ولی عہد سلطنت کی پیدائش پر پورے ملک میں جشن منایا گیا۔ یوں کسان کی بیٹی یعنی رانی کے باپ کو پہلی عُمر میں ملنے والی آفت اپنے انجام کو پہنچی۔

جمعرات ۳ر دسمبر ۲۰۰۸ء

❖❖❖

چم دا چموٹا[1]

میری سب سے بڑی بہن ''نسرین اختر'' جنھیں ہم پیار سے ''آپا چھندو'' کہہ کے پکارتے ہیں، بتاتی ہیں: ''تم ایک برس کے تھے۔ میں تمھیں گود میں لے کے چھت پہ بیٹھ جایا کرتی۔ جیٹھ ہاڑ کے دن۔ کوٹھے پہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آیا کرتے۔ میری تایا زاد بہن ''میداں بی بی'' (اصل نام حمیداں تھا۔ عین جوانی میں نہایت تکلیف دہ حالات میں فوت ہوئیں) بھی وہیں میرے پاس آ کے بیٹھ جاتی۔ وہ مجھے پیاری پیاری کہانیاں سنایا کرتی۔ ہنستے کھیلتے دوپہر ڈھل جاتی۔ وقت اچھا گزر جاتا۔ اس نے مجھے جو کہانیاں سنائیں، ان میں سے ایک کا نام ''چم دا چموٹا'' تھا۔''

گویا یہ وہ کہانی ہے جو میں نے ۷۳-۱۹۷۲ء میں اپنی بہن کی گود میں سنی تھی۔ یہ کہانی میرے لاشعور میں موجود رہی۔ شاید اسی لیے جب برسوں بعد ۱۴۔ مارچ ۲۰۰۹ء بروز ہفتہ میں نے اسے اپنے ایک شاگرد کیزبانی دوبارہ سنا تو ایسے لگا، جیسے اپنی کوئی کھوئی ہوئی، بہت قیمتی چیز واپس مل گئی ہو۔

اس کہانی کو پڑھ کے فوراً احساس ہوتا ہے کہ یہ پنجاب کی کوئی بہت قدیم، کلاسیکی لوک داستان ہے۔ جادو کے جوتے یا کھڑاویں، جنھیں پہن کر آدمی ہوا میں اُڑ سکتا ہے، دُنیا کے کئی ملکوں کی کہانیوں میں ملتے ہیں؛ اس کہانی میں بھی اُن کا تذکرہ ہوا ہے۔ ''چم دا چموٹا'' پڑھ کر فرانسیسی مصنف ''چارلس پرو (Charles Perrault) کی کہانی ''Donkey-Skin'' یاد آ جاتی ہے۔

پُرانے وقتوں کی بات ہے، پنجاب پر ایک راجا حکومت کرتا تھا۔ عرصہ ہوا رانی مر چکی تھی۔ راجے کی ایک ہی بیٹی تھی۔ بہت سُندر اور من موہنی۔ سچ مچ ''صُورت وچ لال لگے سن۔''[2] ایک دن امیروں وزیروں نے کہہ سُن کر راجے کو دوسری شادی کے لیے آمادہ کر لیا۔ نئی رانی محل میں آ گئی۔ شروع شروع کے دن تو اچھے گزرے لیکن جونہی رانی کی اپنی اولاد پیدا ہوئی، بات بات میں اس کا سوتیلا پن ظاہر ہونے لگا۔ اپنے بچوں کو تو چپڑی دیتی اور اس بے چاری کو روکھی سوکھی۔ راجا بھی اندھا نہیں تھا۔ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہیں لڑکی بھوک اور سوتیلی ماں کے ظلم سے مر ہی نہ جائے۔ بہتر ہے کوئی اچھا سا بر دیکھ کے اُس کے ہاتھ پیلے کر دوں۔ لڑکی اپنے گھر کی ہو جائے گی تو سب دَلِدّر دُور ہو جائیں گے۔ پرایا گھر پرایا ہی ہوتا ہے، چاہے ماں باپ ہی کا کیوں نہ ہو۔ لڑکی راج اپنے گھر ہی میں جا کے کرتی ہے۔ راجے نے بیٹی کا رشتہ ایک دوسری

---

[1] ''چم'' پنجابی میں ''چام یا چمڑے'' کو کہتے ہیں۔ ''دا'' حرف ہے، پنجابی میں ''کا'' کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ''چموٹا'' کا معنی ہے: ''چمڑے کا ٹکڑا'' گویا ''چم دا چموٹا'' کا مطلب بھی یہی ہوگا یعنی 'چمڑے کا ٹکڑا' لیکن اس کہانی میں اس سے مراد 'چمڑے کا لباس'' بھی ہے اور وہ شخص بھی جس نے یہ لباس پہن رکھا ہے۔

[2] اُردو ترجمہ: صورت میں لال لگے ہوئے تھے۔ یعنی نہایت حسین ہونا۔

ریاست کے شاہی خاندان میں طے کر دیا۔ اتفاق دیکھیے : اِدھر لڑکی بن ماں کے تھی تو اُدھر لڑکا بن باپ کے۔ عرصہ ہوا اس کا باپ فوت ہو چکا تھا اور اب صرف ماں زندہ تھی۔ لڑکا خود راجا تھا اور بلا شرکتِ غیرے، اکیلا ساری ریاست کا انتظام چلاتا تھا۔ سوتیلی ماں کو جب اس معاملے کی بھنک پڑی تو بہت سٹپٹائی۔ وہ اتنا اچھا رشتہ ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی تمنا تھی کہ اس کی اپنی بیٹی وہاں بیاہی جائے۔ ہاں سوتیلی کی شادی کسی ایرے غیرے نتھو خیرے سے ہو جائے تو اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن راجے کا رشتہ وہ بھی سوتیلی کے لیے، یہ بات ایسی نہیں تھی کہ آسانی سے ہضم ہو جاتی۔ اُدھر راجے نے راج کماری کی شادی کی تاریخ دے دی۔ رانی جانتی تھی کہ راجے کے آگے میری پیش نہیں جائے گی۔ سو اس نے دل ہی دل میں منصوبہ بنایا کہ چاہے کچھ بھی ہو، یہ رشتہ کسی قیمت پر بھی کامیاب ہونے نہیں دینا۔

آخر مقررہ دن بارات آئی۔ راجے کی بارات تھی۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ شادی کا جلوس کیسا عظیم الشان ہو گا۔ باجے گاجے کی کیا کیفیت ہو گی۔ سب رسم و رواج ہُوئے۔ جب لڑکی وداع کرنے کا موقع آیا، مکار رانی نے ایک خطرناک چال چلی۔ اس نے پہلے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو سرسوں کے تیل میں ڈبویا۔ پھر توا الٹا کیا، اس پر ہاتھ پھیرے۔ توے کی ساری کالک ہتھیلیوں پہ لگ گئی۔ اب وہ اپنی سوتیلی بیٹی سے ملنے کے لیے گئی۔ رخصتی سے قبل پیار دینے کے بہانے اس نے دلھن کے سر اور چہرے پر ہاتھ پھیرے اور اچھی طرح توے کی کالک مل دی۔ یوں سمجھیے جیسے سات توؤں سے منہ کالا کر دیا۔ اس نے مکاری سے مُسکراتے ہُوئے دل میں سوچا کہ اور کچھ نہ سہی، سسرال والے ساری عُمر اسے طعنہ تو دیں گے کہ جب شادی کے دن تو پہلی بار سوہرے (سسرال) آئی تھی تو مُنھ کالا کروا کے آئی تھی۔

دُلھن نے گھونگٹ نکالا اور ڈولے میں بیٹھ گئی۔ اس دوران میں اسے کسی نے نہ دیکھا۔ جنج (بارات) واپس روانہ ہُوئی۔ راجا شاہی رتھ پر سوار تھا۔ جب جنگل میں پہنچے، تو انھیں رات ہو گئی۔ راجے کے حکم پر رتھ بان نے رتھ روک لیا۔ ساری برات بھی ٹھہر گئی۔ فیصلہ ہوا کہ رات یہیں گزار دی جائے۔ راجپوت سپاہی پہرہ دینے لگے۔ ایک چاق و چوبند محافظ دستہ رتھ اور ڈولے کے گرد کھڑا ہو گیا۔ دن بھر کے سفر کے بعد تھکے ہارے باراتی خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے لگے۔ جب پو پھٹی، جنگل کے بوہڑ (بڑ)، شرینہہ (سرس) ٹاہلی (شیشم) بیری لسوڑا، پھلاہی، وَن اور کیکر کے پیڑ پرندوں کی چہکار سے گونجنے لگے۔ لوگ بیدار ہُوئے۔ از سرِ نو سفر کی تیاریوں میں

مصروف ہو گئے۔ اتفاق سے ایک ماچھن نے ڈولے کا پردہ اُٹھایا۔ دلھن کو دیکھا تو ہکا بکا رہ گئی۔ ایسی حیرت طاری ہُوئی کہ چُپ لگ گئی۔ بڑی گُم صُم، دیدے پھاڑے دیکھتی رہی۔ آخر ہوش آیا تو یک بیک چیخ پڑی شور مچانے لگی: "ارے لوگو! دیکھو، دیکھو۔ ہمارے ساتھ کیسا ہاتھ ہو گیا (فریب ہو گیا) لڑکی کوئی اور دکھائی اور پلّے باندھ دی کوئی اور۔ ہے ہے! کیسا اندھیر ہے۔ ہماری دُلھن تو گوری چٹی تھی۔ یہ کون کالی کلوٹی ڈولے میں بیٹھی ہے۔" براتیوں نے سُنا تو پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی۔ راجا بھی امیروں وزیروں کے ساتھ بھاگم بھاگ پہنچا۔ جونہی دُلھن کا گھونگٹ اُٹھایا، ہاتھ کے توتے اڑ گئے۔ چاند سے چہرے والی کے بجائے الٹا توا نگاہوں کے سامنے تھا۔ گوری چٹی دُلھن کی جگہ کالی بلا ڈولے میں بیٹھی تھی۔ راجے کے سب خواب چکنا چور ہو گئے۔ زندگی کے ہم سفر کی جو تصویر اس نے سالہا سال سے اپنے ذہن میں بنا رکھی تھی، ڈولے میں رکھی تصویر تو اُس کے بالکل برعکس تھی۔ راجے کو شدید دھچکا لگا، گہرا صدمہ پہنچا۔ مُنہ سے تو کُچھ نہ بولا، ہاں لڑکی کا بازو پکڑا اور ڈولے سے باہر نکال دیا۔ ساتھ ہی برات کی روانگی کا حکم دے دیا۔ برات روانہ ہُوئی، کہار خالی ڈولا اُٹھا کے چلے۔ سب کے چہرے اُترے ہُوئے تھے اور دل درد سے معمور۔ راج کماری ایک شرینھ کے درخت تلے کھڑی، حسرت کی تصویر بنی یہ سب منظر دیکھ رہی تھی۔ بھلا کسی نئی نویلی دُلھن کے ساتھ ایسا بھی ہوتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اُس کے ساتھ کیا ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ ہولے ہولے بارات نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ گھوڑوں کے پیچھے اُڑتی دھول بھی بیٹھ گئی۔

راجپوت شہزادی اس اجاڑ، خوف ناک بن میں، دُلھن کا سرخ لباس پہنے تنہا کھڑی تھی۔ نہ کوئی مونس، نہ غم خوار، بے یار و مددگار۔ راج کماری کو پیاس لگی۔ پاس ہی ایک نہر بہہ رہی تھی۔ وہاں پہنچی۔ کنارے پہ بیٹھی۔ جب جھک کے، دونوں ہاتھوں سے اُوک بنا کے پانی پینے لگی تو پانی میں اپنا عکس نظر آیا۔ ہیں! یہ کیا۔ اتنا کالا بھجنگ چہرہ وہ بھونچکا رہ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے سات توؤں کی سیاہی منہ کو لگ گئی۔ بے ارادہ اس کے ہاتھ پانی میں گئے اور اس نے مُنہ پہ چھینٹے مارنے شروع کر دیے۔ ذرا سی دیر میں چودھویں کا چاند کالے بادلوں کی اوٹ سے باہر آیا؛ سورج گرہن سے نکل آیا۔ اس کا حسین، گورا نکھرا روپ سے جھلملاتے ہُوئے پانی میں آگ کے شعلے کی طرح دہکنے لگا۔ اب اس نے جانا کہ ماچھن نے کیوں دوہائی دی۔ براتی اسے کیوں چھوڑ گئے۔ پہلے تو اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ اُس کے چہرے پہ کالک لگی تو لگی کیسے؟ آخر کافی دیر غور کرنے کے بعد بات سمجھ میں آ گئی۔ سوتیلی ماں کی قلعی بھی کھل گئی۔ وقتِ رُخصت اس کا پیار کرنا اور بلائیں لینا پس پردہ کن

مقاصد کا حامل تھا، اب روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا۔ وہ سوچنے لگی: ''اب واپس پِتا کے گھر جاؤں تو کیوں جاؤں۔ سوتیلی ماں نے جس مقصد کے لیے یہ ساری سازش کی، وہ پورا کیوں ہونے دوں۔ میری فتح اسی میں ہے کہ سوتیلی ماں ناکام ہو۔ میرے چہرے پر جو کالک لگی ہے، وہ پانی سے نہیں دھل سکتی۔ وہ صرف اسی صورت دھلے گی کہ میں اسی راجے کی رانی بن کے دکھاؤں، جو مجھے ڈولے سے اُتار کے اس جنگل میں تنہا چھوڑ گیا۔ میں واپس کیوں جاؤں، میرے تو راجے کے سنگ اگنی کے گرد سات پھیرے ہُوئے ہیں۔ اب اُس کا گھر ہی میرا گھر ہے۔ میں نے مڑ کے پیچھے نہیں دیکھنا، اب جانا ہے تو آگے ہی جانا ہے، اپنے سسرال۔''

راج کماری نے جی کڑا کیا اور آگے بڑھی۔ اس گھنے جنگل میں تھوڑا ہی چلی ہو گی کہ کیا دیکھتی ہے: پیپل کے ایک درخت تلے چار ملنگ آپس میں کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ راج کماری ان کی اور بڑھی۔ ایک سادھو کہنے لگا: ''ارے! وہ دیکھو، ایک مَنُش آ گیا۔ ہم اسی سے فیصلہ کرواتے ہیں۔'' یکا یک دوسرا سادھو بولا: ''نہیں نہیں۔ یہ تو کوئی کومل نار ہے۔ ہم ناری سے فیصلہ نہیں کروائیں گے۔'' تیسرا سادھو بولا: ''ناری ہے تو کیا ہوا۔ کیا اُس کے پاس ذہن بھی نہیں ہے۔ ہم نے اس سے فیصلہ ہی تو کروانا ہے۔ کون سی مہا بھارت لڑوانی ہے۔'' چوتھے نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ سادھو راج کماری سے کہنے لگے: ''اے سندری! ہم چاروں ایک ہی گرو کے چیلے ہیں۔ جگ سرائے ہے اور منش مسافر۔ رام کی مایا، کہیں دھوپ، کہیں چھایا۔ ایک روز قبل ہمارا گُرو سُورگ سدھارا ہے۔ ہم ابھی ابھی اُس کے کریا کرم سے فارغ ہُوئے ہیں۔ گُرو نے اپنے پیچھے چار چیزیں چھوڑی ہیں: ایک یہ گدڑی ہے۔ اس کی خوبی ہے کہ جتنے روپے پیسے زبان سے کہو، پلک جھپکنے میں اتنے ہی اس گدڑی میں آ جاتے ہیں۔ دوسری چیز یہ کھڑانواں[1] ہیں۔ ان کی خاصیت یہ ہے کہ پاؤں میں پہن لو اور جہاں کہو، اڑا کے لے جاتی ہیں۔ تیسری چیز یہ دیگچہ ہے۔ اسے مانج کر چولھے پر رکھ دو۔ اُوپر سے ڈھکن دے دو۔ پھر جس شے کو من چاہے، کہو، فوراً پک جائے گی۔ چوتھی چیز سیلی[2] ڈنڈا ہے۔ جب بھی کسی پُرش یا اِستری کی طرف اشارہ کر کے کہو: ''ولے[3] سیلی، چلے ڈنڈا'' (اردو ترجمہ: رسی باندھ، ڈنڈا چلے) بس پھر تماشا دیکھو۔ سیلی دیکھتے ہی دیکھتے خود بخود اس کو باندھ کر بے بس کر دے گی اور ڈنڈا اس کی چمڑی ادھیڑنا شروع کر دے گا۔ ہمارے گُرو نے پرلوک سدھارنے سے پہلے اُپدیش دیا تھا کہ اے سنتو! تم بھی چار ہو اور

---

[1] کھڑانواں: (جمع) کھڑاؤں، ایک قسم کی لکڑی کی جوتی [2] سیلی: (تلفظ: سے لی) (ہندی۔ مونث) بالوں کی بٹی ہوئی رسی۔ ریشم یا تاگوں کی سیاہ ڈوری جو اکثر جوگی گلے میں ڈالتے ہیں۔

[3] وَل: (مذکر) پیچ، چکر۔ ولانواں: (مذکر) پیچ، بل یا بٹ، رسے کا ایک خاص پیچ۔

چیزیں بھی چار۔ اُنھیں آپس میں بانٹ لینا۔ چاروں ایک ایک چیز لے لینا۔ لڑائی جھگڑا مت کرنا۔ لیکن اے ناری! ہم میں تُو تُو ، میں میں ہونے لگی۔ ہر کوئی اپنی اِچھا کے مطابق جو چیز لینا چاہتا، وہ اسے دینا دوسرے کی اِچّھا نہیں۔ اب تم آ گئی ہو، ہم بِنتی کرتے ہیں، بھگوان کے لیے ہمارا فیصلہ کروا دو۔ گُرو کی چھوڑی ہُوئی یہ چاروں چیزیں ہم چاروں میں بانٹ دو۔" راج کماری ایک عقل مند عورت تھی۔ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی، پھر بولی: "سادھوؤ! میں یہاں تمھارے سامنے کمان میں چار تیر چڑھا کے چاروں دِشاؤں میں پھینکتی ہُوں۔ ایک تیر پورب کی طرف، دوسرا پچھم کی اور۔ تیسرا دَکھن کی سمت اور چوتھا اُتّر کی جانب۔ تم میں سے جو سب سے پہلے تیر اُٹھا کے لائے گا، اسے گدڑی ملے گی۔ اس کے بعد آنے والے کو کھڑانواں، اور جو اُس کے بعد آئے گا، اسے دیگچہ ملے گا۔ سب سے آخر میں تیر اُٹھا کے لانے والے کا انعام سیلی اور ڈنڈا ہو گا۔ اَب کس کو کیا ملتا ہے، یہ اپنے اپنے بھاگ ہیں۔" چاروں سادھو خوش ہو گئے۔ بولے: "واہ واہ! بھگوان کی کرپا سے، یہ تو فیصلہ کرنے کا بہت اچّھا انداز ہے۔ اس پر تو کسی کو بھی ناک بھوں چڑھانے کا موقع نہیں ملے گا۔ اے پدمنی! ہمیں تیری یہ بانٹ قبول ہے۔" راج کماری نے ایک ایک کر کے چار تیر چاروں دِشاؤں میں چلائے۔ کمان خُوب زور لگا کر کھینچی تا کہ تیر دُور دُور جا کے گریں۔ اِدھر چاروں سادھو تیر اُٹھانے کے لیے بھاگ پڑے۔ اُدھر راج کماری نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، گدڑی، دیگچہ اور سیلی ڈنڈا تینوں چیزیں اُٹھائیں، پاؤں میں کھڑانویں پہنیں اور اس نگر کا نام پُکارا، جہاں کے راجے سے اس کا بیاہ ہوا تھا۔ بس پھر کیا تھا، کھڑانویں اسے ہوا میں اُڑانے لگیں۔ محل ماڑیاں، بُرج منارے، گاؤں نگر، کھیت بَن اُس کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ کھڑانویں آن کی آن میں اُسے پی کے نگر لے آئیں۔

راج کماری نے شہر سے باہر، کچھ دُور، نہر کنارے، پھلاہی کے درختوں کے ایک جھنڈ میں گڑھا کھودا اور گُرو کی ترکے میں چھوڑی ہُوئی وہ عجیب و غریب، نایاب، جادو بھری چیزیں دبانے لگی۔ گدڑی گڑھے میں دبانے سے پہلے اس نے کچھ روپے مانگے۔ گدڑی نے فوراً حاضر کر دیئے۔ راج کماری نے گدڑی میں ہاتھ ڈال کے نکال لیے۔ اب وہ پُوچھتی پچھاتی موچیوں کی بستی میں پہنچی اور ایک موچی کے گھر پہ جا دستک دی۔ ایک بہت بوڑھے شخص نے دروازہ کھولا۔ راج کماری اس سے کہنے گی: "بابا جی! یہ لیجیے پیسے، جتنے چاہیں رکھ لیں۔ مجھے آپ ایک 'چم داچھوٹا' سی دیں۔" بوڑھے موچی نے حامی بھر لی۔ چند دنوں کی مہلت مانگی۔ راج کماری نے بخوشی دے دی۔ راجا، برات سمیت، ابھی رستے ہی میں تھا۔ کئی کوس دور۔ راج کماری تو اپنی کھڑانوں کے باعث اڑ کے، دنوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کر کے، راجے اور بارات سے بہت پہلے، شہر میں پہنچ

چکی تھی۔ راجے کو پہنچنے میں کئی دن لگے۔ اتنے دنوں میں راج کماری جادو کے دیگچے سے مانگ مانگ کے طرح طرح کے مزے دار کھانے کھاتی رہی۔ چم کا چموٹا تیار ہو چکا تھا۔ راج کماری نے بوڑھے موچی کا شکریہ ادا کیا۔ اُدھر راجا راج دھانی میں پہنچ چکا تھا۔ راج کماری نے زیور گہنا اور دُلھن کا سرخ لباس اُتارا، بوڑھے ماہر موچی کا تیار کردا چمڑے کا لباس پہنا۔ جس روز راجے نے لوٹنے کے بعد، پہلی کچہری لگائی، اسی روز راج کماری پہلی دفعہ چم کا چموٹا پہن کے دربار میں پہنچی۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک چمڑے کے لباس میں ملبوس تھی۔ چم کے چموٹے پر آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے، جہاں سے وہ دیکھ رہی تھی۔ ناک کی جگہ ایک سوراخ تھا، جہاں سے وہ سانس لے رہی تھی۔ باقی پورا بدن چھپا ہوا تھا۔ چناں چہ راجے سمیت کوئی بھی اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔ چم دے چموٹے نے دربار میں جا کر پہلے تو راجے کو سلام کیا اور پھر کہا: ''مائی باپ! مجھے اپنے ہاں نوکر رکھ لیجیے۔ میں آپ کے گھوڑوں کی لد (لِید) صاف کر دیا کروں گا۔'' راجا چم دے چموٹے کو دیکھ کر ہی مُتاثّر ہو چکا تھا۔ اس نے اس عجیب شخص کو فوراً شاہی اصطبل میں ملازم رکھ لیا۔ اب چم دا چموٹا روز اصطبل کی صفائی کیا کرتا اور گھوڑوں کی لِید اُٹھا اُٹھا کے باہر پھینکا کرتا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ رانی یعنی راجے کی ماں نے بیٹے کی دوبارہ شادی کرنے کے بارے میں سوچا۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ پہلی شادی کی ناکامی کا گھاؤ بڑی حد تک بھر چکا تھا۔ راجا بھی راضی تھا۔ اس عرصے میں چم دا چموٹا محل کے معاملات میں خاصا دخیل ہو چکا تھا۔ رانی ماں بھی اسے پسند کرنے لگی تھی۔ ایک روز رانی ماں نے اس سے کہا: ''اے چم دے چموٹے! تو ایشور سے دعا مانگ کہ میرے پتر کے سہرے کے پھول کھلیں۔ اس کا بیاہ کسی پدمنی سے ہو جائے۔ کچھ عرصہ پہلے بھی شادی ہوئی تھی، مگر وہ اپنی نئی نویلی دُلھن کو رستے ہی میں چھوڑ آیا۔ اب خیری سلا ؎ میں پھر اس کا سہرا دیکھوں۔'' چم دا چموٹا بولا: ''واجے وج دے جاون گے، جنج روندی آوے گی۔'' (اُردو ترجمہ: باجے بجتے ہوئے جائیں گے، بارات روتی ہوئی آئے گی)۔ رانی ماں نے پیشانی پر شکن ڈال کر کہا: ''چم دے چموٹے! یہ تو اچھی دعا میرے پُتر کو دے رہا ہے۔'' چم دا چموٹا بولا: ''رانی ماں! میری تو چم کی زبان ہے۔ لفظ میرے مُنھ سے صحیح طرح نہیں نکل رہے؛ ورنہ میں نے تو دُعا ہی دی ہے۔''

یک انار، صد بیمار۔ راجے کے لیے ایک اور ریاست کی راج کماری کا رشتہ آ چکا تھا۔ بیاہ کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ آخر وہ دن آیا، جب راجے نے دُلھن بیاہنے جانا تھا۔ اس مبارک دن صبح

؎ خیری سلا: (۱) بخیر و عافیت۔ (۲) (کلمہ) خدا کرے ایسا نہ ہو۔

سویرے شاہی اصطبل کے ملازموں نے تمام گھوڑے نہلائے اور محل کے سامنے لے آئے تاکہ شان دار گھوڑوں پر برات روانہ ہو سکے۔ چم دے چموٹے نے منہ اندھیرے آ کے طویلے کی صفائی کی۔ لید اُٹھا کے باہر پھینکی۔ پھر وہ چپ چاپ اصطبل سے نکلا۔ چلتا چلتا نہر کنارے پہنچا۔ چارسُو ایک گہری تنہائی تھی۔ پھلاہی کے گھنے جھنڈ پر پنکھ پکھیرو چہچہا رہے تھے۔ چم دے چموٹے نے وہاں جا کر چمڑے کا لباس اُتارا اور نہر میں چھلانگ لگا دی۔ بڑی دیر تک راج کماری نہر کے بہتے ہُوئے، ٹھنڈے ٹھنڈے، تازہ پانی میں تیرتی رہی، غوطے لگاتی رہی اور نہاتی رہی۔ پھر وہ نہر سے باہر نکلی۔ جھنڈ میں چلتی ہُوئی پھلاہی کے اس درخت تک پہنچی جس کے نیچے اس نے اپنے کپڑے، گہنے اور سادھوؤں سے بٹوری ہُوئی چاروں جادو بھری چیزیں زمین میں دفن کر رکھی تھیں۔ راج کماری نے شادی کا سرخ جوڑا نکالا، جسے پہن کر وہ بابُل کے آنگن سے نکلی تھی، ڈولے میں بیٹھی تھی اور پلکوں پر سہانے خواب سجا کے پیا گھر چلی تھی۔ راج کماری کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور ٹپ ٹپ گرتے ہُوئے، لال جوڑے میں جذب ہوتے چلے گئے۔ اس نے بیاہ کا جوڑا زیبِ تن کیا۔ نتھ، ٹیکا، کانٹے، انام تویتڑیاں، انگوٹھیاں، چوڑیاں، کنگن غرض سونے کے سب زیور پہنے۔ اس کے بعد پیروں میں کھڑاؤں پہنی، ہاتھ میں سیلی ڈنڈا لیا اور اس ریاست کی راج دھانی کا نام پکارا اور چلنے کے لیے کہا، جہاں راجے نے برات لے کر پہنچنا تھا۔ بس پھر کیا تھا، پلک جھپکنے میں کھڑاؤں اسے اُڑاتی ہُوئی وہاں لے گئی۔ ابھی دُولہا اپنے گھر سے روانہ نہیں ہوا تھا اور وہ دُلھن کے نگر پہنچ چکی تھی۔ راج کماری اتنی خوب صُورت لگ رہی تھی کہ سارے شہر کے لوگ اسے دیکھنے کے لیے جُوق در جُوق اُمنڈ آئے۔ ہر طرف بھیڑ لگ گئی۔ لوگ کہتے تھے: ''ارے! یہ تو کوئی اپسرا ہے، ارے! یہ تو کوئی حور ہے، جو آسمان سے زمین پر اُتر آئی ہے۔''

راج کماری چلتے چلتے محل تک پہنچ گئی۔ وہ اس قدر حسین لگ رہی تھی، اس کی شخصیت اس قدر مُتاثرکُن تھی کہ دربانوں نے کسی اُونچے خاندان کی خاتون خیال کرتے ہُوئے خود بخود دروازے کھول دیئے۔ اُس کے سواگت کے لیے رانیاں اور داسیاں دوڑیں دوڑی آئیں۔ راج کماری کہنے لگی: ''مجھے وہ لڑکی دکھاؤ، جس سے راجے کی شادی ہونا قرار پائی ہے۔'' یہ سُن کر رانیاں فوراً لڑکی لے آئیں۔ راج کماری نے نہایت غور سے اسے دیکھا۔ چہرے مُہرے، رنگ روپ، غرض بدن کے ایک ایک انگ کا جائزہ لیا۔ پھر یوں کہنے لگی: ''ارے بابا! تمھاری بیٹی تو کُچھ بھی نہیں۔ نہ مُنہ نہ متھا، جن پہاڑوں لتھا[1]۔ خدوخال متناسب نہیں۔ جلد گوری چٹی نہیں۔ راجا اس

سے شادی کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہیں ہوگا۔'' پھر راج کماری نے ان سے سوال کیا: ''اچھا یہ بتاؤ، تمھارے خیال میں، میں کیسی ہوں؟'' سب یک زبان ہو کر بولے: ''بے حد خُوب صُورت، پیاری، دودھ کی طرح سفید۔'' اس پر راج کماری کہنے لگی: ''جس لڑکی سے راجے کا پہلے بیاہ ہوا تھا، وہ تو مجھ سے بھی زیادہ حسین اور گوری چٹی تھی۔ راجے کو وہ بھی پسند نہ آئی۔ اُس کے سنگ پھیرے تو لے لیے، مانگ بھی بھر دی لیکن واپسی پر جنگل بیاباں میں شیر بگھیلوں[2] کا نوالہ بننے کے لیے تنہا چھوڑ گیا۔ برات خالی ڈولی لے کر لوٹی۔ اب تمھی بتاؤ۔ جب مجھ سے زیادہ خُوب صورت اور گوری لڑکی راجے کے معیارِ حُسن پر پورا نہ اُتری تو تمھاری پُتری کس کھیت کی مولی ہے۔ راجا اس کو تو ضرور اپنی پتنی قبول کرے گا۔'' یہ سُن کر شاہی خاندان کی عورتیں پریشان ہو گئیں، بولیں: ''اس کا کوئی حل؟'' راج کماری فوراً کہنے لگی: ''حل ہے ناں، حل تو بہت سوہنا (خُوب صُورت) ہے۔ چلو شکل صورت تو ہم نہیں بدل سکتے۔ وہ تو پرماتما کی دین ہے۔ جیسی مل گئی، اسی میں گزارہ کرنا پڑے گا۔ مگر رنگت تو بدل سکتی ہے۔ اسے تو بہتر کیا جا سکتا ہے۔ ایسے کرو ایک کڑاہے کو تیل سے بھرو۔ اُس کے نیچے آگ جلاؤ۔ جب تیل خُوب گرم ہو جائے، جوش کھانے لگے تو اپنی لڑکی کو اُٹھا کر اس میں پھینک دو۔ یہی واحد حل ہے تمھاری پتری کے جسم پر جمی جنم جنم کی میل اُتارنے کا۔ اس سے لڑکی کی جلد صاف شفاف ہو جائے گی اور وہ دُودھ کی طرح گوری چٹی دکھائی دینے لگے گی۔'' صدیوں سے مشہور ہے: ''زنانی دی مَت گُت پچھے[3]'' اور یہ بھی کہا جاتا ہے۔ ''عورت کی ناک نہ ہوتی تو گو کھاتی۔'' سو شاہی خاندان کی عورتوں نے نہ سوچا، نہ سمجھا، فٹافٹ ایک کڑاہا تیل سے بھرا اور آگ پر رکھ دیا۔ جب تیل خُوب اُبلنے لگا اور اس میں سے بلبلے اُٹھنے لگے تو اُنھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دو تین نے باہیں پکڑیں، دو تین نے ٹانگیں اور اپنی لڑکی کو اُٹھا کے دھم سے کڑاہے میں پھینک دیا۔ بس پھر کیا تھا، دُلھن سڑ کے مر گئی۔ اس کی رنگت گوری تو کیا ہوتی، پہلے سے بھی زیادہ کالی ہو گئی۔ سر سے پاؤں تک بالکل کوئلہ۔ یہ ایسا اُبٹن تھا، جو شادی سے پہلے کسی دُلھن کو نہیں لگا ہوگا۔ جب یہ اُبٹنا کھیلا جا چکا تو رانیوں، داسیوں اور محل کے نوکروں چاکروں نے گھبرا کے، پلٹ کر راج کماری کی طرف دیکھا۔ جلد ہی وہ ساری کارستانی سمجھ گئے اور غُصّے سے بھوت ہو گئے۔ سب مل کے اسے مارنے کے لیے دوڑے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچتے، راج کماری نے پکار کے کہا: ''ولے سیلی، چلے ڈنڈا''۔

---

1. نہ منھ (حسین) نہ پیشانی، (ایسے لگتا ہے جیسے کوئی) جن پہاڑ سے نیچے آ گیا۔
2. بگھیلا: شیر کا بچہ، نوجوان شیر (اگر شیرنی کے دو بچے ہوں تو بڑا شیر اور چھوٹا بگھیلا کہلاتا ہے)
3. عورت کی عقل گدی پیچھے۔

بس اتنا کہنے کی دیر تھی، سیلی نے دیکھتے ہی دیکھتے ان سب کو جکڑ لیا اور کس کے باندھ دیا۔ اس کے بعد ڈنڈے نے ان بے بس حملہ آوروں کی وہ خبر لی کہ توبہ ہی بھلی۔ پیٹ پیٹ کے اُنھیں ادھ مؤا کر دیا۔ جب اچھی خاصی مرمت ہو گئی تو راج کماری نے سیلی کو چھوڑنے اور ڈنڈے کو رکنے کا حکم دیا۔ سیلی ڈنڈا دوبارہ اُچھل کر اُس کے ہاتھ میں آ گئے۔ لوگ زمین پر پڑے ہائے وائے کر رہے تھے۔

راج کماری نے پیروں میں کھڑانویں پہنیں اور اڑتی ہُوئی اسی نہر کے کنارے پھلاہی کے جھنڈ میں پہنچ گئی، جہاں اس کی تمام چیزیں دبی ہُوئی تھیں۔ راج کماری نے فوراً کھڑاؤں، سیلی ڈنڈا، زیور گہنا، کپڑا لتّا اُتارا، اُسے دوبارہ وہیں دفن کیا۔ اپنا چمڑے کا لباس نکالا، پہنا اور پھر سے چم دا چھوٹا بن کے شاہی اصطبل میں آ گئی۔ گھوڑوں کی لِید اُٹھانے کے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اُدھر راجے کی برات روانہ ہو چکی تھی۔ راجے کی ماں وہاں آئی اور کہنے لگی: ''اے چم دے چھوٹے! دعا مانگ کہ میرا بیٹا خیری سلا دُلھن بیاہ کر گھر لے آئے۔'' چم دا چھوٹا بولا: ''واجے وَج دے جاون گے، جنج روندی آوے گی۔'' رانی ماں نے پیشانی پر شکن ڈال کے کہا: ''چم دے چھوٹے! یہ تو اچھی دعا میرے پتر کو دے رہا ہے۔'' چم دا چھوٹا بولا: ''رانی ماں! میری تو چم کی زبان ہے۔ لفظ میرے مُنھ سے صحیح طرح نہیں نکل رہے؛ ورنہ میں نے تو دعا ہی دی ہے۔'' چند دن بعد وہی ہوا۔ باجے بجتے ہُوئے گئے اور برات روتی ہُوئی لوٹی۔ باراتیوں نے بتایا کہ راجے کی دُلھن گرم تیل کے کڑاہے میں گر کے مر گئی۔

ایک رات راجے کو نیند نہ آئی۔ تنہائی کا سانپ ڈستا رہا۔ بستر پہ پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ ابھی پچھلی رات تھی کہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ جی گھبرایا تو ہوا کھانے محل سے باہر نکل آیا۔ صبح صادق کا وقت تھا۔ تارے چُھپ گئے تھے لیکن فجر کا تارا جھلملا رہا تھا۔ اچانک راجے نے کیا دیکھا کہ شاہی اصطبل کا دروازہ کُھلا، اندر سے چم دا چھوٹا نکلا اور ہولے ہولے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ راجے کو تجسس ہوا کہ دیکھوں تو سہی اس مُنھ اندھیرے چم دا چھوٹا کہاں جا رہا ہے؟ راجے نے آنکھ بچا کے اس کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ آگے آگے وہ، پیچھے پیچھے راجا۔ جدھر جدھر وہ، اُدھر اُدھر راجا۔ چم دے چھوٹے کے تو فرشتوں کو خبر نہ ہُوئی کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ نہر کنارے پھلاہی کے جُھنڈ میں پہنچا۔ راجا بھی پیچھے پیچھے چلا گیا۔ وہاں ایک جھاڑی میں چُھپ کے راجے نے جو منظر دیکھا، وہ تو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ یکا یک چم دے چھوٹے نے چمڑے کا لباس اُتار دیا اور ایک حسین جسم یوں باہر نکل آیا جیسے سیپ میں سے موتی۔ راجے کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ

گئیں۔دُور، پُورب میں پو پھٹ رہی تھی۔سُورج کی پہلی پہلی، نرم نرم، روپہلی کرنیں ایک لڑکی کے گرد ہالہ بنائے ہُوئے تھیں۔اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے لڑکی نے نہر میں چھلانگ لگادی۔ایک چھپا کا ہوا۔نہر کے پانی نے اس کی برہنگی کو اپنی آغوش میں چھپالیا۔پانی اس کا لباس بن گیا اور وہ چھپ چھپ کرتی تیرنے لگی۔ٹھنڈے ٹھنڈے، بہتے پانی میں غسل کرنے لگی۔راجا بڑی دیر تک جھاڑیوں میں چُھپا اُسے نہاتے ہُوئے دیکھتا رہا۔اب صبح ہو چکی تھی۔سُورج نکل آیا تھا۔لڑکی بھی خُوب اچھی طرح نہا کے فارغ ہو چکی تھی۔وہ یک دم نہر سے باہر نکل آئی اور سبز کنارے پہ کھڑی ہوگئی۔سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کی انگلیوں تک جگ مگ، جگ مگ کرتے سُورج کی میٹھی میٹھی دھوپ میں ڈوبی ہُوئی۔اُس کا حُسن آنکھیں خیرہ کر رہا تھا۔وہ ہندی حُسن کے ہر معیار پہ پورا اترتی تھی۔بوٹا سا قد، بدن گداز، سرس کے پُھول کی طرح کومل، جلد کا رنگ کنول کے پھول کی مانند زردی مائل، آنکھیں کالی، مدھ بھری، سینے اور سُرین کا اُبھار نمایاں۔جب گنگنائی تو کوئل لگی، جب مٹک مٹک کے چلی تو راج ہنس معلوم ہُوئی۔آنکھوں کے اشاروں اور ہاتھوں کی انگلیوں کی حرکات میں لطیف بلاغت تھی۔اُس کے بھیگے ہُوئے، لمبے لمبے، کالے بال سفید جسم سے چمٹے ہُوئے تھے۔اُس کے گدرائے ہُوئے، صاف شفاف، اجلے بدن پر پانی کے قطرے دمک رہے تھے۔راجے کے لیے اس برہنہ حُسن کی تاب لانا ممکن نہ رہا۔

اتنے میں لڑکی ایک درخت تلے بیٹھ گئی۔اس نے دونوں ہاتھوں سے مٹی کھودنی شروع کی۔زمین سے ایک گٹھڑی برآمد ہُوئی۔اس میں سے سونے کے سنہری زیور اور سُرخ لباس نکالا، پہنا اور نئی نویلی دُلھن بن کر پھلاہی کے جُھنڈ میں مٹک مٹک کر پھرنے لگی۔نہر کے پانی میں اپنا عکس دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہونے لگی۔تھوڑی دیر اپنا دل خوش کرنے کے بعد اُس نے گہنا، کپڑے اُتارے، اُنھیں دُوبارہ گٹھڑی میں باندھ کے زمین میں دفن کیا۔پھر کھڑی ہو کے گھٹنوں کے بل جھکی، اس نے زمین پہ پڑا اپنا چمڑے کا لباس اُٹھایا اور پہننا شروع کر دیا۔چند لمحوں بعد وہ پھر چم دا چھوٹا تھا، اور پھلاہی کے جھنڈ سے نکل کر دُوبارہ شاہی اصطبل کی جانب چلا جا رہا تھا۔راجا بڑی دیر تک حیران، ششدر وہیں جھاڑی کے پاس بیٹھا رہا۔ایسی حیرت زندگی میں پہلے کبھی طاری نہیں ہُوئی تھی۔اسے یوں لگتا تھا جیسے اس نے جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھا ہو۔وہ، جسے ساری دنیا چم دا چھوٹا کہتی ہے، حقیقت میں ایک حسین ناری ہے، جس نے اپنے آپ کو چمڑے کے لباس میں چُھپا رکھا ہے۔یہ کوئی چھوٹا راز نہیں تھا۔لیکن یہ چم دا چھوٹا ہے کون؟ اس نے یہ بھیس کیوں بدلا ہوا

ہے؟ اپنی اصل کو زمانے کی نگاہوں سے کیوں چھپایا ہُوا ہے؟ راجے نے یہی سوچتے سوچتے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے اور اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ پہلے تو اس نے زمین کھود کر راج کماری کا گہنا، شادی کا سرخ جوڑا اور سادھوؤں سے چھینی ہُوئی چاروں طلسماتی چیزیں نکالیں اور پھر ان سوالوں پر غور کرتا ہوا، ذہن میں اس نہاتے ہوئے حُسن کی تصویر سجائے، بوجھل قدموں کے ساتھ، دھیرے دھیرے محل کی اور چل پڑا۔

راجے کا پورا دن بے قراری میں گزر گیا۔ نہ اس نے کچہری لگائی، نہ کسی سے بات کی۔ سارا دن اپنے کمرے میں بند رہا۔ اندر سے دروازے کی کنڈی لگائے، کمرے کے فرش پر ٹہلتا رہا۔ کسی پہلو کل نہیں پڑتی تھی۔ دل کا چین، روح کا سکون غارت ہو گیا تھا۔ شام کو راجا بالا خانے سے نیچے آیا۔ سیدھا اصطبل میں پہنچا۔ دیکھا تو چم دا چھوٹا ہمیشہ کی طرح اپنے کام میں جُتا ہوا تھا۔ راجے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: ''آج رات کا کھانا تم لے کر میرے کمرے میں آ جاؤ گے۔'' چم دا چھوٹا یہ غیر متوقع حکم سُن کے راجے کا مُنھ تکنے لگا۔ کاٹو تو لہو نہیں۔ آواز گلے میں رُندھ کے رہ گئی۔ کُچھ دیر بعد بڑی مشکل سے بولا: ''حضور! میرے ہاتھ تو رات دن گھوڑوں کی لِید سے پلید رہتے ہیں۔ یہ گو اُٹھانے والے ہاتھ راجے کا بھوجن اُٹھائیں، بھلا کیوں کر ممکن ہے۔ میرے ہاتھوں کی بِساند سے آپ کا کھانا خراب ہو جائے گا۔ حضور! کسی پوتر ناری کے ہاتھ سے منگوا کر بھوجن کیجیے۔'' یہ سُن کر راجا غُصّے میں آ گیا، بولا: ''جو کہہ دیا، سو کہہ دیا۔ اگر تم نے میرا حکم نہ مانا اور کھانا لے کر میرے کمرے میں نہ آئے تو یاد رکھنا میں تمھارا سر اُڑا دوں گا، تمھیں کولھو میں پیل ڈالوں گا۔'' راجا یہ کہتے ہُوئے، بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا، تیزی سے راج محل واپس چلا گیا۔

چم دے چھوٹے کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے جی میں سوچا: ''یہ بیٹھے بٹھائے راجے کو کیا سوجھی ہے کہ میرے ہاتھ سے بھوجن کریں گے۔ ضرور بات کُچھ اور ہے۔ کھانا منگوانے کا تو محض ایک بہانہ ہے۔ ارے! کہیں راجے کو مجھ پر شک تو نہیں ہو گیا۔'' یہ خیال آتے ہی چم دے چھوٹے کے اوسان جاتے رہے۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گھبرایا ہوا، بھاگا بھاگا رانی ماں کے پاس گیا۔ رانی ماں محل سرا کی نچلی منزل میں تھی اور راجا اُوپر چوبارے میں۔ چم دا چھوٹا راجے کی ماں کے قدموں میں گر گیا اور زارو قطار رونے لگا۔ رانی نے حیران ہو کر پوچھا: ''چم دے چھوٹے! کیا بات ہے؟ کیوں اس طرح پھوٹ پھوٹ کے رو رہا ہے؟'' چم دا چھوٹا آہیں بھرتے ہُوئے بولا: ''رانی ماں! تیرا بیٹا مجھے مار ڈالے گا۔'' رانی بولی: ''وہ بھلا تجھے کیوں مارنے لگا؟'' چم دے چھوٹے نے

ساری بات بتائی۔ رانی کو بھی سُن کے اچنبھا ہُوا۔ بولی: ''پہلے تو ہمیشہ داسیاں ہی بھوجن لے کے جاتی تھیں۔ آج ایسی کیا خاص بات ہو گئی کہ تجھے لانے کے لیے کہا۔ اچھا تو فکر نہ کر۔ تیری جگہ میں راجے کے لیے کھانا لے جاؤں گی۔'' یہ سُن کر چم دے چھوٹے کے حواس بجا ہُوئے۔ جان بچی، لاکھوں پائے۔ بلا ٹل گئی۔ رانی نے کھانے سے بھرا طشت اُٹھایا اور سیڑھیاں چڑھتے ہُوئے بالا خانے میں پہنچی۔ مگر یہ کیا، راجے نے ماں کے ہاتھ سے کھانا لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اور اپنی اسی ضد پر قائم رہا کہ میں کھانا کھاؤں گا تو صرف چم دے چھوٹے کے ہاتھ سے۔ اگر یہ اُوپر نہ آیا تو میں نیچے آکے اسے مار ڈالوں گا۔ راج ہٹ ویسے بھی مشہور ہے۔ رانی ماں کی پیش نہ گئی۔ اسی طرح کھانے سے بھرا تھال اُٹھائے، اُلٹے پاؤں لوٹ آئی۔ چم دے چھوٹے سے کہا کہ اب تو تجھے ہی راجے کا بھوجن لے کے اُوپر جانا پڑے گا۔

اب کوئی راہِ فرار نہ تھی۔ مجبوری اور بے بسی نے سب رستے بند کر دیئے تھے۔ آخر نہ چاہتے ہُوئے چم دے چھوٹے نے کھانے سے بھرا طشت اُٹھایا اور ڈرتے لجاتے قدموں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ دو زینے چڑھتا تھا، رُکتا تھا اور سوچ میں ڈوب جاتا تھا۔ یونہی چڑھتے، رکتے، سوچتے، ہولے ہولے چوبارے پر راجے کے کمرے کے سامنے جا پہنچا۔ کانپتے ہُوئے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور ایک مضبوط ہاتھ نے اسے اندر کھینچ لیا۔

ذرا دیر گزری تھی کہ بالا خانے سے چمڑے کا پھٹا ہوا لباس نیچے انگنائی کے فرش پر آن گرا۔ رانی ماں نے دیکھا تو بے اختیار چیخیں مار کے رونے لگی: ''ہائے ہائے! چم دا چھوٹا ٹھیک ہی کہتا تھا۔ تیرا بیٹا مجھے مار ڈالے گا۔ لو دیکھ لو، راجے نے اسے کوٹھے سے نیچے گرا کے مار ڈالا۔ ہائے ہائے! میرے لال! یہ تُو نے کیا کیا۔ میں اسی لیے بے چارے چم دے چھوٹے کو تیرے پاس اُوپر نہیں بھیج رہی تھی۔ مجھے پتا تھا تو اسے قتل کر ڈالے گا۔'' لوگوں نے چم دے چھوٹے کو اُٹھایا۔ اس کی چتا جلائی، کریا کرم کیا، اور راکھ گنگا میّا میں بہا دی۔

اس دوران میں راجا چوبارے ہی پر رہا۔ مسلسل سات دن، سات راتیں اُس کے کمرے کا دروازہ بند ہی رہا۔ داسیاں کھانا لے جا کے دریچے میں رکھ دیتی تھیں اور وہیں سے خالی برتن اُٹھا لیتی تھیں۔ ساتویں دن سیڑھیوں سے کسی کے اُترنے کی چاپ سُنائی دی۔ رانی ماں اور داسیوں نے آنکھ اُٹھا کے دیکھا تو راجا مسکراتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ کِھلا ہوا تھا۔ رانی ماں نے بیٹے کو اتنا مسرور پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور یہ کیا، راجے کے پیچھے پیچھے ایک بہت خُوب

صُورت لڑکی دُلھن کے سرخ لباس میں ملبوس، زیور پہنے، شرماتی لجاتی نیچے اُتر رہی تھی۔ رانی اور داسیاں حیرت کی تصویر بنی، یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لڑکی کون ہے؟ اور راجے کے کمرے سے یوں یکایک کیسے برآمد ہوگئی؟ کیونکہ سب کو معلوم تھا، راجا تو کمرے میں اکیلا رہتا تھا۔ آخر رانی کا خواب اس وقت ٹوٹا، جب راجے نے جھک کے ماں کے قدم چُھوئے اور کہا: ''رانی ماں! اس کے سر پہ پیار دیجیے، یہ آپ کی بہو ہے۔'' ساتھ ہی بہو بھی ساس کے پیر چُھونے کے لیے جھک گئی۔ رانی جو دیکھ رہی اور جو سُن رہی تھی، سب اچنبھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ اکیلی وہ کیا، محل کی ہر داسی بھی، حیرت میں غرق، گم صم کھڑی تھی۔ آخر راجے اور اس کی پتنی نے ہنستے ہُوئے ساری رام کہانی سنائی۔ جب رانی ماں کو معلوم ہوا کہ چم دا چموٹا مرا نہیں، بلکہ وہ میری بہو ہی تھی تو وہ باغ باغ ہوگئی اور بے اختیار اپنی حُور جیسی بہو کا ماتھا چُومنے لگی۔ پھر کیا تھا، ہر جگہ خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ پُورے ملک میں چراغاں کیا گیا۔ پرجا نے اپنے انصاف پسند اور خُدا ترس راجے کے بیاہ کی خوشی اس دھوم دھام سے منائی کہ مدتوں جگ میں لوگ اسے یاد کرتے رہے اور اس کی مثالیں دیتے رہے۔

جمعرات ۷؍مئی ۲۰۰۹ء
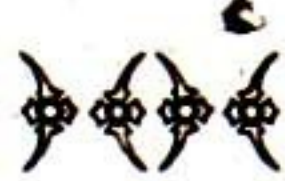
سپاہی کی بیوی

دُنیا بھر کے لوک ادب میں اشعار کا بہت خُوب صُورت استعمال دیکھنے میں آیا ہے۔اس کہانی کے مکالمے، جوسب کے سب اشعار کی صُورت میں ہیں، پڑھتے ہوئے بہت مزا آتا ہے۔

ایک لڑکے اور لڑکی کا بچپن ہی میں بیاہ ہو گیا تھا۔ کرنا خُدا کا کیا ہوا کہ لڑکا فوج میں بھرتی ہو کر گھر سے باہر کہیں دُور چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی برس بیت گئے۔ لڑکا گبرُو جوان ہو گیا۔ اُدھر اس کی بیوی نے بھی جوبن نکالا۔ اس پہ شباب یوں آیا جیسے دریا میں سیلاب۔ ایک دن لڑکا، جواب سپاہی تھا، گھر واپس آیا۔ ماں سے ملا۔ ماں نے بیٹے کو دیکھا تو پھولا نہ سمائی۔ صدقے قربان ہُوئی۔ سپاہی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جب بیوی کہیں نظر نہ آئی تو ماں سے پُوچھا۔ ماں نے بتایا کہ کنوئیں پر پانی بھرنے گئی ہُوئی ہے۔ سپاہی کے دل میں بیوی سے ملنے کا اتنا ارمان تھا کہ وہ مزید انتظار نہ کر سکا۔ صبر کا دامن ہاتھ سے چُھوٹ گیا۔ گھر سے نکلا۔ بے اختیار پاؤں گاؤں کے کنوئیں کی طرف اُٹھنے لگے۔ وہاں پہنچا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیا دیکھتا ہے کہ بھرے بھرے بدن والی، ایک نہایت حسین و جمیل، دراز قد عورت پانی بھر رہی ہے۔ سپاہی کو تو پتا تھا کہ یہ میری بیوی ہے مگر عورت نہ پہچان سکی کہ وہ اس کا شوہر ہے۔ ان کے بیچ جو گفتگو ہُوئی، سنیئے:۔

سپاہی:

کھوہ تے پانی بھریندیئے، مُٹیارے نی!
گُھٹ ک پانی پلا، بانکیئے نارے نی!

(اردو ترجمہ: کنوئیں پر پانی بھرتی ہُوئی، اے نوجوان عورت! ۔ایک گھونٹ پانی (مجھے) پلا، اے بانکی نار!)

عورت:

اپنا بھریا نہ دیواں، سپاہیا وے!
لج پیئی، بھر پی، بُھلیا راہیا وے!

(اُردو ترجمہ: اپنا بھرا ہوا پانی (میں) نہیں دیتی، اے سپاہی! ۔(یہ) رسّی پڑی (ہے، خود) بھر کے پی، اے بُھولے ہُوئے مسافر!)

سپاہی:

گھڑا دیواں تیرا بھن، مٹیارے نی!
لج دے کراں ٹوٹے چار، بانکیئے نارے نی!

(اُردو ترجمہ: تیرا گھڑا توڑ ڈالوں، اے نوجوان عورت! - رسّی کے چار ٹکڑے کر دوں، اے بانکی نار!)

عورت:

گھڑا بھجے کُمھاراں دا، سپاہیا وے!
لج ٹکے دی ڈور، میں تیری محرم ناں

(اردو ترجمہ: گھڑا (تو) کمھاروں کا ٹوٹے (گا)، اے سپاہی! - لج (تو) ٹکے کی ڈور (ہے)، میں تیری محرم نہیں۔)

یہ کہہ کر سپاہی کی بیوی نے پانی سے بھرا ہُوا گھڑا اپنے سر پر رکھا اور مٹک کے چلتی ہُوئی اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ سپاہی بھی پیچھے پیچھے ہولیا۔ جب وہ گھر پہنچی تو ساس بہو میں یہ گفتگو ہُوئی:-

ساس:

صُبح ویلے دئ گئی، سُن نونہہ اڑیئے!
آئی آں شاماں پا، بھولیئے نونہہ اڑیئے!

(اُردو ترجمہ: صبح کے وقت سے گئی ہُوئی، اے بہو! سُن - شام ہوگئی، اب آئی ہے، اے بھولی بہو!)

بہو:

لماں چنباں گبھرو، سُن سس اَڑیئے!
بیٹھا جھگڑا پا، بھولیے سس اَڑیئے!

(اُردو ترجمہ: دراز قد گبرُو جوان، اے ساس! سُن - اس نے میرے ساتھ خواہ مخواہ جھگڑا کیا، اے بھولی ساس!)

ساس:

میرا تے لگدا پُتّر، سُن نونہہ اَڑیئے!
تیرا تے لگدا کونت، بھولیے نونہہ اَڑیئے!

(اُردو ترجمہ: میرا تو (وہ) بیٹا لگتا ہے، اے بہو! سُن - تیرا تو (وہ) خاوند لگتا ہے، اے بھولی بہو!)

بھر چھنّاں دودھ دا! سُن نونہہ اَڑیئے!
جا کے کونت منا، بھولیئے نونہہ اَڑیئے!

(اُردو ترجمہ: دودھ سے برتن بھر، اے بہو! سُن - جا کے (اپنے) خاوند کو منا، اے بھولی بہو!)

جب بہو کو ساس کی زبانی پتا چلا کہ کنوئیں پر جس سپاہی سے جھگڑا ہُوا تھا، وہ اصل میں اس کا شوہر ہے، تو وہ باغ باغ ہو گئی۔ سالہا سال سے جس کا انتظار کر رہی تھی، آخر وہ آن ملا تھا۔ اتنے میں سپاہی بھی گھر میں داخل ہو گیا۔ شوہر سے آنکھیں چار ہُوئیں تو بیوی کے گال شرم سے سُرخ ہو گئے۔ اُدھر سپاہی کا مُنھ پھولا ہوا تھا۔ ساس نے پیا کو منانے کی ترکیب پہلے ہی بتا دی تھی۔ چناں چہ بیوی نے کانسی کے برتن میں دودھ ڈالا اور شرماتے لجاتے شوہر کو پیش کیا۔ اس موقع پر ان تینوں: شوہر، بیوی اور ساس میں جو گفتگو ہُوئی، سنیئے:-

سپاہی:

تیرا لیاندا نہ پیواں، مٹیارے نی!
کھوہ والی گل سُنا، بانکیئے نارے نی!

(اُردو ترجمہ: تیرا لایا ہوا (میں) نہ پیوں، اے نوجوان عورت - (ذرا) کنوئیں والی بات (تو) سُنا، اے بانکی نار!)

بیوی:

سو گناہ مینوں رب بخشے، سپاہیا وے!
اک بخشے گا توں تے میں تیری محرم ہُوئی

(اُردو ترجمہ: رب مجھے سو گناہ بخش دے گا، اے سپاہی - (اگر) تو ایک بخش دے گا تو میں تیری محرم ہو جاؤں)

جب سپاہی کی ماں نے یہ سُنا تو وہ بھی بہو کی حمایت پر تیار ہو گئی۔ بیٹے کو بہو کی غلطی معاف کرنے کی سفارش کرنے لگی۔ ساتھ ہی شوہر منانے کے لیے بہو کو مشورے دینے لگی:-

سپاہی کی ماں:

نکی ہوندی نوں چھڈ گیا، سپاہیا وے!
ہن ہوئی مٹیار تے ہن تیری محرم ہوئی

(اردو ترجمہ: (تیری بیوی) چھوٹی سی تھی، جب (تو اسے) چھوڑ کے چلا گیا، اے سپاہی - اب (یہ) جوان ہو گئی اور اب تیری محرم ہو گئی ہے)

ستاں رنگاں دا کھانا پکا، بھولیئے نونہہ اڑیئے!
بہہ کے کھانا کھلا، بھولیئے نونہہ اڑیئے!

(اُردو ترجمہ: سات رنگوں کا کھانا پکا، اے بھولی بہو! - بیٹھ کے (خاوند کو خود) کھانا کھلا، اے بھولی بہو!)

ساس:

جیویں مَن دا منا، بھولیئے نونہہ اَڑ یئے!
فیر بخشے گا خُدا، بھولیئے نونہہ اَڑ یئے!

(اُردو ترجمہ: جس طرح (تیرا خاوند) مانتا ہے، منا اے بھولی بہو- پھر (تجھے) خدا بخشے گا، اے بھولی بہو!)

قِصہ مختصر، اُس کے بعد سپاہی کی بیوی سات قسموں کا کھانا پکانے میں مصروف ہوگئی۔ جب پک کے تیار ہوگیا تو اس نے اپنے گورے گورے ہاتھوں سے، بڑے چاؤ کے ساتھ شوہر کو کھلایا۔ اور دونوں کی صلح ہوگئی۔ کیوں کہ مثل مشہور ہے: ''گھڑے وَٹے دا کیہ نیاں'' یعنی گھڑے اور پتھر کا کیا انصاف۔ پتھر کا کام لگنا ہے اور گھڑے کا کام ٹوٹنا۔ ایسے ہی میاں بیوی کی لڑائی ہوتی ہے۔ کوئی تیسرا شخص فیصلہ نہیں کرواسکتا۔ اِدھر لڑتے ہیں، اُدھر صلح کر لیتے ہیں اور یہ بھی تو زبانِ ردِ خاص وعام ہے: ''جورُو خصم کی لڑائی، دُودھ کی سی ملائی''۔

بدھ ۱۶۔ فروری ۲۰۱۱ء
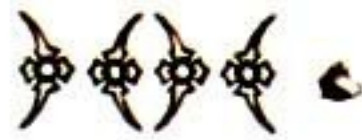
پہیلی

دُنیا کے قریب قریب ہر ملک میں ایسی لوک کہانیاں ملتی ہیں، جن میں نہایت خُوب صُورت پہیلیوں کا استعمال ہوا ہے۔ ایسی لوک کہانیوں کا دل چسپی کے ساتھ ساتھ ایک علمی پہلو بھی ہے۔ یہ ذہن کو غور کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔

مدتوں پہلے پنجاب پر ایک راجا حکومت کرتا تھا۔ اس کی واحد اولاد ایک ہی ایک بیٹی تھی۔ راج کماری جتنی حسین تھی، اتنی ہی ذہین تھی۔ لیکن وہ بیاہ کے لیے نہیں مانتی تھی۔ راجے کو دن رات یہی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اسے یہی چنتا رہتی تھی کہ جیتے جی بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دے۔ آخر ایک روز باپ کے مسلسل اصرار کے سامنے راج کماری کی ضد نے گھٹنے ٹیک دیے۔ وہ دُلھن بننے کے لیے راضی ہو گئی۔ مگر یہ کیا، اس نے شادی کے لیے ایک شرط لگا دی کہ جو کوئی مجھ سے بیاہ رچانے کا خواہش مند ہو، پہلے مجھے ایک پہیلی بجھوائے۔ اگر پہیلی بوجھ نہ سکی تو میں اس سے شادی کر لوں گی۔ اور اگر میں نے بجھارت کا صحیح صحیح جواب دے دیا تو اس شخص کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ ڈھنڈورچی نے ہر جگہ ڈھنڈورا پیٹ دیا۔

اگرچہ یہ نہایت سخت شرط تھی مگر پھر بھی لوگ آتے رہے، پہیلیاں بجھواتے رہے اور جان کھوتے رہے۔ راج کماری کے خواست گار گو بہت مشکل مشکل بجھارتیں بجھواتے تھے، لیکن وہ ظالم ایسی بلا کی ذہین تھی کہ ایک ہی پل میں پہیلی بُوجھ لیتی تھی۔ اِدھر بجھارت مُنھ ہی میں ہوتی تھی کہ راج کماری کی طرف سے جواب حاضر ہوتا تھا۔ بے شمار لوگ جان سے گزر چکے تھے۔ آخر ایک دن ایک نوجوان چرواہا راج محل میں آیا۔ بہتیرا لوگوں نے سمجھایا کہ باز آ۔ اپنی جوانی پر ترس کھا۔ خواہ مخواہ جان سے جائے گا۔ مگر وہ اپنے ارادے پر اٹل رہا۔ اسے راج کماری کے رُوبرُو لے جایا گیا۔ چرواہے نے یہ پہیلی پیش کی:

اَکھ وِچ پکھ، سُوئی جَل سُولو دِتّا
یا دوں توں ترائے ہوسن یا بُڈھی اِکّا دی اِکّا

(اُردو ترجمہ: آنکھ میں پنکھ، سُول نے سوئی پانی دیا۔ یا دو سے تین ہو جائیں گے یا بڑھیا ایک کی ایک یعنی اکیلی کی اکیلی رہ جائے گی۔)

ایک لمحہ، دو لمحے، تین لمحے، گجر بجتا رہا مگر چار سو ہو کا عالم۔ راج کماری کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایسا ہوا تھا۔ راج کماری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے بہت

ذہن لڑایا لیکن پہیلی نہ بوجھ سکی۔ آخر ہار مان لی۔ پھر کیا تھا، راجے کے حکم پر ہر طرف خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ طویل انتظار کے بعد باپ کی مراد بر آئی تھی۔ اس نے اپنے ہونے والے داماد کے ماتھے کو بوسہ دیا۔ سارے ملک میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ پرجا خوشی سے پھولا نہ سمائی۔ ہر شہر، ہر گاؤں میں چراغاں کیا گیا۔ چند دن بعد گڈریے کی شادی راج کماری سے ہوگئی۔

گڈریا اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ راج محل میں رہنے لگا۔ راج کماری خوب صورت ہی نہیں، خوب سیرت بھی تھی۔ دل کی بہت نیک۔ بھول گئی کہ وہ راج کماری ہے۔ دن رات شوہر اور ساس کی خدمت میں جُتی رہتی تھی۔ ایک دن راج کماری نے خاوند سے کہا: ''سرتاج! آپ نے مجھے جو پہیلی بجھوائی تھی، اس کی بُوجھ کیا ہے؟'' یہ سُن چرواہا کہنے لگا: ''راج کماری! جس دن میں نے یہ منادی سنی کہ تمھیں پانے کے لیے کوئی پہیلی پیش کرنا ضروری ہے اور پہیلی بھی ایسی ہو جو تم بوجھ نہ سکو، میں رات دن اسی جستجو میں لگ گیا۔ جو بڑا بوڑھا ملا، اسے روک کے کہا کہ بابا کوئی پہیلی بتاؤ۔ آتے جاتے مسافروں سے دریافت کیا۔ بجھارتیں تو بے شُمار ملیں لیکن سب آسان۔ مجھے تو کسی ایسے معمے کی ضرورت تھی، جس کے جواب کی تمھارے فرشتوں کو خبر نہ ہو۔ کیوں کہ آسان اور عام سی پہیلی بجھوانا تو اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لیکن شدید کوشش کے باوجود ایسی ایک بھی پہیلی ڈھونڈنے میں، میں ناکام رہا۔

مثل مشہور ہے: خُدا مہربان تو جگ مہربان۔ ایک روز صبح سویرے، میں شدید مایوسی کے عالم میں بکریوں کا ریوڑ لیے چرانے کے لیے جنگل کی اور چلا جا رہا تھا۔ راستے میں ایک جگہ کسی گائے کو مرے ہُوئے دیکھا۔ گوشت تو کب کا چیل، کوے کھا چکے تھے۔ اب تو زمین پر فقط پنجر پڑا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گئو کی آنکھ کے مقام پر ایک گڑھا سا بنا ہوا ہے۔ گڑھے میں کسی چڑیا نے گھونسلا بنا رکھا ہے۔ گھونسلے میں تنکوں کے ساتھ ساتھ چڑیا کے پر بھی نظر آ رہے ہیں۔ ایک کانٹے جیسا تیز اور باریک تنکا آنکھ کے گڑھے سے باہر کو نکلا ہوا ہے۔ چوں کہ ابھی نور کا تڑکا ہی تھا۔ پیڑ پودے، گھاس پھوس، پھُول پات ہر جگہ اوس پڑی ہُوئی تھی۔ شبنم کا ایک قطرہ گئو کی آنکھ کے گڑھے سے باہر کو نکلے ہوئے اس سُول جیسے تنکے پر بھی ٹھہرا ہوا تھا اور ''سوئی پانی''، سُورج کی پہلی کرن سے چمک رہا تھا۔ یہ منظر دیکھنے کی دیر تھی کہ فوراً پہیلی کا پہلا مصرع برق کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ دوسرے مصرعے کی وضاحت یہ ہے کہ میری ایک ماں ہے، بوڑھی۔ ہم دونوں ماں

بیٹا ایک جھونپڑی میں رہتے تھے۔ راج کماری! اگر تم میری پہیلی نہ بوجھ پاتی تو میری تم سے شادی ہو جاتی۔ ہم دو سے تین ہو جاتے: میں، میری ماں اور تم۔ اور اگر تم میری پہیلی بوجھ لیتی تو ظاہر ہے اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا نکلتا کہ تم مجھے قتل کروا دیتی اور یوں میری بوڑھی ماں اکیلی کی اکیلی رہ جاتی۔ یہ تھی اِس پہیلی کی حقیقت۔"

جب راج کماری نے گڈریئے کی زبانی یہ ساری کہانی سنی تو وہ بہت حیران ہُوئی۔ اسے اپنے شوہر کی ذہانت پر فخر محسوس ہونے لگا۔ اس کے علاوہ اسے اپنے انتخاب کی درستی کا بھی پہلے سے کہیں بڑھ کے یقین ہو گیا۔ وہ اپنے شوہر اور ساس کی اور بھی خدمت کرنے لگی۔ برسوں بعد جب راجے کا انتقال ہوا تو اس کا واحد وارث گڈریا- اس کی بیٹی کا خاوند، اس کا داماد- راج گدّی پر بیٹھا، اور آنے والے کئی سالوں تک نہایت عدل وانصاف سے حکومت کرتا رہا۔

اتوار ۲۰ رفروری ۲۰۱۱ء

وقت: سہ پہر ۴:۱۵

کُجھ گلاّں دھرتی ماں نال (پنجابی)

(۱)

نی ماں! مِرے سر تے اپنا ہتھ رکھ
میں تیرا پُتر
میں تیرے اندر لکن توں پہلاں
ہزار صدیاں دے باغ وِچوں
کہانیاں دے گُلاب چُن کے، بنا کے گل دستہ
لے کے آیاں
نی ماں! مِرے سر تے اپنا ہتھ رکھ
ایہہ ترے ولّوں مہک دا تحفہ میں پیش کرداں
تری دھیاں نُوں، تے پُتراں نوں
نی ماں! نئیں جان دی ایہہ گل تُوں
کہ تیرے اُتے بڑا ای دُکھ اے
کھلو تے تیرے دھیاں تے پُتر اَجل
دیاں کنڈیاں دے اندر
تے سبھ دیں نیں لیرو لیر کپڑے
لہُو لہُو اے بدَن ہر اِک دا
یقین رکھ پر
مہک گلاباں دی پہنچے گی جد
ضرور ویکھن گے سر نوں چک کے
کہ ایس خشبو چ ماں دی خشبو گھلی ہوئی اے
ہمیش دا وعدہ میں نہ کردا
بُھلا کے پر موت دے ایہہ کنڈے
ضرور ہسن گے کجھ تے پَل او

کُچھ باتیں دھرتی ماں سے (اُردو)

(۱)

اے ماں! میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ
میں تیرا بیٹا
میں تیرے اندر چُھپنے سے پہلے
ہزار صدیوں کے باغ میں سے
کہانیوں کے گُلاب چُن کے، بنا کے گل دستہ
لے کے آیا
اے ماں! میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ
یہ تیری طرف سے مہکتا تحفہ میں پیش کرتا ہوں
تیری بیٹیوں کو اور بیٹوں کو
اے ماں! نہیں جانتی یہ بات تُو
کہ تیرے اُوپر بڑا ہی دُکھ ہے
کھڑے ہیں تیری بیٹیاں اور بیٹے اَجل
کے کانٹوں کے اندر
اور سب کے ہیں پھٹے ہوئے کپڑے
لہُو لہُو ہے بدَن ہر اِک کا
یقین رکھ پر
مہک گلابوں کی پہنچے گی جب
ضرور دیکھیں گے سر کو اُٹھا کے
کہ اس خوشبو میں ماں کی خوشبو گھلی ہوئی ہے
ہمیشہ کا وعدہ میں نہیں کرتا
بُھلا کے پر موت کے یہ کانٹے
ضرور ہنسیں گے کُچھ تو پَل وہ

(۲)

نی ماں! مرے سر تے اپنا ہتھ رکھ
میں تیرا پُتّر
تے تیرے وِچّوں میں آ کے باہر
ہزار صدیاں توں اُڈ کے اکھّاں، ایہہ رات
دِن جاگ دی حیاتی
کہانیاں دے ای سُفنیاں وِچ گزار دِتّی
کہانیاں، جیہڑیاں اسانوں ہمیش توں، توں
سُنا رہی ایں
نی ماں! مرے سر تے اپنا ہتھ رکھ
جدوں دوبارہ پلٹ کے فر تیرے وِچ سماواں
تے تیری گود وِچ سوں میں جاواں
بڑی پُراسرار گوڑھی نیندر
کریں نہ اکھ توں کدی وی توں دُور سُفنیاں نوں
لیا کے منہ کول میرے کن دے
سُناویں مینوں **نویں سرے توں دوبارہ باتاں**،
تے **ایہو** باتاں

(۲)

اے ماں! میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ
میں تیرا بیٹا
اور تیرے اندر سے میں آ کے باہر
ہزار صدیوں سے کھول کے **آنکھیں**، یہ
رات دِن جاگتی زندگی
کہانیوں **ہی کے** خوابوں میں گزار دی
کہانیاں، جو ہم کو ہمیشہ سے، تُو
سُنا رہی ہو
اے ماں! میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ
جب دوبارہ پلٹ کے پھر تیرے اندر سماؤں
اور تیری گودی میں، میں سو جاؤں
بڑی پُراسرار گہری نیند
کریں نہ آنکھ سے کبھی بھی تُو دُور خوابوں کو
لا کے منہ قریب میرے کان کے
سُنانا مجھ کو نئے سرے سے، دوبارہ کہانیاں،
اور یہی کہانیاں

غلام مرتضیٰ
اتوار ۲۶ جون ۲۰۱۱ء

ملک مقبول احمد

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

۵۰ نامور ادبی شخصیات

پذیرائی

نیا علم شفا بخشی

رہنمائے حج و عمرہ

سیاحت نامہ ترکی

آتی سانس

گلشنِ ادب

سفر جاری ہے

آپس کی باتیں

گمشدہ افسانے

اہلِ قلم کے خطوط

ارمغانِ غزل

مصنف کے بارے میں

نام: غلام مرتضےٰ

ولدیت: صوفی رحمت اللہ (متوفی: ۳جولائی ۲۰۰۹ء)

پیدائش: ۱۹۷۲ء (ننکانہ صاحب)

تعلیم: ایم۔اے اُردو (اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور)

ملازمت: اُستاد شعبہ اُردو (گورنمنٹ گرونانک ڈگری کالج، ننکانہ صاحب)

شعری مجموعے: پیشِ نگاہِ واپسیں (اشاعت: جون ۲۰۰۴ء)

جنت کا بیٹا

نثر: غالِب کی محبوبہ (غالب کی شاعری اور شخصیت پر مضامین)

شرح شکوہ، جواب شکوہ

شرینہہ کے پھول (خودنوشت سوانح عمری)

MAQBOOL ACADEMY

مقبول اکیڈمی، لاہور